بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ

مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی

بہار کی اردو شاعری

میں

علماء کا حصہ

مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی

نام کتاب	:	بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ
مصنف	:	مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی
پتہ	:	قاسمی منزل، نیو عظیم آباد کالونی ویسٹ، سیکٹر۔ڈی، پٹنہ۔٦
صفحات	:	432
تعداد اشاعت	:	500
سال اشاعت	:	2022
ناشر	:	مولانا ابوالکلام قاسمی ریسرچ فاؤنڈیشن، پٹنہ
ہدیہ	:	500
مطبع	:	مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی، 9811794822

Book Name:
Bihar Ki Urdu Shairi Me Ulama Ka Hissa
by: Maulana Dr. Abul Kalam Qasmi Shamsi
Mob. +91 - 9835059987
E-mail : abulkalmqasmi@gmail.com

ملنے کے پتے:

- مولانا ابوالکلام قاسمی ریسرچ فاؤنڈیشن، قاسمی منزل، نیو عظیم آباد کالونی ویسٹ، سیکٹر۔ڈی، پٹنہ۔٦
- بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- جاوید بک سنٹر، بی ایم داس روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴
- نورالقمر لائبریری مدنی نگر مہوا، ویشالی

ترتیب

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	۱۱
باب اول:	بہار میں اردو شاعری	۱۷
	دور متقدمین	۲۵
	(۱) مرزا عبد القادر بیدلؔ	۲۷
	(۲) شیخ محمد روشن جوششؔ عظیم آبادی	۴۰
	(۳) بیعت قلی خاں حسرتؔ عظیم آبادی	۴۱
	(۴) شیخ محمد عابد دلؔ عظیم آبادی	۴۲
	(۵) مرزا محمد علی فدوی	۴۲
	(۶) شاہ مسیح الدین حسنؔ بخاری	۴۳
دور متوسطین:		۴۵
	(۱) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی	۴۷
	(۲) غلام حسین شورشؔ	۴۹
	(۳) شیخ غلام یحیٰ حضورؔ عظیم آبادی	۵۰
	(۴) شاہ الطف حسین فریادؔ	۵۱
	(۵) منشی گنگا لال دماغؔ	۵۲
	(۶) خواجہ امین الدین امینؔ	۵۳
دور جدید:		۵۵
	(۱) علی محمد شادؔ عظیم آبادی	۵۷

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	(۲) شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ	۶۰
	(۳) فضل حق آزادؔ	۶۱
	(۴) عبدالرحمن بسملؔ سنسہاروی	۶۲
	(۵) ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیمؔ	۶۳
	(۶) ضمیر الدین احمد عرشؔ گیاوی	۶۵
	(۷) سید کاظم علی جمیلؔ مظہری	۶۶
	(۶) پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ	۶۸
	(۹) سید کاظم حسین زارؔ عظیم آبادی	۷۰
	(۱۰) رضا علی خاں رمزؔ عظیم آبادی	۷۱
	(۱۱) محمد یٰسین کیفؔ عظیم آبادی	۷۲
	(۱۲) احسان الرحمن خاں احسانؔ دربھنگوی	۷۳
	دور مابعد جدید- دور حاضر	۷۶
	(۱) کلیم احمد کلیم عاجزؔ	۷۷
	(۲) عبدالمنان طرزیؔ	۷۹
	(۳) اعجاز علی ارشدؔ	۸۰
	(۴) خورشید اکبر	۸۴
	(۵) عالم خورشید	۸۷
	(۶) عطا حسین انصاری عطاؔ عابدی	۸۹
	(۷) شاہد کلیم	۹۱
	(۸) سلطان اختر	۹۳
	(۹) شمیم الدین احمد علی شمیمؔ قاسمی	۹۵

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	مراجع	۹۸
باب دوم:	بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ	۱۰۴
	دور مقدمین:	۱۰۵
	(۱) مولانا سید عماد الدین عمادؔ پھلواروی	۱۰۷
	(۲) ملا محمد علیم تحقیقؔ عظیم آبادی	۱۱۳
	(۳) تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ قادری	۱۱۴
	(۴) قاضی عبدالغفار غفاؔ	۱۱۵
	(۵) شاہ غلام نقشبند سجادؔ پھلواروی	۱۱۶
	(۶) مولانا شاہ نورالحق تپاںؔ پھلواروی	۱۱۹
	دور متوسطین:	۱۲۳
	(۱) مولانا شاہ ابوتراب آشناؔ پھلواروی	۱۲۵
	(۲) مولانا انور علی یاسؔ آروی	۱۲۷
	(۳) مولانا سید شاہ امیر الدین وجدؔ بہاری	۱۳۰
	(۴) قاضی مخدوم عالم مخدومؔ پھلواروی	۱۳۲
	(۵) مولانا میر محمد حسن حسنؔ چھپروی	۱۳۳
	(۶) شاہ وصی احمد وصیؔ پھلواروی	۱۳۵
	(۷) مولانا شیخ فقیر حسین عظیمؔ سیوانی	۱۳۸
	(۸) مولانا عبدالحمید پریشاںؔ صادق پوری	۱۴۰
	(۹) مولانا سید شاہ قطب الدین احمد باقیؔ گیاوی	۱۴۱
	(۱۰) مولانا سید برکات احمد برکاتؔ بہاری ٹونکی	۱۴۴
	دور جدید:	۱۴۸

صفحہ نمبر	موضوع	ابواب
۱۴۹	(۱) مولانا سید احمد امین احمد شوقؔ بہاری	
۱۵۱	(۲) مولانا شاہ محمد علی حبیب نصرؔ پھلواروی	
۱۵۲	(۳) مولانا شاہ محمد حسین رمزؔ حاجی پوری	
۱۵۵	(۴) مولانا سید محمد ضمیر الحق قیسؔ آروی	
۱۵۷	(۵) حکیم احتشام الدین مشرقیؔ منیری	
۱۵۸	(۶) غلام مصطفیٰ فخرؔ سہسرامی	
۱۶۰	(۷) مولانا قاضی عبدالوحید وحیدؔ عظیم آبادی	
۱۶۲	(۸) مولانا سید حسن مرتضیٰ شفقؔ رضوی عماد پوری	
۱۶۳	(۹) مولانا اکرام الدین احمد عرفان اسلام پوری	
۱۶۵	(۱۰) سید شاہ سید علی کاملؔ اسلام پوری	
۱۶۷	(۱۱) مولانا علیم الدین سوزاںؔ سہسرامی ثم دربھنگوی	
۱۷۰	(۱۲) مولانا سید مرشد حسن کاملؔ دھرمپوری	
۱۷۳	(۱۳) مولانا محمد قمر الدین قمرؔ اعظمی، دربھنگوی	
۱۷۵	(۱۴) مولانا سید شاہ عبدالکریم رکنؔ بہاری	
۱۷۶	(۱۵) حکیم محمد شعیب رضوی نیرؔ پھلواروی	
۱۷۷	(۱۶) مولانا سید محی الدین تمناؔ عمادی پھلواروی	
۱۷۸	(۱۷) مولانا غلام رسول قوسؔ حمزہ پوری	
۱۸۰	(۱۸) مولانا سید شاہ محمد الیاس یاسؔ بہاری	
۱۸۵	(۱۹) مولانا سید محمد محمودؔ باروی	
۱۸۶	(۲۰) مولانا شاہ محمد قائم قتیلؔ داناپوری	
۱۸۹	(۲۱) مولانا سید شاہ محمد ایوب ابدالی نیرؔ اسلام پوری	

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	(۲۲) مولانا بدیع الزماں قمرؔ نعمانی سہسرامی	۱۹۰
	(۲۳) مولانا عبید الرحمن عاقلؔ رحمانی	۱۹۲
	(۲۴) مولانا محمد نور الہدیٰ نورؔ اصلاحی	۱۹۴
	(۲۵) مولانا سید عبد المجید مضطرؔ مظفر پوری	۱۹۸
	(۲۶) مولانا سید محمد شمس الحق شمسؔ ویشالوی	۲۰۳
	(۲۷) مولانا سید شاہ مراد اللہ اثرؔ منیری	۲۰۵
	(۲۸) مولانا عبد العلیم آسیؔ دربھنگوی	۲۰۷
	(۲۹) مولانا محمد ادریس ذکاؔ گڑھولوی	۲۱۱
	(۳۰) مولانا وحید احمد قیصرؔ ندوی	۲۲۰
	(۳۱) مولانا محمد عبد المقیت شمسؔ نیموی	۲۲۱
	(۳۲) مولانا سید محمد قمر الدین کیفؔ سہسرامی	۲۲۲
	(۳۳) مولانا شاہ فرید الحق فریدؔ عظیم آبادی	۲۲۳
	(۳۴) مولانا محمد ارتضاء الدین حاذقؔ سہسرامی	۲۲۵
	(۳۵) مولانا فضل القدیر اخترؔ رانی ساگری	۲۲۶
	(۳۶) مولانا مصطفی رضا شبنمؔ کمالی	۲۲۷
	(۳۷) مولانا محمد ابو القاسم قاسمیؔ مونگیری	۲۲۸
	(۳۸) مولانا عبد الحئی بیتابؔ صدیقی مظفر پوری	۲۳۱
	(۳۹) مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوری	۲۳۲
	(۴۰) مولانا قاری سید قسیم الحق قسیمؔ گیاوی	۲۳۴
	(۴۱) مولانا سید مظاہر عالم رونقؔ سہسرامی	۲۳۶
	(۴۲) مولانا سید محمد ابراہیم نجمؔ ندوی	۲۳۷

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	(۴۳) سید شاہ غلام مخدوم مست سہسرامی	۲۳۹
	(۴۴) مولانا جسیم القادری اماتی آروی	۲۴۰
	(۴۵) مولانا شاہ قمر الدین حیدر قمر آروی	۲۴۱
	(۴۶) مولانا شاہ مسعود الحسن مسعود سہسرامی	۲۴۳
	دور مابعد جدید یا دور حاضر:	۲۴۵
	(۱) مولانا سید نظام الدین قائم گیاوی	۲۴۷
	(۲) مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی	۲۴۹
	(۳) مولانا ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی چمپارنی	۲۵۳
	(۴) مولانا محمد ہارون قمر ریاضی قمر چمپارنی	۲۵۸
	(۵) مولانا وارث حسن وارث ریاضی چمپارنی	۲۶۱
	(۶) مولانا محمد شفیع الرحمن شفیع	۲۶۴
	(۷) مولانا حکیم افضل حسین قاسمی دربھنگوی	۲۶۵
	(۸) مولانا سہیل احمد قادری سہیل پیغمبر پوری	۲۶۷
	(۹) مولانا سراج الحق سراج نادر چھپروی	۲۶۹
	(۱۰) مولانا حشمت رضا ساحل	۲۷۰
	(۱۱) مولانا انور حسین انور	۲۷۲
	مراجع:	۲۷۴
باب سوم:	بہار کے چند علماء کی شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ	۲۸۰
	(۱) شاہ محمد آیت اللہ جوہری پھلواروی	۲۸۱
	(۲) شاہ جلیل الدین حسین صوفی منیری	۲۹۶
	(۳) مولانا شاہ ابو الحسن فرد پھلواروی	۳۱۰

صفحہ نمبر	موضوع	ابواب
۳۱۴	(۴) مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی	
۳۱۷	(۵) مولانا سید شاہ محمد اکبر اکبر دانا پوری	
۳۲۳	(۶) مولانا ظہیر احسن شوق نیموی	
۳۳۳	(۷) مولانا سید ابوالخیر رحمانی دربھنگوی	
۳۳۹	(۸) مولانا سید سلیمان ندوی کیف	
۳۴۶	(۹) مولانا سید مناظر احسن مناظر گیلانی	
۳۴۹	(۱۰) مولانا سید عبدالحکیم ارمان بتیاوی	
۳۵۵	مراجع:	
۳۵۹	محاکمہ	باب چہارم:
۳۶۹	نمونۂ کلام	باب پنجم:
۳۷۱	(۱) شاہ جلیل الدین حسین صوفی منیری	
۳۷۳	(۲) مولانا سید شاہ محمد اکبر اکبر دانا پوری	
۳۷۶	(۳) شاہ محمد قائم قتیل دانا پوری	
۳۷۸	(۴) مولانا سید عبدالحکیم ارمان	
۳۸۰	(۵) مولانا مصطفی رضا شبنم کمالی	
۳۸۱	(۶) مولانا وارث ریاضی	
۳۸۴	(۷) مولانا سید محمد شمیم شمیم چھپروی	
۳۸۶	(۸) مولانا سید شاہ نظیر حسن نظیر دانا پوری	
۳۸۷	(۹) مولانا سید عبدالحیٔ ذبیح دربھنگوی	
۳۸۸	(۱۰) مولانا عارف حسین عارف صدیقی	
۳۹۰	(۱۱) مولانا شاہ احترام الدین شطار منیری	

ابواب	موضوع	صفحہ نمبر
	(۱۲) مولانا عبدالحلیم ناظمؔ پیغمبر پوری	۳۹۱
	(۱۳) مولانا نذر الرحمن حفیظؔ عظیم آبادی	۳۹۳
	(۱۴) مولانا محمد رکن الدین داناؔ سہسرامی	۳۹۵
	(۱۵) مولانا سید محمد عثمان رخشاںؔ ابدالی	۳۹۶
	(۱۶) مولانا سید عبدالغفور شررؔ استھانوی	۳۹۹
	(۱۷) مولانا شاہ محمد سلیمان حاذقؔ پھلواروی	۴۰۳
	(۱۸) مولانا سید محمد ایوب شمیمؔ ندوی سہسرامی	۴۰۴
	(۱۹) مولانا شاہ غلام گلؔ پھلواروی	۴۰۶
	(۲۰) مولانا محمد اسمٰعیل آسیؔ آروی	۴۰۷
	(۲۱) مولانا سید علی کاملؔ اسلام پوری	۴۰۸
	(۲۲) مولانا حکیم محمد فخر الحسن حکیمؔ سہسرامی	۴۰۹
	(۲۳) مولانا حکیم سید سعد اللہ سعدؔ رجہتی گیاوی	۴۱۱
	(۲۴) مولانا محمد حفیظ الدین لطیفیؔ رحمانپوری	۴۱۲
	(۲۵) مولانا سید یحیٰ ہلالؔ ندوی گیاوی	۴۱۴
	(۲۶) مولانا سید شاہ امجد حسین امجدؔ عظیم آبادی	۴۱۵
	(۲۷) مولانا شاہ رحمت اللہ احقرؔ مظفر پوری	۴۱۶
	(۲۸) مولانا محمد داؤد طالبؔ دربھنگوی	۴۲۰
	مراجع:	۴۲۴
	کتابیات:	۴۲۶

بِسمِ اللہ الرّحمٰنِ الرّحیم

پیش لفظ

اردوشاعری کے ارتقاء میں بہار کے علماء کا کردارنہایت ہی اہم اورنمایاں رہاہےاور آج بھی ہے۔بہار کے علماء نے اردوزبان وادب کی ہمہ جہت آبیاری کی اورترقی کے منازل تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔انہوں نے خاص طور پراردوشاعری کے لئے مختلف جہات میں اپنی خدمات پیش کیں۔اورتقریباً تمام اصناف سخن پرطبع آزمائی کی۔ غزل،قصیدہ،مثنوی،مرثیہ،رباعی وغیرہ سبھی اصناف سخن میں ان کے اشعارموجودہیں۔ تحقیق کے مطابق اردوکی ابتدائی نشوونما میں اس صوبہ کےصوفیاء نے سرگرم حصہ لیا۔یہ صوفیاءاپنے وقت کے بڑے اسکالر،ادیب اوردانشور تھے،یہ صوفیاءعلماءبھی تھے۔علماء، مشائخ اورصوفیاءکی سوانح کتابوں میں موجودہیں۔ان کےشعری کارناموں پرمشتمل کتابیں اورمخطوطےمختلف لائبریریوں کی زینت ہیں۔اس عظیم کارنامے کے باوجود بہار کےعلماءو صوفیاءکی شاعری کواُجاگرکرنے کیلئے کوئی جامع اورمبسوط کام نہیں ہوا۔ستم ظریفی یہ ہے کہ ادیبوں،نقادوں اوردانشوروں نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں کی،جس کی وجہ سے اس قیمتی سرمایہ کے زیادہ ترحصے ابھی بھی دفینوں میں مخفی ہیں۔اس لئے میں نے بہار کے علماء کی شعری خدمات کومنظرعام پرلانے کی کوشش کی اوریہ کتاب بہارکی اردوشاعری میں علماء کا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ میراتحقیقی مقالہ ہے،یہ پانچ ابواب پرمشتمل ہے۔باب اول بہارمیں اردو شاعری ہے۔میں نے اس باب کےشروع میں بہارمیں اردوشاعری کی مختصرتاریخ کوپیش کرکے دورمتقدمین،دورمتوسطین،دورجدیداوردورمابعدجدیدکومتعین کیاہے۔ہردور کے شروع میں اس دورکی خصوصیات کوبیان کرکے خاص خاص شعراءکواپنے اپنے دورمیں

شامل کیا ہے، جو عالم نہیں ہیں۔تا کہ بہار کی اردو شاعری پر عمومی روشنی پڑ سکے۔ چونکہ علماء کے لئے ایک الگ باب مخصوص تھا، اس لئے اس باب میں علماء کو شامل نہیں کیا ہے۔ اس باب کو اس انداز پر مرتب کیا ہے کہ رابطہ کا کام کرے۔

باب دوم بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ ہے۔ یہ بھی چار دور پر مشتمل ہے۔ دور متقدمین، دور متوسطین، دور جدید اور دور مابعد جدید۔ یہ باب اہم ہے اور اس تحقیقی مقالہ کا موضوع بھی ہے۔ زبان وادب ارتقائی مراحل سے گذرتے رہے۔ ان میں تیزی سے ترقی ہوتی رہی۔ اس لئے میں نے اس باب میں بھی ہر دور کے شروع میں دور کی خصوصیات اور اردو شاعری کے ارتقائی مراحل کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس دور سے تعلق رکھنے والے علماء کی مختصر سوانح اور ان کے کلام کے نمونہ کو بھی پیش کیا ہے۔ اردو زبان وادب اور اردو شاعری میں علماء کے ذریعہ کئے گئے اصلاحات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اساتذۂ فن کی شاعری سے علماء کی شاعری کا موازنہ کر کے علماء کی شاعری کی قدر و قیمت کو متعین کیا ہے۔ علماء کی شاعری کے شعری محاسن کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ بہار میں اردو شاعری خانقاہوں کے زیر سایہ پروان چڑھی، اس لئے اس میں بازاری اور رکیک خیالات نہیں ہیں۔ اگر کہیں کچھ اس طرح کی بات پائی جاتی ہے، تو شعری محاسن کے ساتھ۔ اس کو بھی میں نے اپنی جگہ پر واضح کیا ہے۔ اس طرح میں نے اس باب کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

باب سوم چند علماء کی شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ اس باب میں میں نے ۱۰ ر علماء کی شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ باب بھی نہایت ہی اہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علماء کی شاعری کا معیار بہت بلند تھا۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ خاص طور پر اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ اپنے کم وسائل کے باوجود اس زبان اور اس کے ادب کے ساتھ اپنے رشتہ کو مضبوط رکھا۔ اس کی آبیاری کی، آگے بڑھایا۔ اور عوام وخواص کے درمیان مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

باب چہارم محاکمہ ہے۔ میں نے اس باب میں علماء کی شاعری کا مکمل جائزہ لیا ہے۔

اور ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے علماء کی شاعری اور ان کے فکر وفن پر بحث کر کے قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ علماء کی شاعری میں فکر وفن اور شعری محاسن کا بھر پور مظاہرہ ہے۔ نیز وہ شعراء جو عالم نہیں تھے، لیکن انہوں نے مشرقی ادبیات کا مطالعہ کیا، اور اس سے رشتہ مضبوط رکھا، ان کی شاعری بھی فکر وفن اور شعری محاسن سے پُر ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ۸۰ ر کی دہائیوں میں غیر علماء شعراء نے جو شاعری کی ہے، اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان میں سے اکثر زبان وادب میں مہارت اور فکر وفن میں کمی کی وجہ سے مغربی ادب سے مرعوب ہو گئے، اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ اور کسی قابل ذکر شاعری کی تخلیق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اس مرعوبیت کے دور میں بھی علماء نے اپنے ادبی سرمائے کو مرعوبیت سے بچا کر رکھا۔ اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ یقیناً ان کی شاعری میں جس فکر وفن اور محاسن کا مظاہرہ ہے، وہ نہایت ہی اہم ہے۔ اس طرح علماء اور مشرقی ادبیات سے رشتہ مضبوط رکھنے والے شعراء کی شاعری زندہ رہنے والی معلوم ہوتی ہے۔ بقیہ زیادہ تر شعراء کی شاعری صرف شاعری ہے، فکر وفن اور محاسن شعری سے عاری۔ اس طرح اس قحط الرجال کے دور میں آج بھی علماء کی شاعری قابل ذکر اور قابل قدر ہے۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ۸۰ ر کی دہائیوں میں علماء میں شاعری کا رجحان کم ہوتا نظر آتا ہے، جس سے مایوسی معلوم ہوتی ہے۔ اہل مدارس اور علماء کو اس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

باب پنجم نمونہ کلام ہے۔ اس باب میں چندان علماء کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، جن کا ذکر گذشتہ باب میں بھی کیا جا چکا ہے۔ بقیہ وہ شعراء ہیں، جن کا تذکرہ گذشتہ کسی باب میں موجود نہیں ہے۔ اس طرح نمونہ کلام کے ساتھ کچھ نئے علماء کی شاعری اور ان کے کلام کے نمونہ کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے علماء کی شاعری کے دائرہ کی وسعت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

مذکورہ تذکرہ علماء کی شاعری پر ایک مختصر جھلک ہے۔ ویسے ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس

مختصر مقالہ میں تمام کو شامل کیا بھی نہیں جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالہ کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق کی جگہ پر بھرپور تحقیق اور تنقید کی جگہ پر بھرپور تنقید سے کام لیا ہے۔ اور بہار کی اردو شاعری میں علماء کے حصہ پر قابل قدر مواد جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق کا میدان وسیع ہے۔ کوئی حرف آخر نہیں ہے۔ پھر بھی میرا یہ مقالہ اپنے اعتبار سے نہایت ہی اہم ہے، کیونکہ اس موضوع پر باضابطہ پہلا تحقیقی کام ہے۔ اردو شاعری پر کام تو بہت ہوا، لیکن علماء کی شاعری پر باضاطہ کام نہیں ہو سکا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے لئے مقدر تھا۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اس موضوع پر تحقیقی کام کیا۔ اور اس کے حق کو بھی ادا کرنے کی کوشش کی۔

اس مقالہ کی ترتیب و تدوین میں میں نے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ خانقاہوں کا سفر کیا، ان کی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ اس کے لئے میں ان اداروں کا شکر گذار ہوں۔ اس پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

آخر میں میں تمام مصنفین و مؤلفین کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی کتابوں اور تحریروں سے میں نے استفادہ کیا۔ خاص طور پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ کا ممنون ہوں کہ میں نے ان کے علمی ذخیرہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ اور اس تحقیقی مقالہ کو مرتب اور مدون کیا۔

مجھے امید ہے کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ بہار کی اردو شاعری میں علماء کے حصہ پر ایک اہم مقالہ ثابت ہوگا۔ اور یہ مقالہ علماء پر کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام کرے گا۔

ابوالکلام قاسمی شمسی

سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

نیو عظیم آبادی کالونی، پٹنہ

پٹنہ

تاریخ: ۱۵؍فروری ۲۰۲۲ء

باب اول

بہار میں اردو شاعری

بہار میں اردو شاعری:

بہار میں چھٹی صدی ہجری سے صوفیائے کرام کی آمد شروع ہو گئی تھی ۔ پٹنہ، مہداواں، منیر اور بہار شریف کی خانقاہوں میں اس کی شہادت موجود ہے۔ حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰ منیری کے جداعلی حضرت امام محمد تاج فقیہ قدس خلیل سے ۵۷۶ھ/ ۱۱۷۸ء میں قصبہ منیر ضلع پٹنہ میں تشریف لائے اور منیر کو فتح کیا۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں صوفیاء کا کردار نہایت ہی اہم رہا۔ انہوں نے اپنی تبلیغ و ارشاد میں مقامی بولیوں کا زیادہ استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ مخلوط زبان جس کی داغ بیل آریوں کے ذریعہ ہندوستان میں داخلہ کے وقت پڑی تھی، اس کو خوب ترقی کے مواقع فراہم ہوئے۔

صوبہ بہار کے صوفیاء کی تصانیف، مکتوبات اور ارشادات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے صوفیاء نے تبلیغ و ارشاد میں مخلوط مگدھی زبان کا استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے صوبہ بہار میں اس زبان کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری (۶۶۱ھ/ ۱۲۶۲ء۔ ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء) کی تصانیف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بندہ نواز گیسودراز کی طرح آپ کی زبان مبارک سے بھی مخلوط مگدھی اردو نما الفاظ نکلے ہیں۔ مثلاً آنکھ کے درد کیلئے آپ کا یہ نسخہ بہت مشہور ہے۔

لوہ پھٹکری مردار سنگ ہلدی زیرہ یک یک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر تھوتھا دال
پوست کے پانی میں پوٹری کریں آنکھ کے پیرا ترتے ہریں (۱)

آپ کا یہ فالنامہ بھی مشہور ہے

دس چار کچھ اگم آوے آٹھ پانچ پھل مانگے آوے
تین اگیارہ بھنچے راج نو سو سترہ کرے اکاج

اس کے علاوہ آپ کا یہ شعر بھی مشہور ہے۔

شرفا گور ڈراون نس اندھیاری رات واں نہ پوچھے کون تمھاری جات (۲)

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

ان (شرف الدین احمد یحیٰ منیری) کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں، جن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ایک حیثیت شاعر کی بھی رہی ہے۔

کالا ہنسا نرملا بسے سمندر تیر : پنکھ پسارے بک ہرے نرمل کرے سریر درد رہے نہ پیر

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے گرد چھوئیں دربار کی درد دور ہوجائے (۳)

حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری کے جانشیں مولانا مظفر بلخی (م ۷۸۸ھ) کی زبان مبارک سے بھی بعض جملے اور اشعار نکلے۔ آپ کا یہ دوہا مشہور ہے۔

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائیں گتیاں

اس طرح مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر خسرو کے قبل ہی بہار میں اردو شاعری کا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا اور اہل بہار اس سے مانوس ہونے لگے تھے۔

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بہار بھی ابتدا ہی سے علمی ماحول کا آئینہ دار رہا ہے۔ تلاش و جستجو سے یہ امر ظاہر ہوجاتا ہے کہ نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں جو ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں، ان میں بہار کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ بہار کے اسی ماحول میں مختلف ادوار میں ہمیں شعرا اور ادباء کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات نے بہار کی ادبی فضا کو برقرار رکھا اور اردو کی ترویج واشاعت بیشتر صوفیائے کرام کی وجہ سے ہوئی۔ صوبہ بہار میں صوفیائے کرام کی آمد ۵۷۶ھ کے پہلے ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ لیکن امام محمد تاج فقیہ اور ان کے شرکائے کار کی آمد سنہ مذکور میں ہوئی۔ آپ کے پرپوتے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمدؒ (۶۶۱ھ تا ۷۸۲ھ) اور آپ کے جانشیں حضرت مولانا مظفر شمس بلخی (متوفی ۸۰۳ھ) اور دوسرے بزرگان دین کے مقولے اور دوہے اردو کے نقوش اولین ہیں۔ یہ بزرگان دین عہد قدیم میں صوفیائے دکن، گجرات، دہلی اور پنجاب کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ آپ کی خانقاہیں اور درسگاہیں رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترویج واشاعت کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ مربوط طور پر اردو شاعری یا نثر کے نمونے نویں یا دسویں صدی کے ہجری کے ابھی تک نہیں ملے ہیں، لیکن تحقیق وتفتیش کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ البتہ دسویں

صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی شاعری کا نمونہ مجھے دستیاب ہوا ہے، جن کے بارے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ چند اوراق منظوم فقہ کے مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس پر ۱۱۶۵ھ کی مہر ہے اور اس پر شرف الدین بڈھانوی کا نام ہے۔ لیکن حرف اور کاغذ قدیم ہے۔ اسی قسم کی دوسری تحریریں بھی دستیاب ہوئی ہیں، جس پر ۱۰۱۵ھ کی کتابت ہے۔ یہ نظم پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ درمیانی اور آخری صفحات غائب ہیں۔ زبان کا ڈھانچہ کھڑی بولی کے ساتھ اور بولیوں سے بھی مخلوط ہے۔ نظم کی ہیئت مثنوی کی ہے۔ جابجا فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ اس شاعر کا نام حسن بن یار ہے۔ اس میں فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب خط نسخ میں ہے۔ کاغذ بھی بوسیدہ ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

ایکت راجا سرجن ہار جسکنہہ بوجھنہ دوئی سنسار
تس کیں پہلیں کرتوں یاد تو تو ہووے دونہہ جگ شاد
اکھی شمس حسن بن یار
مومن کیرا جا نک بچار

مذکورہ بالا حقائق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بہار کی ادبی روایتیں بہت قدیم ہیں اور جدید تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دبستان دکن کے معاً بعد بہار میں تخلیق ادب کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور یہاں کے صوفیائے کرام شعر و ادب کی آبیاری کر رہے تھے، جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری میں داخلیت کا عنصر غالب تھا۔ صوفیانہ خیالات سنجیدگی اور پاکیزگی کی آمیزش نے یہاں کی شاعری کو اور چمکایا۔ پھر تاریخی وجوہ سے پٹنہ اور دہلی کی فضا ایک جیسی تھی۔ اس لئے دہلی کی مماثلت بھی اسے حاصل ہوئی۔(۴)

ڈاکٹر سید اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

بارہویں صدی کے آغاز سے صوبہ بہار پر مسلسل مسلمانوں کی حکومت رہی اور اس علاقہ میں نئے تہذیبی اثرات گھر کرتے رہے۔ بہار اور بنگال سلطنت دہلی کے صوبے تھے۔ جب دہلی کی سلطنت کمزور ہوتی تو یہ صوبے خود مختار ہو جاتے۔ ۱۵۱۸ء میں بابر نے بنگال و بہار پر فوج کشی

کی۔ بابر کی وفات کے بعد لودی اور سوری افغانوں نے اپنی جمعیت کو فروغ دیا۔ ۱۵۷۶ء میں شہنشاہ اکبر نے بہار اور بنگال کو فتح کرلیا۔ پہلے ابواب میں اس امر کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ دو تہذیبوں کے میل سے شاہجہاں کے عہد تک بہار میں اردو زبان رس بس چکی تھی۔ اور اب ادب کی پیدائش و ترقی کا وقت آ گیا تھا۔ شاہزادہ عظیم الشان ۱۶۹۷ء میں پٹنہ آیا۔ اور پٹنہ عظیم آباد بن کر تخت گاہ اردو کی حیثیت سے مسلم الثبوت بنا۔ پھر فرخ سیر یہاں آیا اور امیر الامراء نواب سید حسین علی خاں صوبہ دار پٹنہ کی اعانت سے وہ یہیں شہنشاہ ہندوستان بنا۔ فرخ سیر کی تاجپوشی عظیم آباد میں ہوئی۔ سید حسین علی خاں نے فوج جمع کی اور اسی فوج کی مدد سے فرخ سیر دلی پر قابض ہوا۔ سیر المتاخرین کے مولف سید غلام حسین عظیم آبادی کے قول کے مطابق بہاریوں نے یہ فتح حاصل کی (۱۷۱۳ء)۔ اس کے بعد شاہجہاں آباد دلی اور عظیم آباد پٹنہ کے درمیان روابط و مراسم بہت بڑھ گئے۔ بہت سے امراء دلی چھوڑ کر پٹنہ آ بسے۔ لہٰذا ان کی زبان و معاشرت میں یکرنگی آنے لگی۔ فرخ سیر کے زمانے میں ایک امیر با تدبیر تھا، جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک اور عوام محمد امیر خاں کہتے اور انجمن شعر انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ یہ نواب بھی بیدلؔ ہی کا دلدادہ اور مقلد تھا۔ اور جس وقت استاد اردو کی طرف مخاطب ہوا۔ مودب شاگرد بھی ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔ اس کی اس توجہ و خیال سے اس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دلی گونج اٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اس کی صدا آنے لگی۔ (نصیر حسین خیالؔ عظیم آبادی)۔ مرزا بیدلؔ اورنگزیب کے زمانے میں پٹنہ سے دلی گئے اور فرخ سیر کے عہد تک فارسی اور اردو کو فروغ دیتے اور بہار و عظیم آباد کے نام کو روشن کرتے رہے۔ نواب لطف اللہ خاں صادق اور مرزا معز موسوی خان فطرتؔ دلی سے پٹنہ آئے۔ عظیم آباد پٹنہ نے صوبہ بہار کے دوسری شہروں سے بہ حیثیت زبان و ادب امتیاز حاصل کیا۔ لیکن بہار کے دوسرے مراکز بھی اردو ادب کی تخلیق و ترویج میں مشغول تھے، کیونکہ اردو زبان سارے صوبہ میں آہستہ آہستہ مقبول ہو رہی تھی۔ شہروں اور قصبات میں اردو کو فروغ ہو رہا تھا۔ پٹنہ، گیا، آرہ، چھپرہ اور مظفر پور۔ نیز ان شہروں کے قریبی قصبات اور مفصلات کے علاوہ صوبہ کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں بھی اردو زبان و ادب کی خدمت ہو رہی تھی۔ افسوس کہ بزرگوں کے ادبی سرمایہ کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔ یہاں تحقیقات علمیہ کا کام جب سے شروع ہوا

ہے۔ بہار میں اردو کی قدامت وسعت اور ہمہ گیری ثابت ہوتی جاتی ہے۔ (۵)

مزید تحریر کرتے ہیں:

اب تک کی تلاش و جستجو سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ولیؔ کے زمانے سے بہار میں اردو ادب کی تخلیق ہو رہی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ادب اردو کے سلسلہ میں جس طرح اورنگ آباد دکن کا اثر دہلی پر پڑا ہے۔ اسی طرح ایک حد تک عظیم آباد بہار کے ذریعہ بھی دلی میں تحریک اردو کو تقویت پہنچی ہے۔ عظیم آباد کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے مرکز اور دائرے میں اردو ادب کی تخلیق ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جب دکن، دہلی اور لکھنؤ میں نوبت بہ نوبت اردو کا طوطی بولا تو عظیم آباد میں بھی اس کے ہم صفیر موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ دکن کے دور اولیٰ کے متوازی بھی ادب قدیم کے نمونے بہار میں مل جائیں۔ لیکن اب تک تو دکن کا قدیم ادبی سرمایہ سب پر بھاری ہے اور اغلب یہی ہے کہ اس کی اہمیت غیر متزلزل ہے۔ کیونکہ خاص تاریخی تہذیبی وسیاسی وجوہ کی بناء پر وہاں ''ریختہ'' کا باغ سب سے پہلے لہلہایا۔ یکا دکا پیڑ پودے تو سارے برصغیر ہند میں سرسبز ہوئے۔ بہر کیف تحقیقات اور انکشافات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ علم اور تحقیق کی دنیا میں صوبائی عصبیت، قطعیت اور کٹر پن کی کوئی جگہ نہیں۔

میں تحقیق ومطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دور قدیم اور دور وسطی میں علی الترتیب اردو ادب ہر دبستاں میں بنیادی اعتبار سے یکساں رہا ہے۔ جدت اختراع اور قابل ذکر تبدیلیوں کی سکت ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں نظیرؔ اکبرآبادی ایک استثناء ہے۔ دکن، دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے اردو ادب میں سطحی فرق وامتیاز پایا جاتا ہے۔ ادب کے عام تجربے، ہیئت، صنفیں، مزاج روایات، تلمیحات، تشبیہیں، اور استعارات سب کم وبیش ہر دبستان میں ایک جیسے ہیں۔ یعنی دبستانوں کی انفرادیت اور ان کے فنکاروں کی انفرادیت ہنوز بالیدہ اور نمایاں نہیں ہوئی۔ تھوڑے سے رنگ اور مذاق کا فرق یا بعض صنفوں کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کا امتیاز ضرور پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر دبستان عظیم آباد میں نمایاں انفرادیت نہیں تو کوئی حیرت کی بات بھی نہیں۔ عام طور پر دلی اور پٹنہ کے میلان شعروادب میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اواخر انیسویں صدی میں دبستان لکھنؤ کا اثر بھی بہار پر پڑا ہے۔ اور ایک طبقہ شعراء کا میلان اسی جانب ہو گیا۔

نثر میں بھی ہمیں دلی اور لکھنئو دونوں دبستانوں کا اثر ملتا ہے۔خصوصاً ناول نگاری میں۔ پھر عہد شادؔ میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ دبستان عظیم آباد نے دلی اور لکھنؤ کے مذاق ومیلان کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا جو جیتا جاگتا، خوبصورت، اثر آفریں اور بارآور تھا۔اس امتزاجی فن نے بیسویں صدی کے ادب کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ (۶)

صوبہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری سے اردو شاعری کا تسلسل ہمیں ملتا ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ۔ ۱۱۲۳ھ) کی تقلید شعرائے دہلی نے بھی کی ہے۔سید عمادالدین پھلواروی (۱۰۶۵ھ ۔۱۱۲۴ھ) ملا محمد علیم تحقیق (۱۰۷۰ھ ۔۱۱۶۳ھ)،شیخ مجیب اللہ پھلواروی (۱۰۹۸ھ۔۱۱۹۱ھ) غلام نقشبند سجاد (۱۱۱۶ھ۔ ۱۱۷۳ھ)،حضرت بی بی ولیہ، مہاراجہ رام نرائن موزوںؔ، وغیرہ کے نمونہ کلام اردو میں ملتے ہیں۔شاہ آیت اللہ جوہریؔ (۱۱۲۶ھ ۔۱۲۱۰ھ) غلام یحیٰ، حضور (متوفی ۱۲۰۶ھ) شیخ محمد روشن جوششؔ عظیم آبادی (۱۱۵۰ھ۔۱۲۱۶ھ)۔شاہ نورالحق طپاںؔ (۱۱۵۶ھ۔ ۱۲۲۳ھ) دلؔ عظیم آبادی۔غلام علی راسخؔ عظیم آبادی (۱۱۶۲ھ ۔ ۱۲۳۸ھ)۔شاہ ابوالحسن فردؔ (۱۱۹۱ھ ۔ ۱۲۶۵ھ) کے علاوہ کچھ شعرائے شاہجہاں آباد بھی عظیم آباد آئے اور یہاں کی ادب نوازی کی وجہ کر یہیں کے ہو رہے۔اشرف علی فغاںؔ، میر محمد باقر حزیںؔ (۱۱۶۵ھ) شاہ رکن الدین عشقؔ (۱۲۰۳ھ)۔مرزا محمد علی فدویؔ (۱۲۱۰ھ) مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ۔ضیاؔ عظیم آبادی، استاد میر حسن جیسی شخصیتیں عظمت وشہرت کی حامل رہیں۔مذکورہ بالا شعراء میں زیادہ تر صوفی شعرا تھے۔جن کے اشعار میں صوفیانہ خیالات کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔غزل اور مرثیوں میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی۔ان میں راسخؔ عظیم آبادی کا نام زیادہ روشن ہے۔ کیوں کہ وہ ایک خاص میلان کی وجہ سے شہرت وعظمت کے حامل ہوئے۔غزل اور مثنوی میں بیش بہا اضافے کئے۔ان کی غزلوں میں داخلیت کا عنصر غالب ہے۔اوران کی مثنویاں بھی اسی میلان کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر طیب ابدالی تحریر کرتے ہیں:

راسخؔ عظیم آبادی نے اردو شاعری کی جو شمع جلائی تھی، اس کی لو تیرہویں صدی ہجری میں اور تیز ہوگئی۔ اور یہاں کی اردو شاعری کے میلانات زیادہ قابل توجہ ہوگئے۔چنانچہ اس عہد میں شعرائے بہار نے شاعری کے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی، اور اس میں کمال حاصل کیا۔راسخؔ

عظیم آبادی کے شاگرد فرحتؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۸۶۱ء) شاہ امیرالدین وجدؔ (۱۷۹۸ء تا ۱۸۶۸ء) جعفرحسین خاں فیضؔ (۱۲۱۵ء تا ۱۲۳۸ء) شاگرد مصحفیؔ، حسرتؔ عظیم آبادی (۱۲۳۱ء تا ۱۳۰۴ ء) عبدالحمید پریشاںؔ (۱۲۴۵ھ)۔شوقؔ نیموی (۱۲۷۸ھ تا ۱۳۲۳ھ) شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۷ء) عبدالغفور شہبازؔ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۸ء) صفیرؔ بلگرامی (۱۲۴۹ھ تا ۱۳۰۷ھ) اکبرؔ داناپوری (۱۲۶۰ھ تا ۱۳۲۷ھ) فضل حق آزاد (۱۸۵۲ھ تا ۱۹۴۲ھ) احقرؔ بہاری (۱۲۷۶ھ تا ۱۳۴۸ھ) امدادؔ امام اثر (۱۸۴۹ء تا ۱۹۳۰ء) مشرقیؔ منیری (۱۲۸۱ھ تا ۱۳۴۳ھ) وغیرہ۔اس عہد کے ممتاز شعراء ہیں۔ان شعرائے بہار نے نہ صرف غزل کی آراستگی میں کاوشیں کی۔بلکہ مثنوی اور مرثیہ نگاری کو بھی بیش از بیش فروغ دیا۔ (۷)

بہار کی اردو شاعری کی خصوصیت کے سلسلہ میں پروفیسر معین الدین دردائی تحریر کرتے ہیں:

''بہار کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس نے کاروباری زبان کو علمی اور ادبی زبان سے بالکل علیحدہ رکھا۔اہل بہار روزمرہ کی زبان میں تو بیشک مگدھی زبان کا استعمال کر لیتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے علمی اور ادبی خزینہ کو مقامی آلودگیوں سے بالکل صاف رکھا۔سید عمادالدین عمادؔ، غلام نقشبند سجادؔ اور مرزا بیدلؔ وغیرہ گیارویں اور بارہویں صدی کے شعراء ہیں، لیکن ان کی زبان یقیناً ستھری اور نتھری ہوئی ہے، برخلاف اس کے دکن میں تامل اور تلنگی وغیرہ نے اردو ادب اور انشاء پر کافی اثر ڈالا ہے۔فراقیؔ، غوثیؔ، لطفیؔ اور ولیؔ وغیرہ کے کلام میں مقامی پراکرتوں کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ (۸)

اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے شعراء بہار نے وسعت خیال، دقت نظر، معانی آفرینی، نکتہ سنجی اور سلاست لسانی سے کام لیا۔اس طرح جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اردو شاعری کا رنگ نکھرتا گیا۔اس لئے بہار کی اردو شاعری کو میں نے چار دور میں تقسیم کیا ہے۔ دور متقدمین، دور متوسطین، دور جدید اور دور مابعد جدید۔دور مابعد جدید میرے تحقیقی خاکہ میں شامل نہیں تھا، مطالعہ کے دوران یہ حقیقت سامنے آئی کہ ۱۹۸۰ء کے بعد ایک اور دور مابعد جدید بھی ہے، اس لئے میں نے اس کو بھی شامل کر دیا ہے۔

تحقیق کے مطابق بہار میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز بیدلؔ سے ہوا۔بیدلؔ کی پیدائش

۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء ہے۔طفولیت کے سال کو چھوڑ دیا جائے۔تو تقریباً ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء سے اردو شاعری کا باضابطہ آغاز سامنے آتا ہے۔اس میں اردو شاعری کا کام اپنے پرانے انداز پر چلتا رہا۔یہاں تک کہ راسخؔ عظیم آبادی (۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء - ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء) نے اردو شاعری کو نیا رنگ وآہنگ دیا۔اس لئے میں نے ابتدا سے راسخؔ عظیم آبادی تک کے دور کو دور متقدمین قرار دیا ہے۔پھر راسخؔ عظیم آبادی سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔اور یہ سلسلہ آگے کی طرف بڑھتا ہے۔اور شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء -۱۹۲۷ء) تک پہنچتا ہے۔یہ اردو شاعری کا دوسرا دور ہے۔جس کو میں نے دور متوسطین کا نام دیا ہے۔پھر شادؔ عظیم آبادی نے اردو شاعری کو نئے انداز سے روشناس کرایا۔اور سلسلہ ۱۹۸۰ء تک چلتا ہے۔اس طرح شادؔ عظیم آبادی سے ۱۹۸۰ء تک کے دور کو دور جدید پھر ۱۹۸۰ء کے بعد اردو شاعری نئے رنگ میں نظر آتی ہے۔اور سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔اس لئے ۱۹۸۰ء سے ابتک یعنی ۲۰۱۴ء تک کو مابعد جدید دور یا دور حاضر کے نام سے موسوم کیا ہے۔اس دور میں دور جدید کے باحیات شعراء بھی ہیں ۔چونکہ ان کی شاعری میں بھی دور جدید کا رنگ پایا جاتا ہے۔جبکہ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعراء میں مابعد جدید دور کا رنگ نظر آتا ہے۔اس لئے اس دور میں جدید اور مابعد جدید دونوں دور کے شعراء کے کلام کو پیش کیا گیا ہے، تاکہ ماقبل اور مابعد کی اردو شاعری کا آپ خود موازنہ کرسکیں۔اور اردو شاعری کے معیار کو پرکھ سکیں۔

سال کے اعتبار سے دور کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دور متقدمین (بیدلؔ عظیم آبادی سے راسخؔ عظیم آبادی تک)۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء سے ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء تک

دور متوسطین (راسخؔ عظیم آبادی سے شادؔ عظیم آبادی تک)۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۴۶ء تک

دور جدید (شادؔ عظیم آبادی سے ۱۹۸۰ء تک)۱۸۴۶ء سے ۱۹۸۰ء تک۔

مابعد جدید دور یا دور حاضر۔۔۔۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۴ء تک۔

چونکہ علماء کیلئے آئندہ باب مخصوص ہے، اس لئے اس باب میں تینوں ادوار کے غیر علماء شعراء کا مختصر تذکرہ اور نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے تاکہ بہار کی اردو شاعری پر پورے طور سے روشنی پڑ سکے۔

دورِ متقدمین

دورِ متقدمین

دورِ متقدمین کی شاعری میں مفہوم کی سادگی اور صفائی ہے۔اس دور کے شعراء نے ذومعنی الفاظ سے پرہیز کیا۔فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتاہے۔ البتہ خیالات میں پاکیزگی ہے۔اور مضامین میں رنگا رنگی ،ساتھ ہی صوفیانہ خیالات زیادہ پائے جاتے ہیں۔اس دور کی شاعری میں تہذیب وثقافت کی عکاسی بھی ملتی ہے۔اس دور کے چندشعراء کا تذکرہ اورنمونہ کلام پیش ہے۔

(۱)

مرزا عبدالقادر بیدلؔ

مرزا بیدلؔ کا نام عبدالقادر تھا۔ ڈاکٹر سید اختر اور ینوی تحریر کرتے ہیں:

عبدالقادر، خلف مرزا عبدالخالق۔ متوطن عظیم آباد، ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ایک مدت تک ناظم بنگالہ شہزادہ محمد اعظم خلف اورنگ زیب کے دربار سے منسلک رہے۔ پھر دکنؔ کی سیاحت کو نکل کھڑے ہوے۔ کچھ عرصہ دکنؔ میں رہنے کے بعد دلی چلے آئے اور عمر کا بقیہ حصہ وہیں گزارا۔ ماہ صفر ۱۱۳۳ھ میں انتقال ہوا۔

صفیرؔ بلگرامی، تذکرہ جلوہ خضر، جلوہ پنجم میں لکھتے ہیں:

یہ بھی مصلحان اردو میں شمار ہوتے ہیں، گو کہ فارسی میں شاعری فرماتے تھے، مگر خود اپنے طور پر اردو میں بھی کچھ کہہ گئے ہیں۔ بیدلؔ مرزا عبدالقادر عظیم آبادی عمدہ سخن طرازوں میں سے ہیں، اقسام نظم میں پایہ بلند اور اسلوب نثر میں رتبہ ارجمند رکھتے ہیں۔ بلدۂ عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے اور ہندوستان میں نشوونما پائی۔۔۔ اور سوم صفر ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔

مرزا بیدلؔ کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ انہیں کوئی بخاری کہتا ہے، کوئی لاہوری، کوئی دہلوی، کوئی اکبرآبادی اور کوئی عظیم آبادی۔ بندرابن خوشگوؔ نے اپنے تذکرہ، سفینۂ خوشگو میں بیدلؔ کو اکبرآبادی لکھا ہے۔ علامہ آزادؔ بلگرامی نے اپنے تینوں تذکروں یعنی ''ید بیضاؔ'' ''خزانہ عامرہ'' اور ''سروآزاد'' میں بیدلؔ کو عظیم آبادی بتایا ہے۔ آزادؔ بلگرامی، بیدلؔ کی وفات کے وقت سترہ سال کے تھے۔ مصحفیؔ کے تذکرہ ''عقد ثریاؔ'' میں بھی بیدلؔ کو عظیم آبادی تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ سلیمان ندوی کا خیال بھی یہی ہے کہ بیدلؔ کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا۔ اس عظیم المرتبت شاعر کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گزرا ہے۔ بیدلؔ کے والد اور چچا مرزا قلندر نے آرہ ضلع کے ایک بزرگ شاہ کمالؔ قادری سے بیعت کی تھی۔ وہ انہی کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے۔ (۹)

مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے سلسلے میں محققین کی تحقیق پیش ہے۔

مرزا بیدلؔ عرف سعیدی گیلانی کے والد ماجد کا اسم گرامی میرزا عبدالخالق تھا۔ وہ سپاہی پیشہ تھے اور اچھی زندگی بسر کرتے تھے۔ ترکوں کے ایک مشہور قبیلہ ''برلاس'' سے ان کا تعلق تھا۔

ترکستان کے رہنے والے اور تورانی الاصل تھے۔میرزا عبدالخالق اوئل عمر ہی سے ترک ماسوا کر کے خلوت کدہ وحدت کے تماشائی بن گئے تھے۔آخر عمر میں ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء میں بیدلؔ بمقام عظیم آباد پٹنہ پیدا ہوئے۔بیدلؔ کے والد قادری المشرب تھے اور حضرت قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روحانیت سے فیض یاب تھے۔اس مناسبت سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالقادر رکھا تھا۔بیدلؔ لکھتے ہیں "تلقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات تقدس آیات بود" (۱۰)

اس وقت شاہجہاں سریر آرائے سلطنت تھا۔بیدلؔ کے مولد کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔میر قدرت اللہ قاسم کا بیان سب سے عجیب ہے۔اس نے بیدلؔ کو بخارا المولد بتایا ہے۔سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ "وہ ان کے آباواجداد کا مولد ہو تو مگر ان کا تو مطلق نہیں۔" (۱۱)

طاہر نصر آبادی کے اس بیان کی کہ بیدلؔ لاہوری تھے۔خوشگو نے اپنے سفینہ میں اسی زمانے میں تردید کر دی تھی۔لیکن اس کا یہ بیان کہ بیدلؔ اکبر آبادی الوطن تھے،اس تصریح سے خالی ہے کہ بیدلؔ اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ممکن ہے ان کے بزرگوں نے ترکستان چھوڑنے کے بعد اکبر آباد کو اپنا وطن بنالیا ہو۔(بیدلؔ) تورانی الاصل اکبر آبادی الوطن است۔آنچہ طاہر نصر آبادی در اصل ایشاں نوشتہ کہ لاہوریست اصلی ندارد۔ (۱۲)

علی قلی ہدایت نے اپنے تذکرہ ریاض العارفین میں (جو ۱۲۶۰ھ میں ترتیب دیا گیا تھا) ان کو دہلوی لکھا ہے۔ان کی تائید ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے بھی کی ہے۔

غلام ہمدانی مصحفیؔ نے اپنی تالیف عقد ثریا (تذکرہ فارسی گویان) میں بیدلؔ کو عظیم آبادی تسلیم کیا ہے:

"باید دانست کہ اصل مرزائے مذکور از گروہ ارلاس است در بلدہ عظیم آباد از گلستان عدم دریں تماشا گاہ خرامید وخود را در بلاد ہند انداختہ نشوونمائے یافتہ" (ص ۱۶) نیازؔ فتح پوری نے حسین قلی خاں عظیم آبادی کے تذکرہ نشتر عشق (قلمی) کے حوالے سے بیدلؔ کی جائے پیدائش عظیم آباد (پٹنہ) ہی تحریر کی ہے۔سفینہ ہندی میں ہے: اصلش از قوم ارلاش است و در بلدہ پٹنہ متولد شدہ۔(سفینہ ہندی)۔ (۱۳)

محمد حسین آزاد نے بیدل کا مولد ہندوستان تحریر کیا ہے:

''عبدالقادر نام بیدل تخلص۔ مولد ہندوستان، قوم ترک قبیلہ برلاس سے تھا۔ اس سے شاید یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بیدل ہندوستان میں متنازعہ فیہ مسئلہ کا حل تلاش کرنا مشکل تھا۔ وہ ہندوستان کو بیدل کا مولد لکھ کر صاف پہلوتہی کر گئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان کے اصلی وطن کا تعین قطعی طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ یا ممکن ہے بڑے بوڑھوں کی طرح ہندوستان سے ان کی مراد شمالی ہند یعنی یوپی یا صوبہ بہار ہو۔ (۱۴)

علامہ اقبال نے ترکستان کے شاعر توفیق فکرت کا ذکر کرتے ہوئے بیدل کو اکبرآبادی ہی لکھا ہے۔ غالباً انہوں نے خوشگو کا بیان صحیح سمجھ کر اسی پر اکتفا کیا اور مزید تحقیقات کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

علی شیر قانع ٹھٹھوی مصنف تحفتہ الکرام لکھتے ہیں:

''میرزا عبدالقادر بیدل اصل پٹنہ در شاہجہاں آباد توطن گرفتہ۔'' (۱۵)

تذکرہ مرأۃ الخیال کے مولف امیر شیر علی خاں لودی صرف اتنا کہہ کر کہ ''ازقوم چغتائی برلاس است و در ہند نشو ونما یافتہ''۔ خاموش ہو جاتے ہیں۔ (۱۶)

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ''برہان'' دہلی کی جنوری ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:۔ نام عبدالقادر اور تخلص بیدل تھا۔ اس کا اصل وطن توران تھا لیکن پیدا بخارا میں ہوا۔ (ص،۱۵) ممکن ہے میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' ان کی نظر سے گذرا ہو۔

عابد حسین فریدی اور ڈاکٹر اختر اورینوی دونوں متفق ہیں کہ بیدل بلدہ عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ (۱۷)

نظامی بدایونی ''قاموس المشاہیر'' میں لکھتے ہیں کہ ''اس کا (مرزا بیدل) اصلی وطن توران تھا بخارا میں پیدا ہوا۔ نہایت صغرسنی میں بعہد جہانگیر ہندوستان آیا۔'' (قاموس الشاہیر جلد اول، ص ۱۴۷) آخری جملہ محل نظر ہے۔ جہانگیر نے ۱۶۲۷ء میں وفات پائی اور بیدل ۱۰۵۴ھ مطابق ۱۶۴۴ء میں تولد ہوئے جب شاہجہاں سریرآرائے سلطنت تھا۔ لہٰذا نظامی کا بیان سراسر غلط ہے۔

میر غلام علی آزاد ید بیضا میں رقمطراز ہیں۔ ''اصلش ازقوم ''ارلاس'' در بلدہ پٹنہ متولد شدہ بہ ہندوستان نشو ونما یافت

سروآزاد (مآثرالکرام) کی عبارت یوں ہے:

''ازنژادقوم''ارلاس'' دربلدہ عظیم آباد پٹنہ ازنہاں خانہ عدم بشہر ستان وجود خرامیدو درہندوستان نشوونمایافت''(۱۸)

اور''خزانہ عامرہ''میں درج ہے:

''اصلش ازگروہ ارلاسؔ دربلدہ عظیم آباد پٹنہ ازشبستان عدم بہ صبح کدہ ہستی دررسیدودر بلاد ہندوستان نشوونمایافت، ودربنگلہ بیشتر بسرمی برد۔''(۱۹)

سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ بیدلؔ کی پیدائش اکبرآباد میں نہیں ہوئی ہے، کیونکہ ہر موطن کا مولد ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ بیدلؔ کا مولد ومنشاء صوبہ بہار تھا۔جس کا دالحکومت عظیم آباد (پٹنہ) تھا۔اور ہے، اس دعوے کی شہادت کے طور پر وہ میر غلام علی آزاد جیسے محقق کا بیان پیش کرتے ہیں جس نے اپنے تینوں تذکروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ثانیاً وہ داخلی شہادت یعنی خود بیدلؔ کے اثرات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں، ان کا مولد ومنشاء بہار ہے یا کم ازکم ان کی طفولیت اورآغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گذرا ہے۔(۲۰)

عبدالوہابؔ افتخار نے بھی اپنے تذکرہ بے نظیر میں اپنے استاد کی تقلید میں بیدلؔ کو عظیم آبادی کہا ہے۔

ڈاکٹر امانت تحریر کرتے ہیں:

مصحفی کا تذکرہ عقد ثریا تو بیدلؔ کی وفات کے ٦٦ سال بعد تالیف کیا گیا،لیکن غلام علی آزادؔ کے ماموں سید محمد جو بیدلؔ کے معاصر تھے اور ان کی صحبت میں بیٹھ چکے تھے، انہوں نے محض اس لحاظ سے کہ وہ دہلی میں سکونت پذیر تھے۔انہیں شاعر شاہ جہاں آباد لکھا ہے۔اسی لحاظ سے خوشگو نے اکبرآبادی لکھ دیا ہوگا۔ کیونکہ مرزا کا قیام اکبرآباد میں بھی رہا تھا۔ خوشگو کا بیان جسے قاضی عبدالودود صاحب مستندتر سمجھتے ہیں۔غلط فہمی پر مبنی ہے۔کیونکہ قریبی تعلقات کے باوجود خوشگو نے مرزا بیدل کے بعض حالات غلط لکھے ہیں۔جس کا اندازہ چہارعنصر سے بخوبی ہوسکتا ہے۔(۲۱)

مزید تحریر کرتے ہیں:

جہاں تک ان کی ولادت کا سوال ہے۔آزاد اور مصحفی کا بیان بالکل صحیح ہے۔جس کی

تائید ''عقد ثریا'' اور عبرتی کے مجموعہ مکاتیب ''ریاض الافکار'' سے بھی ہوتی ہے۔ **(۲۲)**

''بیدلیات'' کے بلند پایہ محقق ڈاکٹر عبدالغنی بھی بیدلؔ کا مقام ولادت عظیم آباد پٹنہ ہی بناتے ہیں۔

''چہار عنصر'' میں بیان کردہ واقعات اور حالات سے صاف ظاہر ہے کہ بیدلؔ کو صوبہ بہار سے موروثی تعلق ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی اگر اس کو (بیدلؔ) عظیم آبادی کہنے میں تامل ہو تو بہاری کہنے میں مطلق تامل نہیں اور اکثر قصباتی لوگ بہاری کے بجائے عظیم آبادی ہی کہلاتے ہیں۔ عظیم آباد پٹنہ کے شرفاء کی زبان پر بھی بیدلؔ کے عظیم آبادی ہونے کی داستان سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آئی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:

مرزا عبدالقادر بیدلؔ خاص عظیم آباد پٹنہ کے متوطن تھے۔۔۔۔۔۔۔۔اگلے لوگوں سے سنا ہے کہ مرزا محلہ پٹن ڈیوی (محلہ چھوٹی پٹن دیوی اردو ادب، شمارہ ۱/ ۶۲، ص ۵) میں رہتے تھے۔ لیکن کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ **(۲۳)**

''سفینہ خوشگو مئولفہ بندرا بن راقم خوشگو کے حوالے سے عطا کاکوی اور قاضی عبدالودود نے تفصیلی بحث کر کے اپنے مضامین میں طے کر دیا ہے کہ بیدلؔ کی پیدائش نہ بخارا میں ہوئی، نہ دہلی میں عظیم آباد بھی ان کی جائے ولادت نہیں، ان کی پیدائش راج محل کی پہاڑیوں کے پاس اکبر نگر حلقہ میں ہوئی تھی۔ (مضمون محمد زاہد الحق خدا بخش لائبریری جرنل)

واضح ہو کہ راج محل مرشد آباد زمین داری اور بنگال صوبہ میں واقع تھا اور آج بھی ہے۔ اس زمانہ میں بہار، اڑیسہ اور بنگال سبھی مشترک تھے۔ اور صوبہ بنگال ہی کہلاتا تھا۔ اور بنگال سے الگ ہونے کے بعد بہار میں ہو گیا۔ اس طرح بیدلؔ کی پیدائش بہار ہی میں ٹھہرتی ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے بیدلؔ کی جائے پیدائش عظیم آباد قرار دیا ہے۔ اگر بیدلؔ کی جائے پیدائش راج محل کے اکبر نگر میں مان لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش تو اکبر نگر میں ہوئی اور تعلیم و تربیت عظیم آباد اور بہار کے دیگر جگہوں پر ہوئی۔

''چہار عنصر'' میں خود بیدلؔ نے دو دفعہ اکبر آباد کا ذکر کیا ہے:

''در بلدہ اکبر آباد منظور ابرار امیر کامگار کہ بدلیل سعادت ازلی اوقات گرامی مصروف خدمت فقرا داشت و در احترامیکہ لائق حال ایں طائفہ است۔۔۔

اور ''تابستانی درگوشہ از زوایائے اکبرآباد گرمی ہائے صحبت تنہا یم بساط عافیتی پرداختہ بود۔'' (۲۴)

مگر بیدلؔ کے ان الفاظ سے مطلق بوئے وطن نہیں آتی ۔ بیدلؔ کا کلام اس کے سوانح حیات ہی ہیں، ''چہار عنصر'' میں اس نے اپنے سوانح زندگی مختلف واقعات کی صورت میں قلمبند کئے ہیں۔ اس نے اپنی تاریخ ولادت خود کہی ہے۔

بسائی که بیدلؔ بملک ظهور
ز فیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگی خبرداد از مو لدش
که هم ''فیض قدس'' است ''وهم انتخاب'' (۱۰۵۴)

لیکن مادہ تاریخ مولانا قاسم درویش کی کاوش ذہنی کا نتیجہ ہے جن کی طرف بیدلؔ نے خود تیسرے مصرعہ میں اشارہ کیا ہے اور خوشگوا پنے سفینہ میں یوں رقمطراز ہے۔

''مولانا قاسم درویش که ازا آشنایان پدرش بود به قوت ریاضت بریاضی و مستقبل روزگار اطلاع گشت، لفظ ''انتخاب'' تاریخ ولادت آن جز وزماں یافتہ''۔ (۲۵)

بیدلؔ کم سنی ہی میں باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

سید سلیمان ندوی کہتے ہیں:

''وہ بچہ ہی تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی، ماں نے اپنے بچہ کو چھٹے سال چھٹے مہینے (رجب میں) پڑھانے کو بٹھایا، دسویں برس کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے فارسی نظم ونثر اور عربی، صرف ونحو کی کتابیں تمام کیں۔'' (۲۶)

اس بیکسی کے عالم میں ان کے چچا مرزا قلندر ان کی تعلیم وتربیت اپنے ذمہ لی۔ جس کا اعتراف بیدل نے اپنی کتاب ''چہار عنصر'' میں کیا ہے۔ ان کے چچا مرزا قلندر نے سیف خان کے مدرسہ میں تعلیم کے لئے داخل کر دیا۔ مدرسہ سیف خان پٹنہ سیٹی میں واقع ہے۔ اس کے کھنڈر لب گنگا اب تک موجود ہیں۔ مرزا بیدلؔ نے ابتدائی تعلیم سیف خان کے مدرسہ میں حاصل کی۔ پھر اس کے بعد شاہ کمال، شاہ کابلی، شاہ فاضل، شاہ قاسم ہواللہی، شاہ ملوک وغیرہ سے تعلیم کی تکمیل کی۔ شاہ کمال رانی ساگر کے رہنے والے تھے۔ شاہ ملوک رانی ساگر کے قریب سرائے بنارس میں سکونت پذیر تھے۔

شاہ قاسم ہواللہی سے بیدؔل نے اڑیسہ کے راجدھانی کٹک میں تعلیم حاصل کی۔**(۲۷)**

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ بیدؔل کی تعلیم پورے طور پر بہار میں ہوئی۔اور وہ اپنے چچا مرزا قلند کے ساتھ بہار کے مختلف جگہوں پر آتے جاتے رہے۔چنانچہ حیات بیدؔل میں ہے۔

بہار کے مختلف شہروں میں بھی ان کی آمدورفت ہوتی رہی ہے۔ان کا ۱۰۷۵ھ تک کا زمانہ عظیم آباد، رانی ساگر، آرہ، مہسی، کٹک اور کساری میں گزرا۔اس کے بعد وہ شاہجہاں کی طرف چلے گئے۔اور پھر صوبہ بہار اڑیسہ کے طرف نہ لوٹے۔لیکن ان مقامات پر نظر غائر ڈالنے پر یہ بات آشکارا ہوجاتی ہے کہ طفلی سے شباب تک ان کا تعلق زیادہ تر صوبہ بہار سے ہی رہا۔اور شباب تا پیری اور آخری ایام دہلی میں گذرے۔**(۲۸)**

بیدؔل کی جائے پیدائش کو میں نے انٹرنیٹ پر سرچ کیا، وہاں بھی بیدؔل کی جائے پیدائش عظیم آباد مذکور ہے۔

دائرہ معارف اسلامیہ میں مذکور ہے۔

میرزا عبدالقادر نام، ابوالمعالی لقب، عہد عالمگیری کے مشہور فارسی گو شاعر، عارف کامل اور عظیم مفکر، تورانی الاصل، قبیلہ چغتائی ارلاس (یا برلاس) پیدائش ۱۰۵۴ھ، ۱۶۴۴ء بمقام پٹنہ۔ وفات ۴؍صفر ۱۱۳۳ھ/ ۵؍دسمبر ۱۷۲۰ء بمقام دہلی، آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ بیدؔل کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے۔ان کے چچا میرزا قلندر (م۔۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء) نے ان کی پرورش کی۔**(۲۹)**

خواجہ عباد اللہ اختر تحریر کرتے ہیں:

بیدؔل کا کلام دراصل اس کے سوانح حیات، اس کے مشاہدات واحساسات وافکار کا مجموعہ ہے۔چہار عنصر میں اس نے وہ واقعات جنہیں عرف عام میں سوانح زندگی کہتے ہیں۔وہ خود قلمبند کئے ہیں۔تذکروں میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ نے بیدؔل کے حالات لکھے ہیں۔مختصر یہ کہ اصل چغتائی برلاس ہے، ۱۰۵۴ھ میں بلدہ عظیم آباد پٹنہ میں ولادت واقع ہوئی۔ **(۳۰)**

پروفیسر نبی ہادی نے اپنی کتاب میرزا بیدؔل میں شفیق اورنگ آبادی کی تصنیف تذکرہ شام غریباں کے حوالے سے بیدؔل کی جائے پیدائش اکبر نگر قرار دیا ہے۔وہ تحریر کرتے ہیں:

میرزا عبدالخالق کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ سنہ ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۶۴ء کا واقعہ ہے۔ وہ اس وقت امور منصبی کے سلسلہ میں اکبرنگر نام کے ایک مقام پر تعینات تھے۔ **(۳۱)**

مذکورہ کتاب میں بیدلؔ کی ابتدائی زندگی جو بہار میں گذری اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جوانی کے بعد کے حالات درج ہیں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے بیدل کی جائے پیدائش عظیم آباد قرار دیا ہے۔ لیکن خوشگو نے ان کی جائے پیدائش اکبرآباد نقل کیا ہے۔ قاضی عبدالودود تحریر کرتے ہیں میرے نزدیک اب یہ بات ثابت ہے کہ وہ (بیدلؔ) راج محل میں پیدا ہوئے تھے۔ جس کا ایک دوسرا نام اکبرنگر ہے۔ یہ بات واردؔ نے جس کے بیدلؔ سے گہرے تعلقات تھے اپنی کتاب واردات یا مرءۃ الواردات میں لکھی ہے۔ **(۳۲)**

قاضی عبدالودود اور سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی نے بیدلؔ کی جائے پیدائش اکبرنگر عرف راج محل قرار دیا ہے۔ بیدلؔ کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں یہ آخری تحقیق ہے۔ جواب تک قابل قبول ہے۔ اس لئے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ تجزیہ کے لئے پہلے عطا کاکوی کی تحریر پیش ہے۔ عطا کاکوی اپنی کتاب حیرت زار میں تحریر کرتے ہیں:

(وارد نے ایک تذکرہ مراۃ واردات لکھا تھا، جو اب ناپید ہے۔ شفیق نے اپنے تذکرہ شام غریباں میں جو پاکستان سے شائع ہوا ہے بیدلؔ سے متعلق جو عبارت تھی نقل کی ہے۔ چونکہ یہ تذکرہ عام نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس لئے یہاں اس کی نقل کر دینا مناسب سمجھا گیا۔)

''طائر خوش نوائے وجود میرزا از گلستان عدم در اکبرنگر عرف راج محل از ممالک بنگال پر پرواز کشود و مدتی دراں سرزمین معاش بجمعیت بسر بردو درکمال جوانی رو بہ ہندوستان آور دونخست درصحبت میرزا سلیمان خالوی حقیقی سلطان محمد معزالدین خلف شاہ عالم بن عالم گیر سالہا بسر برد۔ بعدفوت میرزا سلیمان درسلک ملازماں اعظم شاہ بن عالم گیر منسلک گشتہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔ روزی یکی از مقربان بساط سلطنت اشعار میرزا بہ سمع بادشاہ رسانید۔ شاہ پرسید ایں اشعار کیست؟ عرض کرد کہ از میرزا بیدل شاہ۔ بر سبیل خوش طبعی فرمود' بیدل را در لشکر ما کہ تمام جوانان پردل اند چہ کار؟ میرزا بہ مجرد استماع ایں فحوای خارج آہنگ ازاں مقام قدم بہ وادی سفر

گذاشت ۔پس از قطع منازل در بلدہ متھرا بر کنار دریائے جمن اقامت گزید۔لعلؔ محمد نامی حاکم آں مکان نائب حسن علی خاں بہادر الہہ وردی خاں از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دلجوی وخاطر داری کوشید۔میرزا نیز دلدادۂ صحبت اوشد۔اتفاقاً سلطان عالم گیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید۔لعل محمد موجب حکم بادشاہ جبراًوقہراًروبراہ سفر دکن آورد ودرعرض راہ سمند عزیمت بصوب اقلیم عدم جلوۂ ریز ساخت۔میرزا تامدت یک ونیم سال درخانہ راقم ایں اوراق بےتشویش معاش رحل اقامت افگند تا آنکہ قاصد شکراللہ خاں کہ دراں ایام بہ حکومت بلدۂ نارنول من اعمال میوات می پرداخت پیش میرزا سید ومکتوب اشتیاق مع زرے رسانید۔میرزا از وقوع چنیں اتفاق وداع والد بندہ نمودہ روی توجہ بصوب خاں مذکور آورد وتا انقطاع سر رشتہ حیات خاں مذکور نوعے فی مابین مضموا تحاد واخلاص بستہ شد کہ خیال مفارقت معنی بیگانہ بود۔(۳۳)

بیدلؔ کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود کی تحریر ملاحظہ ہو:

(**بیدل کا مولد**) بیدل نے اپنی نظم ونثر میں اپنے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔جونا گفتنی تھا۔مگر اس سے یہ پتا نہیں ملتا کہ یہ کہاں متولد ہوئے تھے۔اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر کا ابتدائی قصہ کسی حدتک صوبہ بہار میں گزرا تھا۔اور وہ یہیں سے دہلی گئے تھے(کلیات میں قطعہ تاریخ) یہ اور آزاد بلگرامی کا انہیں عظیم آبادی لکھنا اس کے لئے کافی ہے کہ اہل عظیم آباد اس پر مصر ہوں کہ عظیم آباد ان کا مولد ہے۔میرے نزدیک اب یہ ثابت ہے کہ وہ راج محل میں پیدا ہوئے تھے۔جسکا ایک دوسرا نام اکبرنگر ہے۔یہ بات واردنے جس کے بیدلؔ سے گہرے تعلقات رہے تھے،اپنی کتاب مرآت واردات (یا مرآۃ الواردات؟) میں لکھی ہے۔یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری،مگر اس کا ایک طویل اقتباس شام غریباں مصنفہ شفیق میں درج ہے۔شام غریباں میں بیدل کا ذکر ہونا نہ تھا۔اس لئے کہ یہ تذکرہ صرف ان شعراء کا ہے جو بیرون ہند سے ہند آئے تھے۔مگر شفیق نے لکھا ہے کہ بیدل کی اہمیت کے پیش نظر ایسا ہو،ایہ کتاب رسالہ اردو کراچی میں باقساط شائع ہورہی تھی۔اور میرا خیال ہے کہ مکمل ہوگئی ہوگی۔خوشگو نے جو بیدل کو اکبرآبادی لکھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے بیدلؔ کی زبان سے اکبرنگر سنا۔مدت کے بعد جو بیدلؔ کا ترجمہ سپرد قلم کرنے لگا تو حافظے نے

''نگر'' کو آباد بنا دیا۔ **(۳۴)**

آپ نے بیدلؔ کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود اور عطا کاکوی کی تحریر کو پڑھا۔ جو مرأۃ واردات کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ تحریر کے پڑھنے سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱: مرأۃ واردات نامی کتاب کو نہ تو قاضی عبدالودود نے دیکھا نہ عطا کاکوی نے۔

۲: عطا کاکوی نے اپنی کتاب میں شفیق کے تذکرہ شام غریباں سے مرأۃ واردات کی عبارت نقل کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے خود مرأۃ واردات کو نہیں دیکھا۔ جس کا اعتراف قاضی عبدالودود نے اپنی تحریر میں کر دیا ہے۔

۳: مرأۃ واردات کی تحریر سے یہ ظاہر ہے کہ جوانی میں مرزا بیدلؔ شفیع وارد کے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ اس سے پہلے کے حالات کا کوئی تذکرہ مرأۃ واردات میں نہیں ہے۔

۴: تذکرہ مرأ ۃ واردات میں مرزا بیدلؔ کی جائے پیدائش اکبرنگر عرف راج محل مذکور ہے۔ بیدلؔ نے شفیع وارد سے اپنی جائے پیدائش کے سلسلہ میں اکبرنگر عرف راج محل کا تذکرہ کیا کہ نہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

۵: شفیع وارد اور شفیق دونوں ہی مجہول الحال ہیں۔ ان دونوں کے سلسلہ میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔

۶: قاضی عبدالودود نے خوشگو پر اعتماد کیا اور پھر اس سے بدل کر شفیع وارد کی تحریر کو اپنی تحقیق کا ماخذ بنایا، اور اس کے لئے بیجا تاویل کیا کہ خوشگو نے جو بیدلؔ کو اکبرآبادی لکھا ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے بیدلؔ کی زبان سے اکبرنگر سنا، مدت کے بعد جب بیدلؔ کا ترجمہ سپردِ قلم کرنے لگا تو حافظے نے نگر کو آباد بنا دیا، انہوں نے اس تاویل کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ جو تحقیق کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

۷: سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی کی کتاب حیرت زار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شام غریباں کے بارے میں مذکور ہے کہ تذکرہ شام غریباں جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ بیدل کے متعلق یہ عبارت مذکور ہے۔ جبکہ پاکستان ہی سے دائرہ معارف اسلامیہ

۱۹۷۱ء میں اور خواجہ عباداللہ اختر کی تصنیف بیدلؔ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تحقیقی ہیں۔ ان میں بیدلؔ کی جائے پیدائش عظیم آباد (پٹنہ) مذکور ہے۔ نیز بیدلیات کے بلند پایہ محقق ڈاکٹر عبدالغنی بیدلؔ کا مقام ولادت عظیم آباد تحریر کرتے ہیں۔

اس طرح تحقیق کی روشنی میں بیدلؔ کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود اور سید شاہ عطاء الرحمن عطاؔ کاکوی کی تحقیق قابل قبول نہیں ہے۔ ان دونوں محققین کی تحقیق جمہور کے خلاف ہے۔ اس لئے جمہور محققین کی تحقیق ہی قابل قبول ہے اور اس کے اعتبار سے بیدلؔ کی جائے پیدائش عظیم آباد ہے۔

اگر ان کی تحقیق کو قبول کر لیا جائے کہ بیدلؔ کی پیدائش اکبر نگر عرف راج محل میں ہوئی۔ تو اس اعتبار سے بھی بیدلؔ کی جائے پیدائش صوبہ بہار ہے۔ اس لئے کہ راج محل صوبہ میں واقع ہے۔ یہ دُمکا اور صاحب گنج سے قریب ہے۔ بیدلؔ کی پیدائش راج محل میں اور ان کی تعلیم و تربیت عظیم آباد میں ہوئی۔ اور جوانی کا زمانہ عظیم آباد اور بہار کے دیگر جگہوں پر گذرا۔ اس اعتبار سے وہ عظیم آبادی مشہور ہوئے۔ قاضی عبدالودود کا قول ''ان کا صوبہ بہار کے کسی دوسرے مقام میں پیدا ہونا بھی متیقن نہیں۔'' خود ان کی تحقیق کے مطابق غلط ہے۔ چونکہ بیدلؔ کی پیدائش بہار میں ہوئی۔ اور انہوں نے ریختہ میں شاعری کی ہے۔ جس کی شہادت غالبؔ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیدلؔ کے اشعار ریختہ میں موجود تھے۔ ان کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس طرح یہ اشعار ضائع ہو گئے۔ چونکہ اس زمانہ میں فارسی میں شاعری ہی کو کمال کا سبب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ بیدلؔ سے ریختہ کے صرف دو اشعار ثابت ہیں، صحیح نہیں ہیں۔ چونکہ بیدلؔ نے ریختہ میں شاعری کی اور ان کے اشعار دستیاب تھے اور کچھ ابھی بھی ہیں۔ اس لئے بہار کی اردو شاعری میں اولیت کا سہرا بیدلؔ کے سر جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں۔

مرزا بیدلؔ فارسی اور اردو دونوں زبان کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ ان کا اردو کلام بہت کم دستیاب ہے۔ اردو کے وہی چند اشعار ان کی قادر الکلامی پر دلالت کرتے ہیں۔ فارسی کی طرح ان

کے اردو کلام میں زور بیان اور پاکیزگی خیال نمایاں ہے۔

مولف چمنستان شعراء اور میرؔ صاحب وغیرہ نے بیدلؔ کے صرف دو اشعار اردو کے لکھے ہیں۔ حضرت صفیر بلگرامی نے سید موسیٰ بلگرامی کی ایک بیاض کے حوالے سے اور ایک شعر کا اضافہ کیا ہے۔

نجیب اشرف ندوی نے اپنے ایک مضمون میں بیدلؔ کی طرف ایک مزید شعر منسوب کیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ آخر یہ شعر انہوں نے کہاں سے لیا۔ پروفیسر نجیب صاحب نے غالباً یہ شعر اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اس عہد میں اردو کی ابتداء ہونے کے باعث بیدلؔ کے اردو کلام میں بھی اکثر الفاظ بھاشا کے آ گئے ہیں چنانچہ ان کے الفاظ میں:

''اس عہد میں اردو کی ابتدا تھی اور اس میں اکثر الفاظ بھاشا ہی کے ہوتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت بیدلؔ گردش روزگار سے جلنے لگے تو اپنی منہ بولتی ماں کے یہاں جو ایک تیز اور حاضر جواب کبڑن تھی۔ رخصت ہو گئے تو کہا:

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس
پٹنہ نگری چھوڑ دی اب بیدلؔ چلے بیدیس (۳۵)

پروفیسر معین الدین دردائی لکھتے ہیں کہ مجھے اس شعر کا بیدلؔ کی طرف منسوب کئے جانے سے اختلاف ہے۔ قابل مضمون نگار کو اس شعر کے نقل کرنے سے قبل اس کے ماخذ کا حوالہ ضرور دینا چاہئے تھا۔(۳۶)

مرزا بیدلؔ کے اردو اشعار یہ ہیں:

شہرہ حسن سے ازبسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرہ سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا (۳۷)

مت پوچھے دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں (۳۸)

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدؔل کہاں ہے ہم (۳۹)

مولف جلوہ خضر نے اس شعر کو اس طرح لکھا ہے:

اس دل کے آستاں پر جب عشق آپکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں (۴۰)

قاضی عبدالودود کی رائے کے مطابق بہار میں اردو شاعری کا چرچا ۱۱۵۵ یا ۵۶ھ سے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسماء سعیدی تحریر کرتی ہیں:

الغرض عظیم آباد میں تقریباً ۱۱۵۵ھ یا ۱۱۵۶ھ سے اردو کی شاعرانہ فضا قائم ہوئی۔ میں نے جناب قاضی عبدالودود سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور موصوف کو ان کے اس اقتباس کی طرف توجہ دلائی۔۔۔۔۱۱۵۱ھ سے ۱۱۷۰ھ تک اور اس سے پہلے صوبہ بہار میں اردو کے مقابلے میں فارسی کا زیادہ چرچا تھا۔ موصوف نے فرمایا۔''اول خیال تھا اور کہیں لکھا بھی ہے کہ عظیم آباد میں ۱۱۷۰ھ سے اردو شاعری کا چرچا شروع ہوتا ہے مگر جب یہ بات لکھی تھی اس وقت تک تذکرہ شورشؔ پورے طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۰ھ سے پہلے تقریباً ۱۱۶۰ھ سے قبل ہی شاعری کا آغاز ہوگیا تھا۔ حزیں شاگرد مظہرؔ کے اثرات قائم ویقین وغیرہ کی شاعری اور ان کے نمونے لائے اور عموماً شاعری میں عظیم آباد کے لوگ بھی دلچسپی لینے لگے۔ مختصر یہ کہ ۱۱۷۰ھ سے جو ترقی شاعری ہوئی اسے ۱۱۶۰ھ یا اس سے قبل ہی سمجھنا چاہئے۔''(۴۱)

جبکہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری سے اردو کے شعراء میں سے مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۲۳ھ) سید عماد الدین عمادؔ پھلواروی (۱۰۶۵ھ ۔ ۱۱۲۴ھ) ملا محمد علیمؔ تحقیق (۱۰۷۰ھ ۔ ۱۱۶۳ھ) شاہ مجیب اللہ پھلواروی۔(۱۰۹۸ھ۔۱۱۹۱ھ) غلام نقشبند سجادؔ (۱۱۱۶ھ ۔ ۱۱۷۳ھ) بی بی ولیہ (م ۱۱۳۹ھ) شاہ آیت اللہ جوہریؔ (۱۱۲۶ھ ۔ ۱۲۱۰ھ) کے اشعار دستیاب ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ بہار میں اردو شاعری کی روایت ۱۱۵۵ھ کے بعد شروع ہوئی، صحیح نہیں ہے۔

تحقیقات کی روشنی میں بہار میں اردو شاعری کی روایت غیر علماء میں مرزا بیدلؔ سے شروع ہوئی، جبکہ علماء میں شاہ عماد الدین عمادؔ پھلواروی سے۔ اس طرح بہار کی اردو شاعری میں اولیت کا سہرا ان ہی دونوں کے سر جاتا ہے۔ ابھی آپ نے بیدلؔ کے سلسلہ میں تحقیقات کا مطالعہ کیا۔ شاہ عماد الدین عمادؔ پھلواروی کے سلسلہ میں تحقیقی مطالعہ باب دوم میں مذکور ہے۔

(۲)

شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی

شیخ محمد روشن نام اور جوشش تخلص تھا، یہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔ میر حسن نے جوشش کے بارے میں اپنے تذکرہ میں لکھا ہے ''شخصے می گفت کہ اودر تالیف تذکرہ مشغول است''۔ (۴۲)

اس میں میر حسن کا ہم عصر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن جس زمانہ میں اپنا تذکرہ مرتب کر رہے تھے، جوشش بھی تذکرہ لکھنے میں مصروف تھے۔

بزم سخن میں ان کے بارے میں صرف اس قدر مذکور ہے۔

شیخ محمد روشن نام، جوشش تخلص ہے، عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام عابد اور تخلص ولی تھا۔ شیخ محمد روشن جوشش باشندہ عظیم آباد فکر بلند و خاطر ارجمند داشت از عروج بہروانی نصیبش کردہ بودند۔'' (۴۳)

مذکورہ بالا عبارت میں فکر بلند و خاطر ارجمند سے جوشش کے فضل و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

نواب مصطفی خان شیفتہ ان کی شعر دانی کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''جوشش تخلص، شیخ محمد روشن از تازہ خیالان عظیم آباد ست، شعرش صاف و بیغش، فکرش دلپذیر و دلکش، شیوہ گزیدہ اش گریدہ طرز پسندیدہ اش پسندیدہ و معہد در فکر فن عروض بسیار مہارت دل خواہ داشت'' (۴۴)

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریہ میں اثر تھا　　یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

جیسا کہ دل پہ زخم ہے اس کے خدنگ کا　　گلشن میں ایک گل نہیں اس آب و رنگ کا

اس کی آنکھوں کو دیکھیں اے جوشش　　منھ تو دیکھ یوں شراب خواروں کا

جز چشم بتاں میکدہ دہر میں جوشش　　ہم نے تو کسی مست کو ہوشیار نہ پایا

کل جو اسے دیکھ کر ہو گئے ہم بے خبر　　ہنس کے وہ کہنے لگا پھر بھی ادھر دیکھنا

حیراں ہوں کس طرح وہ انساں میں جلوہ گر　　جلوہ سے اس کے طور تو جل خاک ہو گیا

دیکھئے ہم میں اور ان آنکھوں میں کیا ہوتی ہے　　لہو کے پیاسے ہیں وہ تشنۂ دیدار ہیں ہم

نہ پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں　　چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا **(۴۵)**

(۳)
بیعت قلی خاں حسرتؔ عظیم آبادی

بیعت قلی خاں نام، حسرتؔ تخلص، فغاںؔ اور آرزوؔ وغیرہ کے ہم عصر بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ مئولف گلشن ہند نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

(حسرتؔ) بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے۔ بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ **(۴۶)**

مئولف گلشن بیخار نے بجائے بیعت قلی خاں کے ہیبت قلی خاں لکھا ہے۔ اور ان کو مرزا مظہرؔ کا شاگرد بتاتے ہیں، لکھتے ہیں:

حسرتؔ تخلص، ہیبت قلی خاں نام۔ از اہل عظیم آباد ست۔ کسب سخن از مرزا مظہرؔ کردہ۔ **(۴۷)**

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

رات کا سچ ہوا خواب میرا　　مل گیا صبح آفتاب میرا

زلف و رخ یار دیکھتا ہوں　　لیل اور نہار دیکھتا ہوں

سُنا ہے آج میخانہ میں جام مئے پہ مستوں نے
لٹایا دین و دنیا دونوں، ہمت اس کو کہتے ہیں

ترا غرور میرے عجز کے مقابل ہے　　اُدھر بہار اِدھر ایک شیشہ دل ہے **(۴۸)**

(۴)
شیخ محمد عابد دلؔ عظیم آبادی

شیخ محمد عابد نام، دلؔ تخلص، شیخ محمد روشن جوششؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اپنے ہم عصروں میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی دونوں کے جید عالم تھے۔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مئولف خمخانہ جاوید ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دلؔ شیخ محمد عابد متوطن عظیم آباد اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر عالم تھے۔ غرضیکہ آپ سنجیدہ اطوار حمیدہ خصال اور طریقہ یکرنگی میں بے مثل سمجھے جاتے تھے۔ **(۴۹)**

نمونہ کلام حسب ذیل ہے

تیری زلفوں سے بہت دن یہی تقصیر ہوئی　　نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل

نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں　　ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

چوں آئینہ یہ ستم رسیدہ　　رہتا ہے مدام آب دیدہ

تمہارے در پر جو درباں نے آستیں پکڑی　　برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی **(۵۰)**

(۵)
مرزا محمد علی فدویؔ

مرزا محمد علی فدویؔ کی پیدائش شاہجہاں آباد میں ہوئی۔ ابتدا میں احمد شاہ کے دربار میں وقائع نگاری پر مامور تھے۔ ایام جوانی میں عظیم آباد چلے آئے اور آخری وقت تک یہیں رہے۔ گلشن بیخار میں ہے۔

’’فدویؔ تخلص، مرزا احمد علی نام مشہور بہ مرزا ہجوا زسکنائے جہان آباد بوقائع نگاری درحضور احمد شاہ مامور بود، آخرالامر بہ عظیم آباد سکونت و استصلاح از شاہ گھسیٹا عشق نمود‘‘ **(۵۱)**

فدوی شاہ گھسیٹا کے خاص شاگردوں میں تھے، نظم ریختہ میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ معاصرین کے درمیان مرزا ہجو کے نام سے مشہور تھے۔

فدوی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ان کی شاعری میں کمال کا فن پایا جاتا ہے۔گلشن ہند میں مذکور ہے۔

''نظم ریختہ میں استاد تھے، تلاش معنی میں فکر رہتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا اور علم موسیقی میں مناسبت رکھتے تھے۔'' **(۵۲)**

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گزرنا — پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گزرنا
تجھ کو ان ہی آنکھوں کی قسم تیر نگہ ہے — ٹک دل کو بچا سینہ کے تو پار گزرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا — اے اشک تو ہو قافلہ سالار گزرنا
گر خاک پہ مری کبھی اے یار گزرنا — مت بھول کے ہرگز مع اغیار گزرنا
ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر — مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گزرنا
کل یار کے کوچہ کی طرف گزرے گا فدوی — مت آج سے اس طرف کو اغیار گزرنا

(۵۳)

(۶)
شاہ مسیح الدین حسن بخاری

سید شاہ مسیح الدین نام، حسن تخلص۔مولد و مسکن بڑی بلیا۔(نزد لکھمنیاں ریلوے اسٹیشن) ضلع بیگوسرائے۔ولادت ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء سلسلہ نسب حضرت سید شاہ علاؤالدین بخاری شطاری ساکن بڑی بلیا سے ملتا ہے۔بڑے محترم خانوادے تھے۔اپنے عہد کے راسخ العقیدہ حنفی تھے۔سلسلہ رشد و ہدایت ہمیشہ جاری رکھا۔خانقاہ کے ایک اخراجات کے لئے شاہان دہلی کے جانب سے بڑی بڑی جائدادیں ان کے اجداد کو ملی ہوئی تھیں۔انہیں بھی ایسی جائدادیں حاصل تھیں۔

اردو و فارسی دونوں ہی زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے۔فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ اور اردو اشعار کا ایک گلدستہ بہ شکل مخطوطہ حضرت حسن کے خانقاہ میں اب بھی محفوظ ہے۔۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء

میں وصال فرمایا۔ مزار بڑی بلیا میں مرجع خلائق ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

قصیـــــدہ

الٰہی عشق موں مجھ کو ڈوبا دے ۔۔۔ مرے دل کو بھی لے اوس میں بہادے
جنوں کے ملک کی دے بادشاہی ۔۔۔ کہ لازم ہے ہمیں ناکج کلاہی
برنگ برق کر بیتاب یاں تک ۔۔۔ کہ دل سیماب ہوے آب یک یک
مری آنکھوں سے جاری جوے خوں کر ۔۔۔ دل وجاں موں بہارلالہ گوں کر
گداز عشق موں مجھ دل کو کر لعل ۔۔۔ پھر اوس میں دردکی اکسیر دے ڈال
دم تسلیم دے کردم رضادے ۔۔۔ بقائے خود فنائے ماسوادے
براہ عشق خوش ثابت قدم رکھ ۔۔۔ بہ تیغ درد بسمل دم بہ دم رکھ
محمد گل وگلزارش علی ہے ۔۔۔ محمد فعل کردارش علی ہے
کہ احمد گفت انا مثل مدینہ ۔۔۔ علی دروازہ اش اززورسینہ
علی واقف بہ اسرار الٰہیٰ ۔۔۔ علی محرم ہے ازمہ تابماہی
علی کو بادشاہی ملک دیں ہے ۔۔۔ علی سلطان افلاک وزمیں ہے
بھروسہ ہے مجھے اس کے کرم کا ۔۔۔ کہ وہ محرم ہے سب کے دردوغم کا
بھروسہ ہے مجھے ایک اوس کا بے شک ۔۔۔ کہ وہ حال پرساں سب کا یک یک
وطن صوری ہے بلیاپچ میرا ۔۔۔ کہ ہے واں شہ علاؤالدیں کا ڈیرا
مزارے اقدس آں شاہ عالی ۔۔۔ وہیں ہے ازکمال لا یزالی
جلال الدین حیدر کے ہیں فرزند ۔۔۔ بخاری بن بخاری سلسلہ بند
وسیلہ ہے بداں شہ کے ملن کا ۔۔۔ اوس آگے زور چلتاہے نہ من کا
علاؤالدیں کے ہیں ہم پشت ستویں ۔۔۔ علاؤالدین ''علیم الدین'' سے ہیں دسویں

(۵۴)

دورِ متوسطین

دورمتوسطین

دورمتوسطین کے شعراء کی زبان دورمتقدمین کے شعراء کی بہ نسبت کافی صاف ہے۔ نہ پرانی تراکیب کا استعمال ہے اور نہ فارسی یا بھاشا کی بھرمار۔اس دور کے شعراء کے کلام میں ایہام گوئی کی روایت نہیں ملتی ہے۔اس دور میں فارسی کے اثرات کم اور بھاشا کے اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہندی شاعری کا اثر بھی اردوشاعری میں ملتا ہے۔جس کی وجہ سے اردوشاعری کا حسن بڑھ گیا ہے۔اس دور کے شعراء کے شاعری میں خیالات کی پاکیزگی اورمضامین کی رنگارنگی ہے۔امرد پرستی،عامیانہ اور رکیک خیالات سے اردو شاعری پاک ہے۔اس دور میں اردو کی شعری روایت تیزی سے آگے کی طرف بڑھی۔عارفانہ شاعری اورنیچرل نظمیں بھی کہی گئیں۔ساتھ ہی ظرافت کی روایت بھی آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔اس دور کی شاعری میں نکھار اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ساتھ ہی کلام میں زور بیان سلاست اور پاکیزگی بھی ہے۔ جہاں تک زبان کی بات ہے۔تو اس دور میں ہندی الفاظ کے اختلاط نے اردوشاعری میں ایک نیا مزہ پیدا کردیا ہے۔اس دور کے چند نمائندہ شعراء کا تذکرہ اور نمونہ کلام پیش ہے۔

(۱)

شیخ غلام علی راسخ

شیخ غلام علی نام راسخ تخلص، ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں عظیم آباد پٹنہ کے ایک گاؤں سائیں میں پیدا ہوئے۔علامہ آزاد نے انہیں مرزا سودا کا شاگرد بتایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔بہت سنجیدہ کلام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے تو مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے۔انہوں نے پڑھا:

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　　پلک پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

مرزا نے اٹھ کر گلے لگالیا۔

مگر شاد عظیم آبادی نے انہیں میر کا شاگرد بتاتے ہیں۔اپنی تالیف نوائے وطن میں لکھتے ہیں۔

''جب شیخ راسخ سے ملنے گئے تو میر صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں کیوں ستانے آئے ہو،لیکن جب شیخ صاحب نے ٹھیکری پر یہ شعر ؎

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا　　　آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

لکھا تو میر صاحب فوراً گھر سے نکل آئے اور گلے سے لگا کر کہا کہ بھئی! مزاج مبارک، کہاں سے آئے ہو اور کیوں مجھ غریب کو سرفراز کیا؟(۵۵)

مولانا عبدالمالک آروی نے شیخ راسخ کو حضرت شاہ نورالحق طپاں کا شاگرد بتایا ہے۔(۵۶)

تحقیق کے مطابق شیخ راسخ نہ تو مرزا سودا کے شاگرد تھے اور نہ میر کے، نہ شاہ گھسیٹا کے اور نہ طپاں کے۔

شیخ راسخ مرزا سودا کے شاگرد نہیں۔مذکورہ واقعہ مرزا سودا کا نہیں بلکہ میر کا ہے جیسا کہ شاد عظیم آبادی نے نوائے وطن میں تحریر کیا ہے۔راسخ میر کے بھی شاگرد نہیں، کیونکہ واقعہ سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے میر سے ملاقات کی اور ان کو اپنا دیوان دیکھایا۔دیوان دیکھ کر میر نے فرمایا:

''بھئی تم سمجھ بوجھ کے آدمی ہو، تمہیں اصلاح کی کیا ضرورت''۔اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ راسخ صاحب دیوان شاعر تھے۔اور میر کی نظر میں اصلاح سے بے نیاز تھے۔

پروفیسر معین الدین دردائی کہتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ راسخ محمد علی فدوی کے شاگرد تھے، ابتدا سے انہوں نے اسی صاحب فضل وکمال سے اصلاح سخن لی اور یقینا راسخ صحیح طور پر فدوی ہی کے تلمیذ کہے جاسکتے ہیں۔راسخ کا

ایک غیر مطبوعہ شعر ہے، ملاحظہ ہو ؎

شاگرد ہونگے حضرت فدویؔ کے بے شمار　　راسخؔ ہوں ایک میں بھی و لے کس شمار میں　(۵۷)

راسخؔ کے کلام میں زبان و مضمون کی متانت، خیالات کی پاکیزگی اور سلاست بیان کافی ہے۔

راسخؔ کے بارے میں شادؔ عظیم آبادی تحریر کرتے ہیں:

''شیخ مرحوم کے اوصاف میں سے ایک یہی جملہ کافی ہے کہ وہ فطری شاعر اور طبعی موزون طبع تھے، خطہ بہار کو اس عزیز کے نام نامی سے افتخار اور اس کی استادی پر مباہات ہے۔'' (۵۸)

۱۳۱۱ھ میں ان کا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپ کر شائع ہوا۔

گلشن بیخار میں راسخؔ کا سال وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔

''راسخؔ تخلص غلام علی نام در سنہ یک ہزار و دو صد و چہل فوت شد'' (۵۹)

لیکن گلشن بیخار کے علاوہ تمام تذکروں میں راسخؔ کا سال وفات ۱۲۳۸ھ درج ہے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

زہے جاں آفریں جس نے جہان جاں کیا پیدا　　کف خاک سیہ سے گوہر انساں کیا پیدا

برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے　　کچھ کہا اس نے نہ لیکن اک تبسم سا کیا

ٹپکے پڑتے ہیں آنسو راسخؔ　　دل ہے کتنا گداز تیرا

لاگ اس پلک کی اتنی معلوم ہے کہ آہ　　کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

موندی جاتی ہیں یاں آنکھیں رخ زیبا دکھاؤ اب　　یہ صورت ہے ہماری اپنی صورت مت چھپاؤ اب

(۶۰)

کہاں کی لیلی اور مجنوں یہ اسمائے فرضی ہیں　　مسمی اور ہی شئے تھا نہ لیلی تھی نہ مجنوں تھا

کفر بھی یک شان جلوہ بھی اسی دلبر کی ہے　　شیخ کیوں تو برہمن سے برسر پیکار تھا

(۶۱)

نازاں ہوں اپنے قلب شکستہ کی شان پر ہے عرش کو حسد اسے ٹوٹے مکان پر
اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر
یکبار دل ہوائے دو عالم سے اٹھ گیا بیٹھے ہیں آن کر جو تیرے آستان پر
شاید کبھو خیال میں جاناں کے گذریں ہم وابستہ زیست اپنی ہے اب اس گمان پر
جی میں ہنوز پھرتے ہیں یاران رفتہ آہ چشم و دل اپنے باز ہیں اس کاروان پر
کیا ناقصان کار محبت کا تجربہ آئی نہ طبع یار میرے امتحان پر
راسخ یہ کیا ہے عشق کو بدنام مت کرو عاشق ہو اور مرتے ہو نام و نشان پر
(۶۲)

(۲)
غلام حسین شورش

غلام حسین نام، شورش تخلص۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ شورش میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ ان کی شہرت شاعری زیادہ تذکرہ نگاری کی وجہ سے ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

"تذکرہ کا صرف ایک قلمی نسخہ ابتک دستیاب ہوسکا ہے۔ یہ بورڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے۔ اب پٹنہ یونیورسیٹی نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی منگوائی ہے۔ جو میری نظر سے بھی گذری ہے۔ پرنسپل کلیم الدین احمد صاحب کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے یہ خزانہ انگلستان سے ہندوستان آیا۔ آرٹ فیکلٹی کے ڈین کے حیثیت سے آپ نے بہت سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ ان میں یہ بھی ایک اہم کام ہوا ہے۔ مذکورہ قلمی نسخہ سے اشپرنگر نے اپنی فہرست اردو خانہ شاہان مرتب کرنے میں مدد لی تھی۔"

اختر اورینوی مزید تحریر کرتے ہیں:

ان کے پیدائش کا علم نہیں۔ بلخی سال وفات ۱۱۹۵ھ لکھتے ہیں۔ اور قاضی عبدالودود صاحب ۱۱۹۳ھ بتاتے ہیں۔ مگر آخر الذکر مشتبہ ہے۔ شورش کا دیوان ریختہ میں مرتب تھا۔ مگر وہ ہنوز ملا نہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام
(تذکرہ گلشن بیخار)

کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام ۔۔۔ قسم مغاں کی ہے ساقی کے مجھ کو نام سے کام
ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار ۔۔۔ نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام سے کام
(شعر الہند)

ہم جو روتے ہیں لوگ ہنستے ہیں ۔۔۔ ہنستے ہی گھر سنا ہے بستے ہیں
روبرو جانے کی رخصت نہیں دیتے درباں ۔۔۔ حال دل میں پس دیوار سنا آتا ہوں
(تاریخ شعرائے بہار) **(۶۳)**

(۳)
شیخ غلام یحیٰ حضورؔ عظیم آبادی

غلام یحیٰ نام، حضورؔ تخلص، عظیم آباد کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔شاہ محمد مظہر کے صاحبزادے تھے۔تاریخ وفات ۸ رجمادی الثانی بروز جمعہ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ ہے۔آپ نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔شاہ ارزاں کی توصیف میں ایک مثنوی تقریباً ۱۱۹۰ھ میں لکھی۔علی ابراہیم خان نے اپنے تذکرہ گلزار ابراھیم میں ان کو اپنے دوستوں میں شمار کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے۔تحریر کرتے ہیں:

’’(حضور) از احباب مولف حقیر ست، جوانے ست آرمیدہ اطوار‘‘

ان کے چند اشعار پیش ہیں ؎

گر ایسی ادا تو دکھاتا رہے گا ۔۔۔ تو کب تک کوئی جی بچاتا رہے گا
جو اس تند خو سے کہا میں کہاں تک ۔۔۔ فضول اپنے دل کو کڑھاتا رہے گا
گر ایسا ہر دم تیرا روٹھنا ہے ۔۔۔ تو کب تک تجھے کوئی مناتا رہے گا
لگا ہنس کے کہنے کیا بولتا ہے ۔۔۔ بگاڑونگا میں تو بناتا رہے گا
(۶۴)

جو یوں آپ بیرون در جائیں گے ۔۔۔ خدا جانے کس کس کے گھر جائیں گے
مسافر ہیں لیکن نہیں جانتے ۔۔۔ کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے
تمنا میں بوسہ کے کہتا ہے جی ۔۔۔ بدن سے نکل بھی اگر جائیں گے

تو ہے ایک دم اور ہزاروں امید　　لبوں پر کوئی دم ٹھہر جائیں گے
یہ حرمت نبھی اب تلک جس طرح　　حضور اتنے دن بھی گزر جائیں گے

مزید ملاحظہ ہو۔

منعم نہ ہو مغرور سدا پاس کسو کے　　سیم وزروگوہر نہ رہا ہے نہ رہے گا
گر عیش میسر ہو تو کر لیجئے کم وبیش　　سب وقت برابر نہ رہا ہے نہ رہے گا

(۶۵)

(۴)

شاہ الفت حسین فریادؔ

شاہ الفت حسین نام اور فریاد تخلص تھا، عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ میں پیدا ہوئے۔ڈیڑھ سال کی عمر میں ان کے والدین ان کو پٹنہ سے موضع پر بیگھہ ضلع گیا لے گئے۔ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ سے حاصل کی۔پھر مولوی فرزند علی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر انہوں نے مولوی احمدی صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ یہ بڑے عالم تھے۔انہوں نے حضرت فریادؔ کی تربیت کی اور کامل بن گئے۔۱۷ سال کی عمر سے شاعری کرنے لگے۔ماموں نے ان کی تربیت کی۔ان کے دونوں ماموں حضرت اشکی اور حضرت جمال خواجہ میر درد دہلوی کے فیض یافتہ تھے۔

۱۸۳۸ء میں مرشد آباد کا سفر کیا۔پھر وہاں ۱۸۴۲ء میں کلکتہ گئے۔وہاں سرکاری کاموں کو نہایت ہی حسن خوبی سے انجام دیا۔مسلم عمائدین شہر اور اعلیٰ عہدداران آپ کے خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے کلام سے فیض یاب ہوتے ۔۱۸۷۴ء میں کلکتہ سے عظیم آباد واپس آ گئے ۔چندروز مولوی سید ہادی علی خاں کے مکان میں مقیم رہے۔نواب بہادر،نواب ولایت علی خاں مرحوم کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مکان میں رہیں۔اس لئے انہوں نے قیام کے لئے ایک مستقل مکان دے دیا۔ (۶۶)

حضرت شادؔ ان سے اصلاح سخن لیتے تھے۔آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں طبع ہو چکی ہیں ۔
مثنوی دبستان اخلاق،مثنوی روضۃ المعانی،مثنوی گنجینۂ عشق،مثنوی طلسم جہاں۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ہر ایک کو با نشاں لیکن تجھی کو بے نشاں پایا　　مگر اس بے نشانی پر جہاں ڈھونڈا وہاں پایا

خبر کیسی ہی ہو دل نے سنی اور لب کو پہنچا دی
کسی کو بھی نہ اس ہستی میں ہم نے رازداں پایا
گئے جس جس جگہ بسنے کو خواہانِ اماں ہو کر
زمیں قدموں کے نیچے سر کے اوپر آسماں پایا

کچھ نہ پوچھو ان دنوں دل کو شکیبائی نہین
رات بھر کس کس طرح چاہا پر نیند آئی نہین
منزل مقصود پر اللہ پہنچادے مجھے
رات اندھیری راہ گم آنکھون مین بینائی نہین
اب حیا آتی ہے لاشہ پر مرے آتے ہوئے
قتل جب کرتے تھے وہ آنکھ انکی شرمائی ہوئی
دیکھ کر مکتوب میرا یون دیا اس نے جواب
کہہ دے قاصد میرے اور تیرے شناسائی نہین
مین جو گھبرایا بہت کرتا ہون بعد امید کے
حسرتین کہتی ہین آ کر اب تو تنہائی نہین
جائے گی جب جب تو سیدھی آستان پر آپ کے
یون سمجھ رکھئے کہ میری آہ ہرجائی نہین
کون الجھے بلبل آشفتہ سے حق یہ تو ہے
گل مین سب باتین بھلی ہین پر وہ رعنائی نہین

(٦٧)

خواب مین آ کر جو منھ دکھلا گئے
رات کو مجھ پر قیامت ڈھا گئے
کیا عدم کے قافلے رکھتے یہان
تھک گئے تھے کوئی دم ستا گئے
کچھ نہ سمجھے ماجرا اس بزم کا
لوگ اس مین آئے کیا اور کیا گئے
کچھ خبر لائی نسیم کوئے یار
داغ دل کے پھول جو مرجھا گئے
ایسے ویرانہ مین رہنے کون آئے
بیخودی مین ہم یہان تک آ گئے
کیا بلا برسے گی مجھ پر دیکھئے
دل پہ بادل حسرتون کے چھا گئے
روز و شب فریادؔ کی فریاد سے
لوگ ہمسایہ کے ہین گھبرا گئے

(٦٨)

فریادؔ کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔

(۵)
منشی گنگا لال دماغؔ

منشی گنگا لال نام، دماغؔ تخلص، میران پور ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے، یہ اردو اور بھاشا

کے علاوہ سنسکرت کے بھی عالم تھے۔ حضرت عرشؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ۱۲۶۸ء میں ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دیوان گلشن بیخار چھوڑا۔ خمخانہ جاوید میں ہے۔

’’دماغ منشی گنگا لال صاحب خلف کنہیا لال ذی علم، خوش وضع اور نہایت متین و خلیق آدمی تھے۔ اردو و فارسی کے علاوہ آپ کو بھاشا و سنسکرت میں بھی دستگاہ تھی، شاعری میں حضرت عرش خلف میر تقی میرؔ کے شاگرد تھے۔ (۶۹)

معین الدین دردائی تحریر کرتے ہیں:

’’ان کا دیوان گلشن بیخار نایاب ہے۔‘‘ (۷۰)

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات
انہیں دوکالوں میں رکھا ہے، آج کی رات
صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی
میری جان دور کرو دل سے غبار آج کی رات
درد دل سے جو کراہا تو وہ ہنس کر بولے
جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات
وہ شب ماہ میں آتے ہیں جو افشاں چن کر
چاندنی دوھری دکھاتی ہے بہار آج کی رات (۷۱)

(۶)
خواجہ امین الدین امینؔ

خواجہ امین الدین نام، امینؔ تخلص۔ تیرہویں صدی کے شعراء میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے، ان کے سال وفات کا صحیح پتہ نہیں۔ لیکن تذکرہ خمخانہ جاوید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۰ء میں زندہ تھے۔

خواجہ امین الدین شعر فہمی اور اشعار کہنے میں یکتائے روزگار تھے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم میں مذکور ہے:

’’(امین) در شعر فہمی و سخن رسی از نوادر روزگار رست، فکرش رار فعتے و ذہنش راا ستقامتے ست کہ کمتر در شعرائے معاصر یافتہ می شود۔‘‘ (۷۲)

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں امینؔ کو مرشد آبادی لکھا ہے۔’’ خواجہ امین الدین امینؔ تخلص

ساکن مرشد آباد ست، ذکر احوالش معلوم نیست، سلامت باشد''۔ **(۷۳)**

لیکن بہار اور اردو شاعری میں مذکور ہے''امین عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔'' البتہ کچھ دنوں کیلئے نواب ناظم مرشد آباد کے یہاں ملازم رہے تھے اور غالباً اسی وجہ سے میر حسنؔ کو ان کے مرشد آبادی ہونے کا دھوکا ہوا ہے۔نواب شیفتہؔ نے اپنے تذکرہ میں میر حسنؔ کی تردید کی ہے، لکھتے ہیں:

''(امین)از ارباب عظیم آباد ست وآنکہ نسبتش بہ مرشد آباد کردہ اندازہ او خطائے عظیم آمدہ۔''

تذکرہ میر حسنؔ کے علاوہ اور بھی جتنے تذکرے ہیں سب امین کے عظیم آبادی ہونے پر متفق ہیں۔**(۷۴)**

خواجہ صاحب کے کلام میں شوخی اور بے ساختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات داغؔ کے کلام ہونے کا دھوکا ہو جاتا ہے۔**(۷۵)**

خواجہ امین کے کلام میں شوخی اور ظرافت کے ساتھ تصوفانہ رنگ آمیزی اور زبان کی صفائی بھی کافی ہے۔ان کا کلام پیش ہے۔

یہ صورت ہے ہماری اپنی صورت مت چھپاؤ اب　　اتنے خفا ہو کس لئے اس خاکسار پر

گالیاں جو دیں سو دیں بس کیجئے　　سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا

دنیا میں کہلانے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے　　پر ہے وہی بھلا جو کسی کا بھلا کرے

کیا دین سے غافل ہیں امینؔ مردم دنیا　　سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی

ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے　　ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر

یار کی مژگاں سے لڑ جاتا ہے یوں تیر نگاہ　　جس طرح تلوار کوئی آ لگے تلوار پر

کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں　　گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا　　خاک میں لے ملا دیا ہوگا
گالیاں غیر سے سناتے ہو　　ہاں میاں تم سے اور کیا ہوگا **(۷۶)**

دورجدید

دورِ جدید

اس دور میں اردو شاعری عالمگیر ادبی اصول اپناتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کا اثر بہار کی اردو شاعری پر بھی نمایاں ہے۔ بہار کی اردو شاعری کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بہار کی اردو شاعری عالمگیر ادبی رجحانات سے اپنے آپ کو دور نہیں رکھا بلکہ اس سے پورے طور پر فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔اس دور میں بیش قیمت تجربات کئے گئے اور حسین طرز مکمل موزون بیانات کو اپنے اندر سمویا۔طرز بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بہار کی اردو شاعری میں ہندوستانیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ساتھ ہی موضوع،فضا اور زبان کے اعتبار سے مقامی رنگ ابھرنے لگا۔ یہ اس دور کی اردو شاعری میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس دور کے شعراء کی شاعری میں جذبات خیال اور پاکیزگی بیان خاص طور پر نمایاں ہیں۔ کچھ شعراء کا تذکرہ اور نمونہ کلام پیش ہے۔

(۱)
علی محمد شاد عظیم آبادی

سید علی محمد نام، تخلص شاؔد، خطاب خاں بہادر۔ ۷ جنوری ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد، پٹنہ محلہ پورب دروازہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید عباس مرزا تھا اور ان کا شمار عظیم آباد کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ ایک محقق اور مایہ ناز ادیب کی حیثیت سے وہ ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں۔

شاؔد کے سلسلے میں معین الدین دردائی تحریر کرتے ہیں۔

''شاد تخیل اور زبان کا بادشاہ ہے، کلام میں شاعرانہ تخیل، عالمانہ رنگ اور عارفانہ اسرار و رموز کی فراوانی ہے۔ واقعہ نگاری ان کا خاص جوہر ہے۔ شاد کی شاعری عامیانہ مذاق اور سوقیانہ ترکیبوں سے بالکل مبرا ہے۔ کہیں کہیں شوخی اور ظرافت البتہ پائی جاتی ہے۔ لیکن شگفتہ شوخی سے آگے نہیں بڑھتی۔'' (۷۷)

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

شاد عظیم آبادی اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ بحیثیت غزل گو ان کا شمار اردو کے چند منتخب غزل گویوں میں ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اردو غزل میں میرؔ اور غالبؔ کے ساتھ تثلیث بناتے ہیں۔ واضح ہو کہ ان کی رائے اس وقت آئی جب وہ کلام شاد کو اردو اکادمی، بہار کیلئے مرتب کر رہے تھے۔ لیکن یہ المیہ ہے کہ موصوف کی تصنیف ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں شاؔد کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں جن پر فی الحال میں روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ لیکن شاید ہی اس امر سے کسی کو انکار ہو کہ شاد عظیم آبادی اپنے وقت میں بھی اہم تھے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان کی اہمیت بحیثیت غزل گو بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں ان کی طرف راجع ہونے والوں میں حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی، یہاں تک کہ اقبال بھی تھے۔ یہ سب کے سب شاؔد کی قدر و منزلت سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ بعض شعری معاملات میں ان سے رجوع بھی کرتے رہے تھے۔ جس کی تفصیل شاد کے مطبوعہ خطوط میں موجود ہے اور جس پر راقم الحروف کی تنقیدی کتاب ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'' میں بھی درج ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ شاد عظیم آبادی اردو غزل کے آبرو رہے ہیں اور عظیم آباد کا دبستان (اگر واقعی اسے دبستان تسلیم

کر لیا جائے اور کرنا چاہئے) تو اس کے سب سے بلند قامت شاعر شادؔ ہی رہے ہیں، اپنے وقت میں بھی اور آج بھی۔ (۷۸)

شادؔ کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں ۔

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے دعائیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

اپنے گدا کو خود وہ پکارے، اٹھ مرے کالی کملی والے
اٹھ میرے عاشق اٹھ مرے پیارے، اٹھ مرے کالی کملی والے
چاند کی رنگت زرد ہے پیارے، صبح کے دیکھ آثار ہیں سارے
ڈوب چلے دم بھر میں ستارے، اٹھ مرے کالی کملی والے
دل کو ہے میرے تجھ سے محبت، دے نہ زیادہ جان کو کلفت
بیٹھ نہ ہر دم آسن مارے، اٹھ مرے کالی کملی والے
رو کے ہمارا نام جو لے گا، نالہ شب سے کام جو لے گا
ٹوٹ پڑیں گے عرش کے تارے، اٹھ مرے کالی کملی والے

یہ بزم مئے ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکرر باصفا جس کا کہ یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی میخار ہے پینا اسی کا ہے

میں حسرت وغم کا مرا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آج کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مرغان قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہو اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم (۷۹)

کالی کالی آنکھیں ہیں اور گوری گوری رنگت ہے
لمبے لمبے گیسوں ہیں اور بھولی بھولی صورت ہے
آڑی آڑی چتون ہے اور ٹیڑھے ٹیڑھے ابرو ہیں
نیچی نیچی نظریں ہیں اور کچھ کچھ دل میں الفت ہے
حسن کی خوبی جو کچھ کہئے عیب چھپاتا ہے ورنہ
جھوٹے جھوٹے وعدوں میں کچھ ایسی ایسی ذلت ہے
بھر بھر آئیں دل نہ بھلا کس طرح سے شادؔ ان شعروں پر
سچی سچی باتیں ہیں اور پوری پوری حالت ہے

شب کو میری چشم حسرت کا سب درد دکھ ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا
میخانہ میں آنا زاہد کا پھر در پہ ٹھٹھک کر رہ جانا
ساقی کے اشارہ کا رندو! کچھ کان میں سب کے کہہ جانا
ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہئے
منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا (۸۰)

شادؔ کا انتقال ۸ر جنوری ۱۹۲۷ء میں ہوا۔

(۲)

شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ

امداد امام نام، اثرؔ تخلص۔ شمس العلماء خطاب۔ نواب امداد امام اثرؔ صوبہ بہار کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷/اگست ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ موضع نیورہ ضلع پٹنہ میں گزارا۔ نیورہ کو اسی خاندان کی وجہ سے خاص امتیاز حاصل ہے۔

اثرؔ کو ریاضی، معدنیات، حیوانات، مناظرہ، فلسفہ جدید و قدیم میں بڑا شغف تھا، اردو اور فارسی میں بڑی مہارت اور انگریزی زبان پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف کتاب الاثمار اور کاشف الحقائق کافی مشہور ہیں۔

اثرؔ نہ صرف اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، بلکہ اکثر آپ نے انگریزی اشعار بھی نظم کئے ہیں۔ آپ کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے۔

کلام کا نمونہ درج ذیل ہے؎

ظالم وہ کون دل ہے جس میں نہیں بھری ہے — تیرے ستم کی حسرت تیری جفا کی خواہش
اے شیخ و برہمن تم کچھ تو ہمیں بتاؤ — کیا ہے بتوں کی خواہش کیا ہے خدا کی خواہش
دنیا طلب کا شیوہ ہاتھوں کا ہے اٹھانا — دل میں خدا کو رکھ کر کیا ہو دعا کی خواہش
ہم نے اثرؔ سنا ہے اہل رضا کو کہتے — اپنی وہی ہے خواہش جو ہے خدا کی خواہش

مظلوم ہوں مگر نہیں ملتا کوئی گواہ — ہیں اہل حشر اس ستم ایجاد کی طرف
ناصح اگر ستم نہ سہیں ہم تو کیا کریں — دل دوڑتا ہے یار کی بیداد کی طرف

نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا — محبت میں تیرے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
ہمیں بزم عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے — کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

رات واعظ جو شریک صحبت رندانہ تھا — کچھ بیانِ حور اس کا بے طرح مستانہ تھا

(۳)
فضل حق آزادؔ

فضل حق نام، آزادؔ تخلص۔ ضلع جہان آباد کے قریب ایک گاؤں شاہو بیگہہ میں ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی اور فارسی قاری محمد جان سے پڑھی جو لکھنؤ سے دعوت دے کر بلائے گئے تھے۔ انہیں کی نگرانی میں انہوں نے حفظ قرآن اور تکمیل قرأت بھی کی۔

صرف ونحو، منطق وحکمت کی تعلیم گھر پر ہوئی اور کچھ پٹنہ میں۔

آزادؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ڈاکٹر روحی حسن مجید تحریر کرتی ہیں:

جدید وقدیم اصناف سخن میں شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو جس میں آزادؔ نے طبع آزمائی کر کے اپنی مشاقی اور قادرالکلام کا اظہار نہ کیا ہو۔ ان کی غزلوں میں بیک وقت سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ اور امیرؔ کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اور نظمیں اپنی جگہ اردو نظم نگاری کی مکمل تاریخ ہیں۔ مرثیہ نگاری میں وہ ہمدوش، انیس ودبیر ہیں۔ اور بیانیہ نظموں میں ہم لہجہ نظیرؔ۔ وہ قومی شاعری میں حالیؔ اور فکری شاعری میں اقبالؔ کے مقابل ہیں۔ (۸۲)

صوبہ بہار کا یہ ہمہ داں شاعر عہد جدید کا بڑا شاعر گذرا ہے۔ اس نے اردو شاعری کی ایک نئی راہ نکالی، جس پر بہار کے ترقی پسند شعراء آج کل گامزن ہیں۔ آپ کی شاعری کے متعلق مولف خمخانہ جاوید تحریر کرتے ہیں:

''معمولی فرسودہ خیالات سے آپ کی جدت پسند طبیعت متنفر ہے۔ آپ کی نظم میں اچھوتے نیچرل خیالات اکثر پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ کی کوئی نظم لطف سے خالی نہیں پائی، بلکہ جدت خیال اور سلاست بیان اس پر مستزاد ہے۔'' (۸۳)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؂

حور پردہ میں ہے چوتھی کی دلہن چلمن میں   مئے گل رنگ ہے یا لال پری شیشے میں

نگہ ناز کوئی چشم فسوں ساز میں ہے
یا بھری ہے یہ مئے بے خبری شیشے میں

جا چکی گلشن سے جب فصل بہار　　آہ کب رخصت ملی پرواز کی
جام سے مئے سرشار ساقی مہرباں　　لب تک آجائیں نہ باتیں راز کی
رنگ میں آزادؔ یہ اردو غزل　　ہے بھری بوتل مئے شیراز کی

لالہ کو کہا نصیب وہ داغ　　جو دل کو دئے ہیں آرزو نے
خنجر ہوا سر خرو لہو سے　　لالی رکھ لی رگ گلو نے

(۸۴)

(۴)
عبدالرحمن بسملؔ سنسہاروی

عبدالرحمن نام، بسملؔ تخلص۔ والد کا نام کلیم قربان علی تھا۔ قصبہ سنسہارا ضلع گیا میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ زیادہ تر شیر گھاٹی میں رہے۔ پھر گیا منتقل ہو گئے۔ تعلیم وتربیت مشرقی انداز سے ہوئی۔ اردو اور فارسی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ غزل گوئی اور نظم نگاری سے وابستہ رہے۔ عشرتؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ اور اپنے وقت میں خود معتبر استاد ہو گئے۔

موصوف نے اپنا پریس قائم کیا، جو شمس پریس کے نام سے مشہور ہوا۔ انہوں نے ایک رسالہ ''سہیل'' جاری کیا۔ یہ ایک ادبی رسالہ سمجھا جاتا رہا۔ جس نے کئی خصوصی نمبر نکالے۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

بسملؔ کلاسیکی رنگ کے شاعر ہیں۔ انداز روایتی ہے۔ لفظوں سے کھیلنے کا ایک خاص انداز ملتا ہے۔ استعارے اور تشبیہیں بھی اساتذہ کے رنگ کی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نظموں میں ایک الگ انداز ملتا ہے۔ جس میں عصری زندگی کے احوال بھی پائے جاتے ہیں۔ بسملؔ کے قطعات اور رباعیاں اپنے وقت میں کافی ممتاز سمجھی جاتی تھیں۔ قطعات ہی کا ایک مجموعہ جواہر بارے ہے۔ تاریخ گوئی کے سلسلہ کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

موصوف کی ایک نظم ''گذشتہ بہار'' کے صرف چار اولین بند نقل کرتا ہوں ے

اے مقدس سرزمیں اے خطہ پاک بہار　　سنتے ہیں تو تھا کبھی عالم میں باغ پرُ بہار
ہیچ تھے آگے ترے سب ہند کے شہرو دیار　　تیرے باشندے کبھی کرتے تھے تجھ پر افتخار
ذرہ ذرہ تھا ترا غیرت زدہ شمس وقمر
چپہ چپہ تھا ترا گہوارۂ علم و ہنر
تیرے بقعہ سے شعاعِ علم ہوتی تھی عیاں　　جگمگا اٹھتا تھا جس کے نور سے ہندوستاں
تھیں کبھی مشہور عالم تری مردم خیزیاں　　تجھ میں پیدا ہوتے تھے اکثر مشاہیر زباں
دھاک تھی عالم میں تیری عقل وحکمت کی بندھی
کہتے ہیں سب تھا کبھی تو ناک ہندوستان کی
تھے کبھی آباد تجھ میں کاملان علم وفن　　عالم وفاضل محدث شاعر شیریں سخن
فلسفہ اور منطق وحکمت کے مشاق کہن　　کوئی جالینوس وقت اور کوئی بقراط زمن
صوفیان باصفا کا تھا کبھی جائے قیام
کیسے کیسے تجھ پہ گزرے اولیائے ذی الکرام
شیخ شرف الدینؒ، پیر بدر عالم، چرم پوش　　بادشاہان جہاں بھی جن کے تھے حلقہ بگوش
توشئہ توحید وحدت کی دکاں کے مئے فروش　　جن کی بزم معرفت میں تھے ہزاروں جرعہ نوش
ماسوا ان کے بھی تھے اور اولیائے مستطاب
جن کے فیض باطنی سے اک جہاں تھا فیضیاب

موصوف کی وفات ۹؍جون ۱۹۶۶ء کو ہوئی۔ ان کا مدفن کربلا گورغریباں (گیا) میں ہے۔

(۸۵)

(۵)
ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیمؔ

عظیم الدین احمد نام، عظیمؔ تخلص۔ ان کی پیدائش گیا ضلع کے ایک قصبہ قاضی سرائے امتھوا میں ۲۵؍جون ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔

ڈاکٹر اقبال حسین لکھتے ہیں:

''والد کے جانب سے آپ کا تعلق سہسرام کے ایک سجادہ نشیں خانوادے سے تھا۔اس خاندان کی دربار مغلیہ میں بڑی عزت تھی۔والدہ کی طرف سے آپ کا تعلق پٹنہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں نہایت ہی ذی علم اور باوقار شخصیتوں کی پرورش کی۔آپ کے نانا حکیم عبدالحمید پریشاں شہر کے ممتاز طبیب،ادیب اور شاعر تھے۔ڈاکٹر صاحب صرف سات ماہ کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیااور ان کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری حکیم صاحب پر عاید ہوئی۔ابتدا میں عربی،فارسی اور طب یونانی کی تعلیم اپنے نانا جان سے حاصل کی۔اس کے بعد محمڈن اینگلو عربک اسکول،پٹنہ سیٹی میں داخل ہوئے۔جب اسکول کی تعلیم ختم ہوگئی تو پٹنہ کالج میں داخل ہوئے اور سائنس کے طالب علم ہوگئے۔اس زمانہ میں خان بہادر خدابخش خاں سی۔آئی۔اے نے اپنی لائبریری سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔جب انہوں نے ان کے اندر صلاحیتیں دیکھیں تو مشہور مستشرق ڈاکٹر ایڈ ورڈ ڈینی سن روس سے جو بعد میں سر ہوئے ان کا تعارف کرایا،سر ایڈ ورڈ روس نے ان کے استعداد کے پیش نظر اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ میں عربی کے طبی مخطوطات کی کیٹلاگ تیار کرنے کی خدمت انہیں سپرد کی۔آپ نے اس کام کو نہایت ہی حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔یہی وہ پہلا تحقیقی کام تھا جو ان کی شہرت کا سبب بنا۔چانچہ پروفیسر ای جی براؤن نے جو خطبات فزپٹرک لکچرس کے نام سے انگلستان کے دانش کدۂ اطبا میں دئے تھے ان میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ اس کیٹلاگ کے سلسلہ میں تعریفی کلمات کے ساتھ کیا تھا۔ان توسیعی خطبات کی اشاعت کیمبرج یونیورسٹی نے نہایت ہی آب وتاب کے ساتھ کی تھی۔ڈاکٹر ایڈورڈ ڈینی سن روس نے ان کی ٹھوس علمی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے حکومت ہند سے وظیفہ دلوایا۔''

(٨٦)

آپ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔پٹنہ یونیورسیٹی میں آپ شعبہ فارسی اور اردو کے صدر تھے۔آپ کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

خوشی سے مجھ کو کیا حاصل کہ لذت یاب حسرت ہوں
طرب کی مجھ کو کیا پروا کہ میں محروم عشرت ہوں

میں اک تصویر ہوں گویا زبان بے زبانی کی
نہ میں منت کش نالہ نہ مرہون سماعت ہوں
نہ میں گنجینہ قاروں نہ میں جم کا دفینہ ہوں
نہ ہو جس کو فنا ایسا خزانہ ایسی دولت ہوں
میں ہوں وہ مست جس کا ایک جرعہ زم زم کوثر
میں اس تکوین کے خمخانے میں صہبائے وحدت ہوں
مجھے ظاہر کی کیا پروا میں ہوں مست مئے باطن
صنم خانے میں اور میخانے میں محو عبادت ہوں
علو کے رازاسرار تنزل مجھ میں پنہاں ہیں
میں اپنی آپ عزت ہوں میں اپنی آپ ذلت ہوں
میں گواک فرد ہوں پر نوع ہوں اور سارا عالم ہوں
میں خود دیر و حرم ہوں میں ہی دوزخ اور جنت ہوں
میں وہ ہوں جو ہو سب کے ساتھ پھر سب سے الگ ٹھیرے
مجاز عالم ہستی ہوں اور اس کی حقیقت ہوں
حقیقت کے کرشموں سے جو دل مجبور ہوتا ہے
تو پھر کہہ کر ''اناالحق'' دار پر منصور ہوتا ہو ں **(٨٧)**

(٦)
ضمیرالدین احمد عرش گیاوی

سید ضمیرالدین احمد نام، عرش تخلص۔ والد کا نام سید بندہ علی۔ موضع شکراواں، ضلع پٹنہ میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد وکیل اور رئیس وزمیندار تھے۔ گیا میں رہتے تھے۔ ابتدا میں عرش وہیں رہنے لگے۔ والد کا سایا سر سے اٹھ گیا۔ لیکن تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ مولوی عبدالکریم خالپوشی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر محمد اسحق گیاوی سے عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ اردو

اسکول گیا سے میٹرک پاس کیا۔اس کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

''عرشؔ نے ابتدا میں غزل کہنی شرع کی۔ان کے ماموں گیا میں قیام پذیر تھے۔غازی پور کے مولانا شمشاد لکھنوی کے کلام سے عرشؔ متاثر ہوئے۔اوران کی شاگردی بھی اختیار کی۔پھر تسلیمؔ لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ناسخؔ کا رنگ بھی انہیں بھایا۔لہٰذا ان دونوں کے اثرات کا ادغام ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔بعد میں ان کے کلام کا رخ بدل گیا۔تب ان کے کلام میں سوز وگداز کی ایک خاص کیفیت ابھر گئی۔اور ناسخؔ سے الگ ہوکر میرؔ کے میلان کی طرف مائل ہو گئے۔اور مضمون آفرینی بھی میرؔ جیسی کرنے لگے۔'' (۸۸)

غزل ملاحظہ ہو ؎

پھر ہوا پیدا خیال لذت سودائے عشق — بخش دی زلفوں نے اس کی پھر پریشانی مجھے
آسماں بھی فرقت جاناں میں پیچھے رہ گیا — لے چلی آگے کہاں اشکوں کی طغیانی مجھے
کہتے ہیں دکھلا کے میرا شیشۂ دل غیر کو — ہے یہی وہ آئینہ جس پر ہے حیرانی مجھے
چپ ہوں غنچے کی طرح گویا ہوں نکتہ کی طرح — میری خاموشی نے بخشی ہے سخندانی مجھے
جذبۂ دل قیس سے دو ہاتھ آگے لے چلا — اب کہاں پائے گی تو گرد بیابانی مجھے
نوحۂ دل عشق میں اے عرشؔ پڑھ مومن کی طرح — ہے بہت محبوب تیری مرثیہ خوانی مجھے

عرشؔ گیاوی کی وفات ۱۳ ر جولائی ۱۹۳۶ء کو گیا میں ہوئی۔ (۸۹)

(۷)

سید کاظم علی جمیلؔ مظہری

سید کاظم علی مظہری نام ،جمیلؔ تخلص ۔خلف مولوی خورشید حسین۔ولادت نانیہال مغلپورہ عظیم آباد ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مولوی امداد امام سے حاصل کی۔پھر مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی میں داخلہ ہوا۔۱۹۱۵ء میں موتیہاری ضلع اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد ان کی ادبی وصحافتی زندگی کلکتہ کی فضا میں سانس لینے

لگی۔ حضرت وحشت کلکتوی سے ان کو تلمذ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پٹنہ میں پبلیسیٹی آفیسر بنے۔ لیکن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر استعفا دیدیا، اور جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی پا کر جوش ملیح آبادی کی وساطت سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں محکمہ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پٹنہ کالج میں شعبہ اردو میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ جمیل مظہری نہایت بلند پایہ شاعر تھے، وہ غزلیں بھی کہتے تھے اور قصیدے بھی۔ مرثیے بھی اور رباعیاں بھی۔ غرض وہ ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی ذہنیت فلسفیانہ اور رجحان طبیعت مفکرانہ تھیں۔ ان کے طرز بیان و اسلوب نگارش میں قوت و شوکت ہے۔ الفاظ میں شیرینی و دل آویزی، شادابی، شگفتگی اور گھلاوٹ ہے۔۔ جمیل کی نظموں کا مجموعہ ''نقش جمیل'' منظر عام پر آ کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے، وہ صرف اعلی درجہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ بلند مرتبت ادیب بھی تھے۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

بہر طور، میں جمیل مظہری کو اچھا شاعر مانتا ہوں اور بڑا شاعر بھی۔ اس لئے کہ وہ خالق ہیں نقال نہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادیت ہے۔ ان کے رنگ و روپ اپنے ہیں۔ یہ بھیڑ میں گم نہیں ہوتی۔ یہ خزانے کا چرایا ہوا پرانا سکہ نہیں۔ یہ روایت کے سلسلے میں ضم ہو کر اپنی قدر و قیمت کھوتی نہیں ہیں، بلکہ اس کے حدود کی توسیع کرتی ہے۔ جمیل مظہری کا تخلیقی عمل ان کا ذاتی عمل ہے۔ اس میں ان کی اپنی فکر، اپنے احساسات نمایاں ہیں۔ (۹۰)

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

جنگل کی خامشی میں چھوٹی سی ایک دنیا ہو — تو ہو تیری عذرا ہو میں ہوں میری رادھا ہو
محفل میں جب دو نظریں چپکے چپکے ملتی ہوں — کوئی سہمی جاتی ہو، کوئی جھینپا جاتا ہو
موجیں ماتم کرتی ہیں اس کشتی کی قسمت پر — جس کے تختے ٹوٹے ہوں جس کا مانجھی سویا ہو
درد جمیل اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے — شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بیتی گاتا ہو

تلاش کرنے سے دنیا میں کیا نہیں ملتا — مگر وہ درد جو ہو لا دوا نہیں ملتا
میں اس خدائے تمنا سے کیا سوال کروں — خود اپنے ذوق کا مجھ سے پتا نہیں ملتا

نہ مئے گراں ہے نہ ساقی کی چشم لطف بخیل مگر کسی کا پیالہ بھرا نہیں ملتا
جمیلؔ کیلئے بے چین ہے نظران کی پھر آج بزم میں وہ بے وفا نہیں ملتا
اسے تتبع وحشتؔ کا حق نہیں ہے جمیلؔ جسے کہ درد جگر میں مزا نہیں ملتا

(۹۱)

نظم۔۔۔''ڈرو خدا سے ڈرو'' کے چند بند پیش ہیں ؎

سنو جمیل سنو! تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اسے جنوں نہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو مجھے نہ یاد کرو
یہ تم جو مجھ کو تصور میں پیار کرتے ہو
جو نام لے کے مرا آہ سرد بھرتے ہو
تمہیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ کر گزرتے ہو
نہ جذب دل کو بڑھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جھکائے سرکو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو **(۹۲)**

۲۳ ر جولائی ۱۹۸۰ء کو مظفر پور میں ان کا انتقال ہوا۔ اور یہیں دفن بھی ہوئے۔

(۸)

پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ

عبدالمنان نام، بیدلؔ تخلص۔ ڈیواں ضلع پٹنہ وطن تھا۔ یکم جولائی ۱۸۸۴ء میں آرہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنہ آ گئے۔ اور پٹنہ کالجیٹ کے تعلیم ہوئے۔ بی۔ اے پٹنہ کالج سے پاس کیا۔ اس کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں کلکتہ یونیورسیٹی

سے۔ایم۔اے کیا۔تعلیم کے اختتام کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انگریزی کے استاد ہو گئے۔بعد میں ان کی خدمات بہار میں منتقل کردی گئیں۔۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں فارسی اور اردو کے لکچرر ہوئے۔

شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ان کا مجموعہ کلام ''کلام بیدلؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بیدلؔ روایت پسند شاعر رہے ہیں۔لیکن زبان وبیان پر قدرت کے سبب ان کے کلام میں ایک طرح کی فنی مہارت پائی جاتی ہے۔جذبات اور احساسات میں کوئی ایسا اندازہ نہیں جو انہیں بطور خاص دوسروں سے ممیز کرسکے۔ہاں ان کے نظموں کا انداز قدرے الگ ہے۔ (۹۳)

صوبہ بہار کے ایک اچھے شاعر تھے۔کلام میں رنگینی پائی جاتی ہے۔زبان صاف اور سلیس ہے۔فارسی ادب پر بھی آپ کو قدرت حاصل تھی۔نظم کے علاوہ آپ اردو ادب کے ایک بلند پایہ نثر نویس بھی تھے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جھکی کس آستانے کی زمیں پر — نشاں خنجر کا ہے اپنی جبیں پر
لبوں پر آگیا آخر تبسم — نہ زور ان کا چلا چین جبیں پر
وہ دل جو تھا حریف شوخی ناز — ہوا قربان چشم شرمگیں پر
یہ الزام مصیبت تیرا ناصح — غلط ہے عشق راحت آفریں پر
کہا یہ کس نے میں مایوس لوٹا — غبار آستاں تو ہے جبیں پر
کیا جس وقت ضبط نالہ بیدلؔ — قیامت ہوگئی قلب حزیں پر

اس کو اب یہ خبر کریں کیونکر — زندگی ہم بسر کریں کیونکر
تم خفا پر بھی تو نہیں قائم — ہم وفا عمر بھر کریں کیونکر
پاؤں رکھتا ہے غیر بھی اس پر — سجدہ سنگ در کریں کیونکر
ہم نہیں بولتے ہیں ناصح سے — بات کو بے اثر کریں کیونکر
کہیں شرما کے وہ نہ پھر جائیں — ہم نظر سوئے در کریں کیونکر
تیرے شکوے بجا سہی بیدلؔ — لیکن اس کو خبر کریں کیونکر

پروفیسر عبدالمنان بیدل کی وفات ۱۹/اپریل ۱۹۸۲ء میں ہوئی۔(۹۴)

(۹)
سید کاظم حسین زار عظیم آبادی

سید کاظم حسین نام، زار تخلص ۔ والد کا نام سید جعفر حسین تھا۔ ۱۸۹۶ء میں عظیم آباد پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے ۔ ۹/ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے پرورش کی ۔ زار نے مدرسہ میں تعلیم پائی ۔ عروض و بلاغت اور فارسی کی تعلیم موج عظیم آبادی سے حاصل کی ۔

زار بنیادی طور پر کلاسیکی شاعر رہے ہیں ۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ اساتذہ کے رنگ میں ہے ۔ کلام میں پختگی کا ہر قدم پر احساس ہوتا ہے ۔

پروفیسر اعجاز علی تحریر کرتے ہیں :

اپنے مخصوص انداز بیان کے سبب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان ۳۰/ سال کے طویل عرصے تک زار عظیم آبادی ریاست اور بیرون ریاست کی ادبی وشعری محفلوں میں کافی مقبول رہے ۔ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے ۔ زار ان لوگوں میں ہیں جو روایتی موضوعات کو نئے اور دیدہ زیب اسالیب کا پیرہن عطا کرتے ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ زار کی شاعری میں نئے موضوعات عنقا ہیں ۔ یا انہوں نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں سے دانشتہ طور پر دامن بچانے کی کوشش کی ہے ۔ ویسے بھی اس قسم کی کوشش غیر فطری کہی جا سکتی ہے ۔ (۹۵)

پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ان کے کلام کو مرتب کر کے ''نشاطِ غم'' کے نام سے شائع کر دیا ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ۔ اس میں زار کی غزلوں کے علاوہ نظمیں اور مرثیہ بھی ہیں ۔

زار کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں ؎

نالے فضول، آہ عبث، جب اثر نہیں — پیغام تو ہزار ہیں پیغامبر نہیں
نادیدہ کتنے جلوے ابھی ہیں خبر نہیں — تسکین ذوق حاصل فکر و نظر نہیں
حسن کمال شاکی بخل نظر نہیں — تحصیل داد شیوۂ اہل ہنر نہیں
سودائے عشق قائل نفع وضرر نہیں — فکر مآل شوق بجز درد سر نہیں
کس کی تلاش میں ہوں مجھے خود خبر نہیں — رہ رَو ہوں اور واقف راز سفر نہیں
کیا بے نیاز ہے مری دیوانگی شوق — اک جستجو ہے اور کوئی پیش نظر نہیں
کب تک رہوں میں خوف اسیری چمن سے دور — یا آج دام ہی نہیں یا بال و پر نہیں

یہ بے خودی جذب وفا زارؔ ہوش کر وہ سامنے کھڑے ہیں تجھے کچھ خبر نہیں

زارؔ کا انتقال ۲۹ ؍جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ اور نو ڈھال، پٹنہ سیٹی میں سپرد خاک ہوئے۔ **(۹۶)**

(۱۰)
رضا علی خاں رمزؔ عظیم آبادی

رضا علی خاں نام رمزؔ تخلص۔ والد کا نام قدرت اللہ خاں۔ پٹنہ سیٹی کے محلہ سونار ٹولی میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ باضابطہ کالج، یونیورسیٹی یا کسی ادارے میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ انہیں جو کچھ حاصل ہوا، وہ ذاتی اکتسابات پر حاصل ہوا۔ ابتدا میں مختلف قسم کے کام کرتے رہے۔ مزدوری کی، رکشا چلایا۔ پھر محکمہ پی ڈبلوڈی میں ملازمت مل گئی۔ اسی سے وابستہ رہے۔ اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۴۹ء سے شاعری شروع کی۔ ان کے اساتذہ میں منظرؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ عظیم آبادی اور پرویزؔ شاہدی کے نام آتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''نغمہ سنگ'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ''شاخ زیتون'' ۱۹۹۸ء میں۔ رمزؔ عظیم آبادی غزلیں بھی کہتے رہے اور نظمیں بھی۔ ان کی شاعری زیادہ تر مختلف قسم کے استحصال کرنے پر مبنی ہے۔ لیکن شعریت ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص تیور ہے۔ یہ تیور دراصل اساتذہ کے کلام کے مطالعے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کہیں کہیں ان کی انفرادیت کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، خصوصاً غزلوں میں۔

اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

وقت مقید ہو جاتا ہے لمحوں کے زنجیروں میں فانی جسموں کی قربت سے ہوتی ہے لافانی رات

آج تک خواب سے محروم ہیں اپنی آنکھیں غم جاناں کو سلائیں غم دوراں جاگے

اس کی انا کو سکہ تحسین چاہیے خیرات دینے والا بھی کاسہ بدست ہے

ایک نظم کشمیر کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

یہ شہتوت جیسے حسینوں کی انگلی میں مہندی رچی ہے   یہ انگور جیسے سہاگن کے کانوں میں بالی پڑی ہے
یہ سیب احمریں جن میں رخسار جاناں کی رنگت چھپی ہے   یہ خوبانیاں جن کے سینوں میں ہونٹوں کی صہبا بھری ہے
غزل کے حسیں استعاروں کی دنیا یہی سرزمیں ہے
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ   (۹۷)

رمزؔ کی وفات ۱۵؍ جنوری ۱۹۹۷ء میں عظیم آباد میں ہوئی۔

(۱۱)
محمد یٰسین کیفؔ عظیم آبادی

محمد یٰسین نام، کیفؔ تخلص۔ ۸؍ جون ۱۹۳۷ء کو محلہ شاہ گنج پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالغفور تھا۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ اس لئے غم دوراں نے انہیں کم عمر میں ہی اپنے گھیرے میں لے لئے، غم روزگار سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی چھوٹی سی دکان کو مرکز بنالیا جو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پاس اور سائنس کالج کے سامنے تھی، اپنا مرکز بنالیا۔

کیفؔ عظیم آبادی اردو کے ایک مشہور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک حساس اور جذباتی انسان تھے۔ شاعری اور جذبات کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ ایک حساس دل انسان ہی شاعری کی روح سمجھ سکتا ہے۔ کیفؔ اندر ایک غمگسار اور انسانیت نواز دل تھا۔ جو ایک طرف اپنے رشتہ داروں کے درد و غم میں شریک رہتا تھا۔ تو دوسری طرف ادبی محفلوں کی آرائش اور دوست نوازی میں بھی بے مثل تھا۔

کیفؔ عظیم آبادی عظیم آباد کے مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ انفرادی لحظہ کے شاعر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ مشاعروں میں چھائے رہے۔ اردو رائٹرس فارم پٹنہ نے شمائل نبی سابق وزیر بہار کی صدارت میں ''شام کیف عظیم آبادی'' کے نام سے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ جس میں ان کی تین کتابوں ''صداؤں کے سائے''، ''انگنائی''، ''سنولائی دھوپ'' کا اجرا کیا گیا۔

کیفؔ عظیم آبادی اپنی غزلوں اور مترنم آواز کی وجہ سے مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ اس لئے ان کی مقبولیت نہ صرف خواص بلکہ عوام میں بھی بیحد تھی۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے

اہل علم ان کے قدرداں تھے۔ جب اردو میں ان کے شعری مجموعوں کو مقبولیت حاصل ہوئی تو ان کے مداحوں نے دیونا گری رسم الخط میں بھی کلام کی اشاعت پر اصرار کیا۔ مداحوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہندی زبان میں بھی ان کے کلام کو شائع کر دیا گیا۔ **(۹۸)**

کیف عظیم آبادی کا انتقال ۲۴ / جنوری ۱۹۹۴ء کو ہو گیا۔ اور شاہ گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔

کیف کی دو غزل پیش ہے ؎

وہ تو دیوانہ تھا کچھ اس سے سوا ہوں میں بھی — اپنے احساس کے ہاتھوں سے مرا ہوں میں بھی
ذہن کی کوئی گلی یاد سے خالی نہ رہی — کتنے آوارہ خیالوں میں گھرا ہوں میں بھی
سوچتا ہوں میں سمیٹے ہوئے طوفان وجود — جیسے ناکردہ گناہوں کی سزا ہوں میں بھی
جانے کس وقت جھلس کر میں فنا ہو جاؤں — کتنے تپتے ہوئے سورج پہ کھڑا ہوں میں بھی
اپنی فطرت میں ہے انداز بغاوت پنہاں — سب کی راہوں سے الگ ہو کے چلا ہوں میں بھی
جانے کیوں کیف مجھے لوگ برا کہتے ہیں — کسی ممتا بھرے ہونٹوں کی دعا ہوں میں بھی

(۹۹)

چاک گریباں دیکھ کے ہم کو لوگو! کیوں حیرانی ہے؟ — فصل بہاراں نام ہے جس کا فطرت کی عریانی ہے
آنکھ میں جھانکو غم کو ٹٹولو، دلداری سے بات کرو — ہنستے چہرے پر مت جاؤ دل میں بڑی ویرانی ہے
پلکوں پہ کچھ تارے چمکے زخم تمنا جاگ اٹھا — ایسے مہکی یاد تمہاری جیسے رات کی رانی ہے
آنکھ میں مستی مدرا جیسی اور بدن ہے چندن سا — دیکھ کے سندر روپ کسی کا آنکھوں کو حیرانی ہے
چلتے پھرتے لوگوں میں اب جینے کا احساس نہیں — گاؤں کا پنگھٹ سونا سا ہے شہروں میں ویرانی ہے
کیف! تغیر کا قائل ہوں اور یہ میں نے سوچا ہے — حسن بھی فانی، عشق بھی فانی جسم مگر لافانی ہے

(۱۰۰)

(۱۲)

احسان الرحمن خاں احسان دربھنگوی

احسان الرحمن خاں نام احسان تخلص۔ ۱۹۲۲ء میں موضع کوٹھیا، مرزا پور ضلع دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی عزیز الرحمن خاں تھا۔ جمیل مظہری کے عزیز شاگردوں میں سے

تھے۔احسانؔ پر جمیل مظہری کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔

وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

میرا خیال یہ ہے کہ نظموں میں ان کی کیفیت ترقی پسند احوال کوائف سے زیادہ قریب رہی ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں جمیل مظہری کی نہ فکر ہے،نہ فلسفہ،نہ ان کی تشکیل۔لیکن غزلوں میں جس طرح کی غنایت جمیل مظہری کے یہاں پائی جاتی ہے۔وہ ان کے یہاں بھی ہے۔فرق ذہنی مرتبے کا ہے۔ان کا مجموعہ کلام ''شہر آرزو'' ۱۹۸۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔جس میں غزلیں تو ہیں ہی چند نظمیں بھی ہیں۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے مقدمہ میں صرف ایک شعر ہے۔جو علامہ جمیل مظہری کا ہے۔

بجز ثقالت معنی غزل میں رس ہے نہ رنگ
خدا نہ کرے کہ احسانؔ مظہریؔ ہو جائے

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ احسان دربھنگوی کی شاعری کا رنگ وآہنگ کیا ہے۔موصوف کے یہاں فطری رومانیت جھلکتی ہے۔کہیں کہیں خمریاتی شاعری کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ **(۱۰۱)**

غزل کے اشعار پیش ہیں ؎

اے شمع میری طرح شرارے اگل کے دیکھ مجھ سے مقابلہ ہے تو دن کو بھی جل کے دیکھ

جو بات سارے فسانے کی جان تھی شاید ملے جب ان سے تو وہ بات یاد ہی نہ رہی

نازک بہت تھے پاؤں تو صحرائے عشق میں کچھ دور ساتھ چل کے گنہ گار کیوں ہوئے

وقت رخصت نہ اسے دیدۂ ترس دیکھو اک مجاہد کو مجاہد کی نظر سے دیکھو
بنا کے اپنے سفینے کا ناخدا مجھ کو کسی نے کر دیا طوفاں سے آشنا مجھ کو

حقیقت آئے گی سامنے جب تو پھر فسانہ کہاں رہے گا تمہارا فسوں رہے سلامت طلسم توڑو نہ رنگ و بو کا

موصوف کی وفات ۲۸/جولائی ۱۹۹۸ء کو ہوئی۔مدفن کوٹھیا،ضلع دربھنگہ ہے۔**(۱۰۲)**

دور مابعد جدید

دورحاضر

دور مابعد جدید

دور حاضر

جدیدیت کے بعد ایک تحریک مابعد جدیدیت کے نام سے آئی۔ جدیدیت نے ذات کے حوالے سے ادبی تخلیقات کا ایک ایسا منبع سامنے لایا، جس میں خارجی احوال اور سماجی کوائف کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ پھر وجودیت کے تحت اور بعض وجودی فلسفیوں کے اثرات سے ایک زمانے تک جو شعروادب پیدا ہوا اس میں زندگی کی نفی مرکزی حیثیت بنتی گئی۔ اسی کے تناظر میں مابعد جدیدیت کا وجود ہوا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

اردو مابعد جدیدیت کے سلسلے میں بعض امور قطعی واضح ہو چکے ہیں۔ ان میں چند بہت نمایاں ہیں جیسے انسانی زندگی کو ہر ممکن سطح پر مسرت آگیں اور ولولہ انگیز بنانا۔

مزید تحریر کرتے ہیں:

تمام قدیم ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی نسل خصوصاً جو ۱۹۸۰ء کے بعد یا اس کے آس پاس سامنے آئی ہے۔ اس کے یہاں ایک طرف اردو کی مثبت روایتیں سامنے تھیں۔ تو دوسری طرف ترقی پسندی اور جدیدیت کے زوال کا منظر نامہ بھی تھا۔ نتیجے میں نئے لکھنے والوں نے زندگی کی حوصلہ مند قوتوں کو نئے افکار کی روشنی میں آزادانہ طور پر برتنے کی سعی شروع کی۔ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نسل مابعد جدیدیت کے تصورات سے کچھ زیادہ قریب ہے۔ (۱۰۳)

اس دور میں باحیات شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں کچھ شعراء تو ایسے ہیں کہ جو ۱۹۸۰ء کے پہلے کے ہیں۔ چونکہ باحیات ہیں اس لئے ان کو بھی اس دور میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس دور میں ۱۹۸۰ء سے قبل کے شاعر بھی ہیں۔ اور ۱۹۸۰ء کے بعد کے شاعر بھی۔ دونوں کے اشعار کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ تاکہ موازنہ کرنے میں آپ کو سہولت ہو۔ اس دور کے چند باحیات شعراء کے تذکرے اور نمونہ کلام پیش ہیں۔

(۱)

کلیم احمد کلیم عاجزؔ

کلیم احمد نام، عاجزؔ تخلص۔۱۱/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو صوبہ بہار کے ایک قصبہ تلہاڑا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے لی۔پھر اپنے نانا مولوی ضمیرالدین سے حاصل کی۔۱۹۳۹ء میں باضابطہ اسکول میں داخل کئے گئے۔میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔۱۹۴۶ء کے فساد کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔جب قدرے سکون ہوا تو پھر تعلیم کے طرف متوجہ ہوئے۔آئی اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسیٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔

کلیم عاجز ایک مشہور شاعر ہیں۔اور ان کی شہرت مشاعروں کی وجہ سے ہندوستان سے باہر بھی ہے۔بلکہ اس کی وجہ غیر ممالک میں بھی ان کی آمد ورفت کچھ زیادہ ہی ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری کے سلسلہ میں وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

کلیم عاجز کو ہندوستان کے نقادوں نے ابھی بھی قابل توجہ باور نہیں کیا ہے۔حالانکہ ان کی شاعری کا اپنا ایک تیور ہے۔ان کے اندر ہمیشہ میرؔ کی تلاش کی جاتی رہی ہے جو میرے خیال میں مستحسن نہیں۔میرؔ کی شاعری کی آفاقی ہیئت وقیع ہے۔اس وسعت میں نہ ان کا کوئی حریف ہے نہ ثانی، نہ ان کے گرد کوئی پہنچتا ہے۔ایسے میں کلیم عاجز کا غم واندوہ ان کے اپنے مخصوص حالات کا نتیجہ ہے۔دراصل کلیم کا ملتہب اور حساس دل انہیں دقت آمیزی کی طرف راجع رکھتا ہے، اور دل سوزی پیدا کرتا ہے۔بعضوں نے ان کے ڈکشن کو بھی میرؔ کے تابع کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن کلیم عاجز کی شاعری کا ایک ایسا اسلوب ہے جو ان کی پہچان بناتا ہے۔ (۱۰۴)

کلیم عاجز کے اشعار کا نمونہ پیش ہے ؎

دریائے غزل کی ٹھہری ہوئی موجوں میں ابال آجاتا ہے
وہ طنز جو ہم پر کرتے ہیں ہم کو بھی جلال آجاتا ہے
محفل میں اگر پڑھنے کو غزل عاجزؔ کسی سال آجاتا ہے
کچھ تھام کے دل رہ جاتے ہیں کچھ لوگوں کو حال آجاتا ہے

ہم بھی نہ کریں یوں ترک وفا اکثر یہ خیال آجاتا ہے
پھر وضع کی بات آجاتی غیرت کا سوال آجاتا ہے
جب کوئی نیا گل کھلتا ہے شاعر کا کلیجہ ہلتا ہے
دنیا کو غزل مل جاتی ہے اور دل پر وبال آجاتا ہے
اشکوں کے مسافر صف باندھے خاموش گزرنے لگتے ہیں
پھر خواب کہاں ان آنکھوں میں جب ان کا خیال آجاتا ہے
اب فصل بہاراں آئے گی، اب فصل بہاراں آئے گی
اک سال گزر جاتا ہے یوں ہی اور دوسرا سال آجاتا ہے

(۱۰۵)

وہ غزل انہیں کو سنائے گا وہ چھری اسی پہ چلائینگے — نہ کلیمؔ ان کو بھلائے گا نہ کلیمؔ کو وہ بھلائینگے
چھری ان کی ناز کرے نہ کیوں بھلا ناز کیوں نہ اٹھائینگے — ہم اسی سے ہونگے خفا اگر تو گلے سے کس کو لگائینگے
وہ ان آنسوؤں کو سنگار لیں ہم انہیں کی زلف سجائینگے — یہ ستارے ٹانک کے اور بھی انہیں چار چاند لگائینگے
ہم اسی گلی کے ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی ملائینگے — نہ بلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائینگے
وہ تو بدگمان ہیں بے سبب ہم انہیں پہ اپنا لٹا کے سب — جب انہیں نہ اپنا بنا سکے تو اب اور کس کو بنائینگے
ہم اگر چہ بزم سے دور ہیں ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں — ہم اگر نہ دینگے لہو انہیں وہ چراغ کیسے جلائینگے؟

(۱۰۶)

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے — مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے
نہ پوچھو زخم ہائے دل کا عالم — چمن میں ایسی گلکاری نہیں ہے
بہت دشوار سمجھانا ہے غم کا — سمجھ لینے میں دشواری نہیں ہے
غزل ہی گنگنانے دو کہ مجھ کو — مزاج تلخ گفتاری نہیں ہے
چمن میں کیوں چلوں کانٹوں سے بچ کر — یہ آئین وفا داری نہیں ہے
وہ آئیں قتل کو جس روز چاہیں — یہاں کس روز تیاری نہیں ہے

(انٹرنیٹ)

(۲)

عبدالمنان طرزیؔ

عبدالمنان نام، طرزیؔ تخلص۔ والد کا نام حافظ قاری محمد داؤد موضع جلوارہ ضلع دربھنگہ میں ۲۱؍مارچ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی نگرانی میں حفظ مکمل کیا۔ ۱۹۵۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد آئی اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۰۰ء میں میتھلا یونیورسیٹی دربھنگہ سے پروفیسر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔

طرزی ۱۹۵۵ء سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدا میں ان کے والد ان کے کلام پر اصلاح دیتے رہے۔ پھر عبدالعلیم آسیؔ اور محسنؔ دربھنگوی کے شاگرد ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام لکیر کے نام سے ۱۹۷۲ء میں طبع ہوا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

طرزی نے بڑی تیزی سے قدر و منزلت کی کئی منزلیں طے کرلی۔ اور پوری اردو دنیا کی واحد شخصیت ہیں جس نے تبصرے اور تنقید کے لئے شعر کا سہارا لیا ہے۔ یہ انداز اتنا نیا ہے کہ اس کی پہچان از خود ہوجاتی ہے۔ پاکستان کے نامور ادباء نے بھی ان کے تنقیدی کلام کی کھل کر داد دی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ طرزی کو اس عمل میں خاصے نثری مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ منظوم تنقیدی جائزہ اکہری معنویت کا داعی ہے۔ یہ اس کا اپنا نقص ہے۔ جسے دور کرنا محال ہے۔ کہیں کہیں عروضی حد بندیاں دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ لیکن اپنے آخری مرحلہ میں ایسے تنقیدی جائزے داد و تحسین وصول کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اور شاعر کا امتیاز روشن ہوجاتا ہے۔ **(۱۰۷)**

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

آپ میری آرزو، میری تمنا آپ ہیں   کس کو کس کو میں بتاؤں میرے کیا کیا آپ ہیں
میکدہ، ساغر، صراحی اور صہبا آپ ہیں   جو کسی صورت نہ اُترے ایسا نشّہ آپ ہیں
جس پہ کرتی ہے محبت میری دعویٰ آپ ہیں   جس کا دل شام و سحر پڑھتا وظیفہ آپ ہیں
آپ ہیں اے جانِ جاں میرے سخن کی آبرو   سچ تو یہ ہے کہ غزل کا مصرع مصرع آپ ہیں

آپ کی زلفوں کا میں ہی تو نہیں تنہا اسیر
کر گئی برباد جو زاہد کی تقویٰ آپ ہیں

جذبۂ پاکیزہ میرے دل کا ہیں کچھ آپ ہی
میری چشمِ شوق کا سارا تماشہ آپ ہیں

عہد پیری میں غزل طرزیؔ میاں ایسی جواں
عشق میں کس کے بھلا اتنے بھی رسوا آپ ہیں؟

کام آئے گا، جنوں سختیٔ زنجیر نہ دیکھ
خود کو گر دیکھنا ہے گردشِ تقدیر نہ دیکھ

گاہے کر دیتی ہے کچھ دور بھی مقصد سے یہی
خواب سے پہلے کبھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

عقلِ عیّار کو شرمندۂ وحشت کر دے
برسرِ دار مچل کاہشِ تعذیر نہ دیکھ

تیشہ برداروں سے ہر دَور کی تاریخ بنی
کاوشیں دیکھ، کبھی حاصلِ تدبیر نہ دیکھ

عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پسِ پشت نہ ڈال
شاعرِ شعلہ صفت! شبنمی تحریر نہ دیکھ

قوّتِ بازو پہ، رکھ عزمِ مصمّم پہ نظر
سعیٔ پیہم کے سوا نسخۂ تسخیر نہ دیکھ

منتظر آج بھی کچھ تازہ افق ہیں طرزیؔ
کوچۂ شوق میں آ، درد کی تفسیر نہ دیکھ

کمالِ فن کا جوہر جب دکھاتے ہیں غزل والے
زمیں کو آسماں جیسا بناتے ہیں غزل والے

بدل دیتے ہیں خاروں کی خلش گُل کی نزاکت سے
زباں شبنم کی شعلوں کو سکھاتے ہیں غزل والے

کبھی پہلے غزل اُن کی، کبھی خود پیشتر اُس سے
کسی کے دیدہ و دل میں سماتے ہیں غزل والے

اگر آہوں سے اپنی کوئی مصرع گڑھ بھی لیتے ہیں
تو اشکوں سے گرہ اُس پر لگاتے ہیں غزل والے

وفورِ شوق کی مجبوریاں بھی کیسی کیسی ہیں
کسی کا نام لکھ لکھ کر مٹاتے ہیں غزل والے

زمیں زرخیز ہے یہ میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی
کہ جس میں فصلِ تازہ اب اُگاتے ہیں غزل والے

بعجزِ علم و دانش جاؤ اُن کی بزم میں طرزیؔ
غزل کی شعر بندی پر بُلاتے ہیں غزل والے

(بذریعہ ای میل)

(۳)

اعجاز علی ارشدؔ

اعجاز علی نام، ارشدؔ تخلص۔ والد کا نام محمد علی خاں تھا۔ ۱۹۵۴ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک

سے ایم اے تک کی تعلیم پٹنہ ہی کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ہوئی۔ ایم اے اردو بھی پٹنہ یونیورسٹی سے ہوئے۔ لیکن فارسی میں ایم اے مگدھ یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری پٹنہ یونیورسٹی سے لی۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مثلاً نشاط غم مجموعہ کلام رازعظیم آبادی ترتیب مع مقدمہ 'بہار میں اردو تنقید' 'کرشن چند کی ناول نگاری' 'نذیر احمد کی ناول نگاری' 'کرسی اور کرنسی' (طنز وظرافت) 'دعوت اور عداوت' (طنز وظرافت) 'سید عاشور کاظمی۔ فنکار اور فن' 'منثورات جمیل مظہری' (ترتیب مع مقدمہ) دو جلدوں میں اور 'اسلوب معنی' وغیرہ۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد فی الحال مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ میں وائس چانسلر کے باوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ (۱)

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

''اس فہرست پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ ارشد مختلف اصناف میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کی دلچسپی طنز ومزاح سے بھی رہی ہے۔ شاعری بھی ان کی توجہ کا مرکز ہے اور بحیثیت شاعر اپنی شناخت منوانے کا تیور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ پھر بھی میرے نقطہ نظر سے ان کی تنقیدی کاوشیں قابل لحاظ رہی ہیں۔ کرشن چندر کی تفہیم میں ان کی نگارشات کا رول اہم ہے۔ جمیل مظہری کی تفہیم کے باب میں ان کی سعی مستحسن سمجھی جاسکتی ہے۔ ان کو جس طرح اور جس تنقیدی بصیرت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے قابل قدر ہے۔ عاشور کاظمی پر بھی ان کا کام قابل لحاظ سمجھا جاسکتا ہے۔ بہار میں اردو تنقید کا جائزہ ہر چند کہ پرانا ہے لیکن بعض مضامین کی تازگی آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ رازعظیم آبادی پر ان کا مقدمہ شاید متعلقہ شاعر کی پہچان بن سکے۔'' (۱۰۸)

پروفیسر اعجاز علی ارشد اپنی شاعری کے آغاز کے سلسلہ میں خود تحریر کرتے ہیں:

باضابطہ طور پر میں نے ۱۹۷۲ء کے آس پاس شاعری کا آغاز کیا۔ اس سے قبل محمڈن اسکول پٹنہ سیٹی میں منعقدہ طرحی مشاعروں کے لئے کچھ غزلیں کہیں تھیں۔ جواب محفوظ نہیں ہیں۔ پہلی بار اورینٹل کالج کے ایک جلسے میں نظم 'گرمی عشق عمل' سنائی۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر سید احتشام حسین فرما رہے تھے۔ نظم ان کے خیال میں بیحد اچھی تھی۔ اس کے بعد نواب خورشید صاحب کے

مکان پر واقع طرحی مشاعروں میں غزلیں سنانے لگا۔ان میں اساتذۂ سخن بسملؔ عظیم آبادی، اخترؔ اورینوی، غضنفر نواب دانشؔ وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

میں نے چند غزلوں پر اپنے ماموں شفیعؔ احمد فاطمی سے اصلاح لی۔اور ۱۹۸۴ء تک جناب سید ارتضیٰ حسین ہوشؔ عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔اس کے بعد آزادانہ غزلیں کہنے لگا۔'دھوپ کے مسافر' کے نام سے میری غزلوں کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔

ابتدائی طور پر میری ذہنی تربیت خالص کلاسیکی شاعری کے ماحول میں ہوئی۔جس کے اثرات تادیر باقی ہیں۔اسلوب اور موضوع دونوں کی سطح پر یہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔عہد حاضر کی ریاکاری اور سیاست گری نے مجھے متاثر کیا۔اور میں نے زندگی کے بدلتے ہوئے منظر نامہ پر نگاہ رکھی ہے۔مجھے اپنی وہ غزل سب سے زیادہ پسند ہے۔جس کا مطلع ہے ؎

نہ جانے کون سے موسم کے انتظار میں ہیں
فسردہ پھول جو کچھ موسم بہار میں ہیں

عوام نے میری اس غزل کو زیادہ پسند کیا۔جس کا مطلع ہے ؎

بھیڑ چاروں طرف مگر تنہا
لوگ رہتے ہیں عمر بھر تنہا

فی الحال میں نے جو غزلیں کہیں ہیں۔ان میں دنیا کی بے ثباتی اور سعی رائیگاں کی موجودہ صورت جو معاشرہ میں موجود ہے، اس کی طرف اشارہ ہے۔شاید یہ میری عمر کا تقاضہ ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

"عظمتوں کے سب نشاں کل بے نشاں ہوجائیں گے
سرخیوں میں رہنے والے داستاں ہوجائیں گے"

پروفیسر اعجاز علی ارشدؔ کی چند غزلیں پیش ہیں ؎

نہ جانے کون سے موسم کے انتظار میں ہیں — فسردہ پھول جو کچھ موسم بہار میں ہیں
کسی کا حال نہیں دیکھتا یہاں کوئی — سب اپنی اپنی تمناؤں کے حصار میں ہیں
یہ کائنات اور اس کے تمام لیل ونہار — ازل سے کشمکش جبر واختیار میں ہیں

شکستہ قبروں میں محصور ٹوٹے پھوٹے جسم　　نہ جانے کب سے قیامت کے انتظار میں ہیں
سروں پہ سایہ دیوار بھی نہیں اب تو　　مگر ہم اب بھی بہاروں کے انتظار میں ہیں
یہ اپنے خون کے رشتے بھی بیچ سکتے ہیں　　عجیب لوگ سیاست کے کاروبار میں ہیں
محبتوں کا ہے جس دن سے سلسلہ ٹوٹا　　نہ وہ سکوں میں ہیں ارشدؔ نہ ہم قرار میں ہیں

بھیڑ چاروں طرف مگر تنہا　　لوگ رہتے ہیں عمر بھر تنہا
کارواں کا رواں ہراک منظر　　آدمی مگر تنہا
روز ملتا ہوں سینکڑوں سے مگر　　روز جاتا ہوں اپنے گھر تنہا
سینکڑوں قافلے گزرتے ہیں　　اور رہتی ہے رہ گزر تنہا
رات بھر شور وغل تھا بستی میں　　صبح دیکھا تو بام ودر تنہا
اب محافظ بھی لوٹ لیتے ہیں　　چھوڑ کر جایئے نہ گھر تنہا
دوستوں کی تلاش میں ارشدؔ　　ہم بھی کرتے رہے سفر تنہا

ابتدائی غزلیں ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء کے آس پاس کی پیش ہیں۔

میری مجبوریوں کو خطا مت کہو　　میں جو خاموش ہوں بے وفا مت کہو
ان کا تم سے تھا کیا سلسلہ مت کہو　　راز کی بات ہے برملا مت کہو
ہیں نگاہیں زمانے کی ہم پر ابھی　　لاکھ چاہے کوئی مدعا مت کہو
درد ، تنہائیاں ، طنز ، رسوائیاں　　اس محبت میں کیا کیا ملا مت کہو
جاؤ سو جاؤ ارشدؔ کہ رات آگئی　　دن نے کیا لے لیا کیا دیا مت کہو

بیان درد میں لذت جو پائے جاتے ہیں　　کوئی سنے نہ سنے ہم سنائے جاتے ہیں
انہیں کے دم سے محبت کا نام زندہ ہے　　جو زخم کھاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں
ہزار بار وفا کا دیا ہے میں نے ثبوت　　مگر وہ ہیں مجھے آزمائے جاتے ہیں
فدا ہیں سیکڑوں سورج ان ہی اندھیروں میں　　جو تیرے زلف کے سائے میں پائے جاتے ہیں

انہیں خبر نہیں ارشدؔ کہ میں ہوں رونق بزم　　مجھ ہی کو غیر سمجھ کر اٹھائے جاتے ہیں

جب بھی اس کا خیال کرتا ہوں　　اپنی غزلوں میں رنگ بھرتا ہوں
شہر سے اس کے جب گزرتا ہوں　　خود بخود ٹوٹتا بکھرتا ہوں
دیکھتا ہوں بلندیوں کے طرف　　سیڑھیاں جب کبھی اترتا ہوں
لوگ ڈرتے ہیں اپنے دشمن سے　　اور میں دوستوں سے ڈرتا ہوں
میں مسافر ہوں دھوپ کا ارشدؔ　　میں کہاں چھاؤں میں ٹھہرتا ہوں

(خودنوشت)

(۴)
خورشید اکبر

محمد خورشید عالم اصل نام، قلمی نام خورشید اکبر، ۵ر جولائی ۱۹۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام زین العابدین ہے۔ وطن مرزا گنج بڑھیا ضلع مونگیر موجودہ ضلع لکھی سرائے ہے۔ ان کی ولادت نانیہال ملکی چک ضلع شیخپورہ میں ہوئی۔ ابتدائی اور عربی و فارسی کی تعلیم اپنے نانا حافظ نصیرالدین سے حاصل کی۔ بربیگہ ہائی اسکول سے میٹرک، کے آر کے کالج سے آئی اے اور بی اے پاس کیا۔ اورایم اے بھاگلپور یونیورسیٹی سے پاس کیا۔ ابھی بہار ایڈمنسٹریٹیو سروس سے منسلک ہیں۔

ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ اب تک ان کے دوشعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''سمندر خلاف رہتا ہے'' اور ''بدن کشتی بھنور خواہش''۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

خورشید اکبر کے یہاں ایک عجیب قسم کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں شعوری طور پر نیا بننے کی کوشش نظر آتی ہے اور اس عمل میں وہ میکا نیکی نہیں ہوتے بلکہ ضرورت کے مطابق وہ لفظوں کو اپنے مزاج اور میلان کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مزید تحریر کرتے ہیں:

ان کے یہاں زبان وبیان کو روایت سے الگ کرنے کی ایک سوچی سمجھی فکر اور تدبیر ملتی ہے۔ یہ تدبیر کافی مطالعہ اور ہنرمندی کا تقاضہ کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ خورشید اکبر نے اپنے آپ کو بھیڑ سے الگ رکھنے کی سعی کی ہے اور اس سعی میں وہ بیحد کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دل دروازے بیٹھ سکھی دربانی کر
رونا دھونا چھوڑ چنز کو دھانی کر
پریتم پیاسی پریت اداسی رین کٹھور
ٹوٹ نہ جائے ڈور جتن سیلانی کر

ہمارے بعد برہنہ رہے نہ کوئی وجود
بس ایک آخری خواہش کفن سے چاہتے ہیں

زمیں پہنی گئی اور آسمان اوڑھا گیا برسوں
بدن کی خانقاہوں میں خدا سویا رہا برسوں

دریا میں بہت کچھ ہے روانی کے علاوہ
مدت سے میں سیراب ہوں پانی کے علاوہ

اگر مہلت ملے تو قاتلان شہر سے پوچھو
میں کس کی جان ہوں کیوں سینۂ خنجر میں رہتا ہوں

برستے ہیں برس جاتے ہیں کتنے
بتا پانی کہاں رکھا ہوا ہے

چمک دل کی مہ تائید سے ہے
مرے فاقوں کو نسبت عید سے ہے

تو زمیں ہے تو ناچ محور پر
میں ہوں آکاش مجھ کو چھو کر دیکھ

ایک منظر اضطرابی ایک منظر سے زیادہ
دل ہے ساحل، دل سفینہ، دل سمندر سے زیادہ

میں نے جو خواب ابھی ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں
میرے اس خواب کی تعبیر کہاں جاتی ہے

وہی دریا ہے اور دریا کنارے
ہماری تشنگی رکھی ہوئی ہے

یہ کیسا شہر ہے میں کس عجائب گھر میں رہتا ہوں
میں کس کی آنکھ کا پانی ہوں کس پتھر میں رہتا ہوں
اگر مہلت ملے تو قاتلان شہر سے پوچھو
میں کس کی جان ہوں کیوں سینہ خنجر میں رہتا ہوں

شاید کبھی نباہ کی صورت نکل ہی آئے
وہ شہر بے پناہ، میں ہجرت مآب ہوں (۱۰۹)

(۵)

عالم خورشید

اصل نام محمد خورشید عالم خاں ۔اور قلمی نام عالم خورشید ہے۔ان کے والد کا نام عبدالرشید خاں ہے۔ان کی پیدائش آرہ میں ۱۹۵۹ء میں ہوئی۔ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد میٹرک ، آئی ۔اے، بی ۔اے تک کے سارے امتحانات یہیں سے پاس کئے ۔ایم۔اے اردو کی ڈگری بنارس یونیورسیٹی سے حاصل کی ۔ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''نئے موسم کی تلاش'' (۱۹۸۸ء)''زہر گل'' (۱۹۹۸ء)''اور خیال آباد'' (۲۰۰۳ء) میں اور ایک مجموعہ ہندی میں شائع ہوا ہے نام ہے''ایک دریا خواب میں''۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

عالم خورشید کا میلان غزل کی طرف ہے۔لیکن حزن و یاس کی کیفیت کو وہ منہا کرتے رہے ہیں۔اور کچھ مثبت عناصر میں سرگرداں رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عالم خورشید کی شاعری کے مطالعے سے پہلا تاثر تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اپنے کلام میں شہریار جیسی سبک روی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف عرفان صدیقی کے غم ذات اور غم حالات کے پیچیدہ مراحل سے گزرنا بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ شہر یار کا تتبع کررہے ہیں یا عرفان صدیقی کے آلام کو اپنی شاعری کے وصف خاص کے طور پر پیش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ بلکہ میرے محسوسات یہ ہیں کہ عرفان صدیقی کی راہ انہوں نے جدیدیت کے شعرا کے حوالے سے اپنائی ہے۔دراصل ان کی شعری تربیت میں شاہد کلیم جیسے جدید شاعر کا ہاتھ رہا ہے تو دوسری طرف رسالہ''شب خون'' نے جس طرح بعض نئے شعرا کے ذہن کو موڑنا چاہا ہے اس سے لازماً عالم خورشید بھی متاثر ہوئے ،لیکن ایک فرق کے ساتھ اور وہ فرق بہت واضح ہے۔ایک طرف تو جدید لہران کے یہاں بہت تیز ہے تو دوسری طرف سیاسی اور معاشی احوال وکوائف کی گونج بھی ان کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔گویا جدیدیت اور ترقی پسندی ان کے یہاں ہم آمیز ہوگئی ہے۔ (۱۱۰)

چند اشعار ملاحظہ ہو:

دریچے بند کروں بھی تو کیا ضروری ہے
مرے مکاں میں صدائے عجب نہیں آئے

شکم کی آگ سے بڑھ کر کوئی وبال ہے کیا
ہمیں خبر ہی نہیں ہجر کیا وصال ہے کیا

پھر آسمان ملنے لگا ہے زمین سے
پھر گل کھلائے گی یہ ملاقات کچھ نہ کچھ

اک پل کو ہی چمکیں لیکن بجلی سی لہرائیں
راکھ تلے پائندہ رہنا ہم کو نہیں منظور

زندگی ایک حقیقت ہی سہی خواب بھی ہے
میں زمیں پر ہوں مگر خواہش مہتاب بھی ہے

کچھ طبیعت ہی فقیرانہ تھی ایسی دوستو
ہر خوشی ہر غم سے ہم کو ماورا ہونا ہی تھا

ٹھٹھرتے موسموں میں یوں گزارا کرتے رہتے ہیں
لہو کا ایک اک قطرہ شرارہ کرتے رہتے ہیں

بڑھا کے کاسہ کہیں مانگ لے نہ ہاتھ مرا
امیر شہر کی دریوزگی کھٹکتی ہے

ہوئے ہیں خاک مگر پھول کچھ کھلائے تو
یہی بہت ہے کہ ہم لوگ مسکرائے تو

کچھ دیر بھول جاؤں میں دنیا کے مسئلے
اے زیست کچھ کشش تو ترے خال وخد میں ہو **(۱۱۱)**

(۶)
عطا حسین انصاری عطاؔ عابدی

نام عطا حسین انصاری، قلمی نام عطا عابدی اور والد کا نام محمد عابد حسین ہے۔ نومبر ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن برہولیا، دربھنگہ ہے۔ ان کے شاعری کے استادوں میں اویس احمد دوراںؔ اور ناوکؔ حمزہ پوری ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً ''آئینۂ عقیدت'' حمد و نعت کا مجموعہ ہے۔ ''فصل آگہی'' کے نام سے سلیم انصاری کا شعری مجموعہ مرتب کیا ہے۔ ناوکؔ حمزہ پوری کے مضامین ''تشکیل و تعبیر'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ ان کا شعری مجموعہ بیاض ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔

وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

''مجھے پتہ نہیں کہ عطا عابدی کا مطالعہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے سلسلے میں کیا کچھ رہا ہے۔ میری ان کی دید و شنید سطحی سی ہے۔ میں ان کے بیک گراونڈ سے بھی واقف نہیں۔ یہ کب سے شعر کہتے ہیں، اس کی بھی اطلاع کچھ خاص نہیں۔ لیکن ''بیاض'' کا مسودہ میں نے دیکھا، تو مجھے احساس ہوا کہ اس شاعر کے یہاں غضب کا تیور ہے۔ اور یہ تیور اساتذہ کی شاعری سے گہری واقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اشعار کی لپک بتاتی ہے کہ عطا عابدی نیا رنگ پیدا کرنے کے اہل ہیں تو یہ بھی واضح کرتی ہے کہ ان کے یہاں انحراف برائے انحراف نہیں ہے، ایک سوچا سمجھا موقف ہے۔ یہ موقف کسی تھیوری کا نتیجہ ہے، کسی وابستگی کا عکس نہیں ہے۔ ہاں جو کمٹمنٹ ہے وہ زندگی سے ہے۔ وہ زندگی جسے شاعر لمحہ لمحہ برت رہا ہے۔ یہ لمحہ لمحہ زندگی کبھی سپر ڈالنے پر مائل کرتی ہے تو کہیں چیلینج کا جواز پیدا کرتی ہے۔'' **(۱۱۲)**

غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

یہ بھی کیا اپنے مصالح کے تئیں جانتی ہے
زندگی میری ہے اور مجھ کو نہیں جانتی ہے
لذت دربدری وقف ہوس ہے پھر بھی
سجدۂ شوق ہے صد چاک جبیں جانتی ہے
زندگی دینے لگی موت کی دھمکی مجھ کو
وہ مرے طرز بغاوت کو نہیں جانتی ہے
مجھ سے جینے کا سبب پوچھ رہی ہے دنیا
ایسے عالم میں کہ جب مجھ کو قریں جانتی ہے
چاہے جتنا بھی کرے زیست بھروسہ مجھ پر
مجھ کو ہوگا نہ کبھی اس پہ یقیں جانتی ہے
دل کا افسانہ ہی ہے زیست کا افسانہ عطؔا
شاعری خود کو مگر دل میں مکیں جانتی ہے

خلاؤں میں مکرر بولتا ہے — کوئی صدرنگ پیکر بولتا ہے
سماعت کس طرح ہوگی بصر کی — نظر گم ہو تو منظر بولتا ہے
نہیں کھلنے کو ہے پیغام کا در — مرے گھر کا کبوتر بولتا ہے
زباں سے دشمنی سب کو رہے گی — کہ سچ تو سر پہ چڑھ کر بولتا ہے
صداؤں کے وسیلے جاگتے ہیں — خموشی میں سمندر بولتا ہے
زباں میں چاندنی کی تم بھی سننا — وہ جو سورج ہے شب بھر بولتا ہے
فسانہ ہوگئی اب یہ حقیقت — لہو چپ ہو تو خنجر بولتا ہے
حماقت ہے پسینے کا بہانا — مقدر کا سکندر بولتا ہے
زمانہ پھر بھی سن لیتا ہے کیسے؟ — کہ غم تو اندر اندر بولتا ہے
لگا کانوں میں گھلنے شہد ایسے — کہ جوں میرا مظفؔر بولتا ہے
نہیں ہے قدر کچھ قربانیوں کی — عطؔا گھر ہو کہ دفتر، بولتا ہے
(۱۱۳)

(۷)

شاہد کلیم

ان کا اصل نام محمد کلیم الدین خاں ہے لیکن قلمی نام شاہد کلیم ہے اور وہ اسی سے مشہور ہیں۔ محلہ دودھ کٹورا، ضلع آرہ میں ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالخالق خاں ہے۔ ان کی تعلیم بی کام تک ہوئی۔

موصوف نے تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت اختیار کی اور اس وقت کسٹم سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

شاہد کلیم جدید صف کے شعراء میں امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ موصوف نے کلاسیکی ادبیات کا خاصہ مطالعہ کر رکھا ہے۔ فارسی شاعری کے ارتقائی سفر پر بھی نگاہ ہے اور جدیدیت کے طرز اور تیور سے بھی ان کی آشنائی نمایاں ہے۔

شاہد کلیم کے کئی مجموعے اشاعت پزیر ہو چکے ہیں۔ جیسے ''زیر بار'' ''موسم موسم روپ'' ''پھول جب کھلتے ہیں'' اور شاید دو مجموعے زیر اشاعت ہیں۔ ان مجموعوں پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ آج کی زندگی کی بے سروسامانی، ہیجان، تشدد، گمرہی، انتشار اور اقدار کا انہدام ان کی شاعری کا بھی قوام ہے۔ لیکن وہ اپنے کلام کو چیستاں نہیں بناتے اور کوشش کرتے ہیں کہ نئے اسالیب میں بھی ترسیل کا المیہ پیدا نہ ہو۔ اس لئے ان کے کلام سے ان کے پڑھنے والوں کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ انہوں نے کئی قابل لحاظ شاگرد پیدا کئے جن میں ایک عالم خورشید ہیں، جن کے یہاں سہل ممتنع کا ایک خاص انداز ملتا ہے۔ ویسے خود شاہد کلیم کی شاعرانہ تربیت علیم اللہ حالی نے کی ہے۔ لیکن میں بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی سادگی و پرکاری جدید تیور کو سمیٹے ہوئے ایک خاص کشش سے بہرہ ور ہے جسے آسانی سے نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی ان کے داخلی کرب سے مملو ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ خارجی احوال وکوائف ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ موصوف کی سات سطری آزاد نظم ''تیز ہوا اور گھر کی گرد'' ملاحظہ ہو:

صاف نہیں رہ سکتا ہے گھر
گرد پلٹ کر آ جاتی ہے

گھر کی صفائی کرتے کرتے
بوڑھی عورت
جھاڑو لے کر
تیز ہوا کو
پیٹ رہی ہے

کوئی دستک، کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں
شہر در شہر عجب قہر خدا کا ٹوٹا

امید ہی کیا رکھیں اب اس کالی گھٹا سے
ہم روز ازل سے رہے پیاسے ہی کے پیاسے

اب تو ہر قدم پر وہ راستہ بدلتا ہے
کچھ پتہ نہیں چلتا قصہ کیا ہے راہی کا

اب کے گزرنا ہوگا بیاباں کی راہ سے
دست دعا سے کام لیں برسات لے چلیں

ہم اک اداس، بھیانک، سیہ کھنڈر میں رہے
تمام رات کسی خوف کے اثر میں رہے

جو دیکھتا ہے مجھے آئینہ کے اندر سے
وہ کون ہے کوئی پوچھے بھی اس ستمگر سے (۱۱۴)

(۸)

سلطان اختر

سلطان اشرف نام، سلطان اختر قلمی نام، اختر تخلص۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۰ء میں سہسرام میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام میں مولوی تک تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سہسرام ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اور یہیں کے ایس پی جین کالج سے بی اے کر رہے تھے، کہ لیبر ڈپارٹمینٹ میں ملازمت مل گئی۔ اور تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ ستمبر ۱۹۶۸ء سے ہوم (جیل) ڈپارٹمینٹ سے وابستہ ہوئے۔ اور اسی عہدہ سے ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء میں سبکدوش ہوئے۔

سلطان اختر نے باضابطہ طور پر ۱۹۵۷ء سے شاعری شروع کی۔ ان کے استادوں میں مانوسؔ سہسرامی اور جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی رہے۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء سے ان کی تخلیقات ہندو پاک کے معیاری رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ ہمعصروں کے درمیان ان کی شناخت جلد ہوگئی۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

ان کے کلام میں ایک حسن ہے۔ جہاں کھردرا پن کو دخل نہیں۔ دراصل سلطان اختر کی شخصیت میں ایک کشش سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کشش ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے فارسی شعراء کا بھی لازماً مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے شاعری میں ایسے الفاظ آتے ہیں۔ جن میں فارسی آمیزی بطور خاص اجاگر ہوتی ہے۔ یہ ایک خاص بات ہے۔ (۱۱۵)

چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

پیچھے پیچھے ہے در و دیوار گھر مٹتے ہوئے
آگے آگے ایک شہر خوشنما بنتا ہوا

ایک لمبی گونج سے روشن فضائے نیم شب
لوح دل پر تہہ بہ تہہ نقش نوا بنتا ہوا

منزل سے پہلے دم نہ لیا پائے شوق نے
جوش طلسم راہ گذر رائیگاں ہوا

فصیل لب پہ جڑے ہیں سکوت کے شیشے
زباں کو زخم لگائیں تو کچھ کہیں ہم بھی

لرز کے ٹوٹ گیا برگ زار کی مانند
یہ اور بات کہ میں نے اسے چھوا بھی نہیں

اب کرائے کے مکاں میں گھٹ رہا ہوں
باپ دادا کی حویلی بک چکی ہے

نواح دل پہ کڑی دھوپ کی فصیل تو ہے
مگر وہ سایہ دیوار اب کہیں بھی نہیں

ڈوبنے والوں کی آوازوں نے ساحل چھولیا
چیختا دریا کف افسوس مل کر رہ گیا

انہیں بھی آج کی تہذیب چاٹ جائے گی
کہیں کہیں جو یہ سمٹے ہوئے قبیلے ہیں

غزل کے چند اشعار

شکستہ حوصلوں کو دم بدم بیدار کرتا ہے
کوئی تو ہے جو میری راہ کو ہموار کرتا ہے

بھنور کو سرنگوں ہر موج کو مسمار کرتا ہے
کہ وہ کاغذ کی کشتی سے سمندر پار کرتا ہے
بہت ڈستی ہے ہم کو دشمنوں کی خندہ پیشانی
ہمارا دوست کوئی پشت سے جب وار کرتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو مجھ سے کوئی آگے نکل جائے
یہی اک خوف تو مجھ کو سبک رفتار کرتا ہے (۱۱۶)

(۹)
شمیم الدین احمد علی شمیمؔ قاسمی

شمیم الدین احمد علی نام۔ شمیم قاسمی قلمی نام۔ شمیمؔ تخلص۔ ان کے والد نصیر الدین بن عبد العمر علی خاں بہادر تھے۔ یکم جنوری ۱۹۵۴ء میں سہسرام میں پیدا ہوئے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد بہار انٹرمیڈیٹ کانسل پٹنہ میں ملازم ہو گئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'گمشدہ موسم' ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

شمیم قاسمی نے اپنے ڈکشن سے لوگوں کو چوکایا بھی۔ اور اپنی شناخت کا باعث بھی بنے۔ انہوں نے شاعری کے متعینہ ڈکشن کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ عظیم آباد کے اول اور آخری شاعر ہیں، جنھوں نے یہ روش اختیار کی۔ کہہ سکتے ہیں کہ جدیدیت کے اثرات قبول کرنے والوں میں شمیم قاسمی بھی ہیں۔

مزید تحریر کرتے ہیں:

ان کے یہاں لسانی تشکیلات کا ایک شعور ملتا ہے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ وہ ظفر اقبال کے قریب آنا چاہتے ہیں۔ لیکن ظفر اقبال کا کسی لسانی تشکیل سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ لیکن ہیئتی شکست وریخت کا عمل ان کے یہاں شدید ہے ہی۔ میرا خیال ہے کہ شمیم قاسمی ایک طرف تو ظفر اقبال سے قریب آنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف دوسرے پاکستانی شاعر انیس ناگی کا طرز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت ایسی ہی کشمکش سے دوچار ہے۔ جبکہ فیصلہ کی گھڑی آپہنچی ہے۔ (۱۱۷)

ان کے چند اشعار پیش ہیں ؎

یہ بھی تھی اس کی شان رتی بھر
ہوگئی اک چٹان رتی بھر
دل کے ٹکڑے ہیں بے شمار مگر
آپ کا خاکدان رتی بھر

اس کی محفل سے لیجئے رخصت
دیجئے وقت کان بھرنے کا
زہر گھولے گا جنبش لب سے
وقت ہے منہ میں پان بھرنے کا

اچھا شعر بہت مشکل ہے
کہہ دینے سے مشکل جائے

خلق ہوگی جو شعریات نو
بے تکلف سخن کروں گا میں

کھوٹا سکہ اک دن چل بھی سکتا ہے
راوی کا انداز بدل بھی سکتا ہے

اچھے خاصے لڑکے کو اک لڑکی کے
بائیں ہاتھ کا کھیل ہے پاگل کردینا

اب اس کا مفہوم تو اہل دل جانیں
چھوکر اس کے جسم کو صندل کردینا (۱۱۸)

خلاصہ یہ کہ بہار میں اردو شاعری کی روایت قدیم ہے۔ یہاں اردو شاعری کی روایت اس وقت سے ملتی ہے، جب سے ملک کے دوسرے علاقوں میں اردو شاعری کا رواج شروع ہوا۔ بہار کی اردو شاعری میں انفرادیت بھی ہے۔ اور یہ انفرادیت ابتدا ہی سے آگے کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ اور جیسے جیسے اردو شاعری ترقی کے منازل طے کرتی رہی، اس انفرادیت میں نمایاں نکھار بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح بہار میں اردو شاعری کا دبستان عظیم آباد اپنی حیثیت بنانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

مراجع

(۱) بہار اور اردو شاعری، ص۔ ۱۲
(۲) بہار اور اردو شاعری، ص۔ ۱۳
(۳) تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۴۴
(۴) بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری، ص ۱۱۳
(۵) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۴۰
(۶) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۴۱
(۷) بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری، ص ۱۱۵
(۸) بہار اور اردو شاعری، ص ۷
(۹) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۵۳
(۱۰) چہار عنصر ۱۰۳ عنصر او
(۱۱) معاف عظم گڑھ اگست ۱۹۴۶ء، ص ۸۵
(۱۲) سفینہ خوشگو، ص ۱۰۴
(۱۳) مجموعہ استفسار وجواب، جلد اول، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، ص ۷۷ ۲، سفینہ ہندی، ص ۲۸، سرو آزاد، ص ۶۷ ۳، خزانہ عامرہ، ص ۱۵۲
(۱۴) حیات بیدل، ص ۱۳
(۱۵) جلد دوم، ص ۲۱
(۱۶) مراۃ الخیال، ص ۲۹۴
(۱۷) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۹۶
(۱۸) سرود آزاد، ص ۱۴۸
(۱۹) خزانہ عامرہ، ص ۱۵۲
(۲۰) معارف، اعظم گڈھ اگست ۱۹۴۶ء، ص ۸۵
(۲۱) حیات بیدل، ص ۱۶
(۲۲) حیات بیدل، ص ۱۷
(۲۳) تاریخ صوبہ بہار، ص ۲۲۰

(۲۴) چہار عنصر ۵۴۹
(۲۵) سفینہ خوشگو، ص ۱۰۵
(۲۶) حیات بیدلؔ، ص ۲۱
(۲۷) حیات بیدلؔ مختلف صفحات
(۲۸) حیات بیدل، ص ۱۴ بحوالہ حیرت زار از عطا کاکوی، ص ۵۰
(۲۹) دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۵، ص ۲۳۱
(۳۰) بیدل، ص ۵
(۳۱) میرزا بیدلؔ، ص ۳۰
(۳۲) ماہنامہ تحریک سلور جبلی نمبر نئی دہلی، ص ۹
(۳۳) حیرت زار، ص ۳۶
(۳۴) تحریک نئی دہلی سلور جبلی نمبر ۱۹۷۸
(۳۵) رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۳، ص ۵۸
(۳۶) بہار اور اردو شاعری، ص ۲۹
(۳۷) جلوہ خضر جلد اول، ص ۹۸
(۳۸) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۱
(۳۹) تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن، ص ۹۰
(۴۰) جلوہ خضر جلد اول، ص ۹۸
(۴۱) دیوان حسرت عظیم آبادی، ص ۶۱
(۴۲) تذکرہ شعرائے اردو، ص ۵۹
(۴۳) بزم سخن، ص ۳۷
(۴۴) بزم سخن، ص ۳۷
(۴۵) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۳
(۴۶) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۸
(۴۷) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۸
(۴۸) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۸

(۴۹) خمخانہ جاوید بحوالہ بہار اور اردو شاعری، ص ۳۴
(۵۰) بہار اور اردو شاعری، ص ۳۵
(۵۱) گلشن بیخار، ص ۱۴۷
(۵۲) گلشن ہند، ص ۱۳۲
(۵۳) بہار اور اردو شاعری، ص ۴۸
(۵۴) تذکرہ بزم شمال، جلد اول، ص ۴۳
(۵۵) بہار اور اردو شاعری، ص ۵۳
(۵۶) ماہنامہ نگار ۱۹۳۵
(۵۷) بہار اور اردو شاعری، ص ۵۶
(۵۸) بہار اور اردو شاعری، ص ۵۷
(۵۹) گلشن بیخار، ص ۵۵
(۶۰) تاریخ ادب اردو (وہاب اشرفی) جلد اول، ص ۲۶۷
(۶۱) بہار میں اردو شاعری، ص ۵۸۔۵۹
(۶۲) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد دوم ص ۴۲
(۶۳) بہار میں اردو زبان ادب کا ارتقا، ص ۲۵۰
(۶۴) بہار اور اردو شاعری، ص ۵۷
(۶۵) بہار اردو زبان ادب کا ارتقا، ص ۲۱۱
(۶۶) حیات فریاد، ص مختلف
(۶۷) حیات فریاد، ص ۲۱۳
(۶۸) حیات فریاد، ص ۲۱۸
(۶۹) خمخانہ جاوید، جلد سوم۔ ص۔ ۲۱۰
(۷۰) بہار اور اردو شاعری، ص ۲۱
(۷۱) بہار اور اردو شاعری، ص ۶۱
(۷۲) تذکرہ گلزار ابراھیم، ص ۲۵
(۷۳) تذکرہ میر حسن، ص ۵۰

(۷۴) بہار اور اردو شاعری، ص ٦٦
(۷۵) بہار اور اردو شاعری، ص ٦٦
(۷٦) بہار اور اردو شاعری، ص ٦۷
(۷۷) بہار اور اردو شاعری، ص ۸۹
(۷۸) تاریخ ادب اردو جلد اول، ص ۳۷۲
(۷۹) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ ص ۳۷۴
(۸۰) بہار اور اردو شاعری۔ ص ۹۱
(۸۱) بہار اور اردو شاعری، ص ۸۷
(۸۲) فضل حق عظیم آبادی، عصر، حیات اور فن، ص۔ ۴۱
(۸۳) خمخانہ جاوید جلد اول، ص ۴۷
(۸۴) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۲۱۔ ۱۲۲
(۸۵) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۳۹۷
(۸٦) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۴۰۳
(۸۷) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۴۸
(۸۸) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۴۰۲
(۸۹) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ ص ۱۴۰۲
(۹۰) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص۔ ۱۴۹۱
(۹۱) بہار اور اردو شاعری، ص۔ ۱۳۳
(۹۲) تذکرہ شعرائے سارن، ص ۱۳۳
(۹۳) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۴۲۷
(۹۴) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۳٦
(۹۵) نشاط غم۔ ص ۱۴
(۹٦) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۴۷۰
(۹۷) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ ص ۱۵۳۹ تلخیص
(۹۸) کیفؔ عظیم آبادی مقام اور کلام تلخیص

(۹۹) کیف عظیم آبادی مقام اور کلام، ص ۶۱
(۱۰۰) کیف عظیم آبادی مقام اور کلام، ص ۶۷
(۱۰۱) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۵۴۶
(۱۰۲) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۵۴۶
(۱۰۳) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۱۳
(۱۰۴) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۵۷۱
(۱۰۵) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۵۷۲
(۱۰۶) وہ جو شاعری کا سبب ہوا، کلیم عاجز، ص ۳۸۳
(۱۰۷) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۸۱۵
(۱۰۸) تاریخ ادب اردو، جلد دوم۔ص ۱۱۴۵
(۱۰۹) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۸۵۴، بہار میں اردو شاعری ۱۹۸۰ء کے بعد
(۱۱۰) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۵۸
(۱۱۱) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۵۸
(۱۱۲) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۷۲
(۱۱۳) بیاض۔ص ۴۰
(۱۱۴) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۲۲
(۱۱۵) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۷۵۹
(۱۱۶) تاریخ ادبو اردو، جلد سوم۔ص ۱۷۵۹، غزلستان، ص ۴۳
(۱۱۷) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۳۸
(۱۱۸) تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ص ۱۸۳۸

☆☆☆

باب دوم

بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ

بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ:

بہار ہمیشہ علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے۔ ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح یہ بھی ابتدا ہی سے علمی ماحول کا آئینہ دار بھی رہا ہے۔ تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ اردو نثر ونظم کے جو ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں، ان میں بہار کا حصہ نمایاں ہے۔ ہر دور میں یہاں کے علماء اور صوفیاء اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں پیش پیش رہے۔ علماء کی درسگاہیں اور صوفیاء کی خانقاہیں درس وتدریس اور رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کا مرکز بھی بنی ہوئی تھیں۔ موجودہ تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہے کہ دبستان دکن کے فوراً بعد بہار میں تخلیق ادب کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور یہاں کے صوفیاء جو علماء بھی تھے، نیز علمائے کرام بہار میں شعروادب کی آبیاری کر رہے تھے۔ اور اردو شاعری کی روایت کو مضبوط اور پختہ بنیادوں پر کھڑا کرنے میں مشغول تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کی اردو شاعری میں داخلیت کا عنصر غالب ہے۔ عامیانہ اور رکیک خیالات سے پاک اور صالح روایت کی پاسداری بہار کی اردو شاعری میں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں باب اول کے ابتدائی صفحات اور بعد کے دیگر ابواب میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

گذشتہ باب میں بہار کی اردو شاعری کو چار دور میں تقسیم کیا گیا۔ اور ہر دور کی مختصر خصوصیت بیان کی گئی۔ اسی طرح اس باب کو بھی میں نے چار دور میں تقسیم کیا ہے۔ دور متقدمین، دور متوسطین، دور جدید اور مابعد جدید یا دور حاضر۔ گرچہ میرے خاکہ میں دور مابعد جدید کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن میں نے مطالعہ کے روشنی میں اس کا اضافہ کر دیا ہے۔

گذشتہ باب میں دور کے تعین کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اسی کے مطابق اس باب میں بھی ہے۔

سال کے اعتبار سے دور کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دور متقدمین: (بیدل عظیم آبادی سے راسخ عظیم آبادی تک) ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء سے ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء تک

دور متوسطین: (راسخ عظیم آبادی سے شاد عظیم آبادی تک) ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۴۶ء تک

دور جدید: (شاد عظیم آبادی سے ۱۹۸۰ء تک) ۱۸۴۶ء سے ۱۹۸۰ء تک۔

مابعد جدید دور یا دور حاضر۔۔۔: ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۴ء تک۔

میں نے دور کی حد بندی کے بعد ہر دور کے چند نمائندہ علماء کی شاعری سے بحث کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔ اب باب دوم ''بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ'' مطالعہ کے لئے پیش ہے۔

دور متقدمین

دور متقدمین

اردو کی ابتدائی نشوونمااور ابتدائی ادبی روایتو ں کو آگے بڑھانے میں علماء اورصوفیاء نے اہم رول ادا کیا۔دور متقدمین کی شاعری میں اس کا اثر نمایاں ہے۔زبان میں قدامت اور بیان میں سادگی اورصفائی پائی جاتی ہے۔صوفیانہ رنگ اور عارفانہ خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔تہذیب وثقافت کی عکاسی بھی اس دور کی شاعری میں موجود ہے۔ مقامی بولیوں کا اثر بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ فارسی اور بھاشا کے اثرات بھی ہیں۔علماء عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔اس لئے فارسی و عربی زبان وادب کی ادبی خصوصیات اس دور کے علماء کی اردوشاعری میں پائی جاتی ہیں۔زبان ابتدائی ترقی کے مراحل سے گزررہی تھی، اس لئے ریختہ کی پرانی صورت بھی موجود ہے۔دھیرے دھیرے اس میں صفائی آئی۔اس طرح ترقی کا تدریجی مرحلہ اس دور میں نمایاں نظرآتا ہے۔

دور متقدمین کے چند علماء کی مختصر سوانح اوران کی شاعری کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

مولانا سید عماد الدین عمادؔ پھلواروی

سید عماد الدین نام، عمادؔ تخلص ۔آپ کے والد ماجد کا نام شاہ برہان الدین ہے۔ ۱۰۶۵ھ/ ۱۶۵۵ء میں پھلواری میں پیدا ہوئے ۔(۱)

وہیں درسی کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی کا سفر کیا اور وہاں سے لاہور چلے گئے۔علوم متعارفہ کو مختلف اساتذہ سے حاصل کیا۔حدیث کی تعلیم مفتی نور الحق بن عبدالحق بخاری دہلوی سے حاصل کی۔سلسلہ قلندریہ کو شیخ محمد فاضل حسینی سادھوروی سے حاصل کیا۔اور ان کے ساتھ ۱۳ ربرسوں تک رہے۔ پھر پھلواری شریف ۱۱۰۴ھ/ ۱۶۹۲ء میں آئے۔اور زہد وعبادت کا راستہ اختیار کیا۔ان سے شیخ مجیب اللہ بن ظہور اللہ جعفری پھلواروی اور بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا۔خانقاہ عمادیہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ (۲)

ڈاکٹر سید اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

سید عمادؔ الدین قلندر پھلواروی ۱۰۶۵ھ/ ۱۶۵۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء میں وفات پائی۔ پھلواری شریف کا مرکز فیض حضرت منہاج راستی کا قائم کردہ ہے۔آپ حضرت مخدوم بہار کے خلفاء میں سے تھے۔ پھلواری کا مرکز آٹھویں صدی ہجری مطابق چودہویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔حضرت عمادؔ قلندر پھلواروی اسی سلسلہ کے صوفیا میں تھے(حکیم محمد شعیب صاحب مرحوم کے گھر میں اس خاندان اصفیا کے ملفوظات ومخطوطات کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ میں نے مرحوم سے استفادہ کیا تھا) نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

پیچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر ٹک دیکھے کو ترساوے ہے

جب ستی چھوڑس کھانا پینا تیرا دوانہ الفت میں
خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کو کھاوے ہے

آوے اپنے ہاتھ وہ مورکھ نہیں عمادؔ اب اس کی آس
اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

حاشیہ پر درج ہے۔ بہار اور اردو شاعری، پروفیسر معین الدین دردآئی۔ص ۱۶، دردآئی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میرے خیال میں پھلواری شریف کے کسی مخطوطہ سے حضرت عمادؔ کا کلام حاصل ہوا ہے۔

دیگر ؎

جب بیچ چمن کے فصل بہار آوے ہے
تب جوش جنون تلوا مرا کھجلاوے ہے

رباعی ؎

یارب نگہہ عنایت ایدھر کردو
کانٹا ہے عمادؔ تم گل ترکردو
ہے رنگ گنہ سیتی رخ اس کا کالا
تم غازۂ عفو سین منور کردو

رسالہ معیارؔ، پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء، ص ۶۷ مخطوطہ کتب خانہ خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ

ان اشعار کے سلسلہ میں پروفیسر صدرالدین فضا شمسی تحریر کرتے ہیں:

کتب خانہ عمادیہ پٹنہ سیٹی میں عمادؔ کے کچھ اشعار محفوظ ہیں۔ جنہیں نگار اردو شاعری نمبر ۱۹۳۵ء اور معیار پٹنہ ماہ مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع کر دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے ظاہر ہے کہ عمادؔ کے اشعار کے خانقاہ عمادیہ میں محفوظ ہونے کی شہادت ان دونوں حضرات نے دی ہے۔ گرچہ یہ اشعار ابھی دستیاب نہیں ہیں۔ **(۳)**

مولانا احمد اللہ ندوی تحریر کرتے ہیں:

آپ ولیؔ دکنی متوفی ۱۱۵۵ھ کے ہم عصر تھے۔ حضرت عمادؔ نے ۱۰۸۱ھ میں بارہ صفحہ کا ایک مذہبی رسالہ بنام ''صراط مستقیم'' معروف بہ سید ہاراستہ بزبان اردو تصنیف فرمایا، جس کے آخر میں اردو کی یہ رباعی تحریر فرمائی۔

یارب نگہ عنایت اید ھر کردو — کانٹا ہے عمادؔ تم گل ترکردو
ہے رنگ گنہ سیتی دل اس کا کالا — تم غازہ عفو میں گل تر کردو

بروایت دیگر دوسرا شعر اس طرح ہے۔

ہے رنگ گنہ سیتی رخ اس کا کالا   تم غازہ عفوسیں منور کردو

یہ رسالہ راقم کو مولانا تمنا پھلواروی نے بزمانہ قیام حیدر آباد دکن دکھایا تھا۔

رسالہ صراط مستقیم کا اختتام اس عبارت سے ہوا ہے۔

'' اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد وعورت کے تئیں نیک کام کی توفیق دیویں۔اور ہر بورے کام سیتی (سے) بچاویں۔اوراس فقیر عمادالدین کے تئیں جو بیٹا شاہ برہان الدین کا ہے اوران دونوں کے مائے باپ کے تئیں اورسب مسلمان عورت مرد جیتے موئے کون اپنی کرم سیتی بخشد یویں۔اورسب کے گناہ سیتی درگذر فرماویں اور موے پیچھے اپنے حبیب رسولؐ کی شفاعت روزی فرمادیں آمین ثم آمین تمام ہوا یہ رسالہ صراط مستقیم معروف بہ سید ہاراستہ، بتاریخ ۲۲؍ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے ۱۰۸۱ھ (ایک ہزار اکاسی ہجری) میں۔(۴)

قاضی عبدالودود صاحب نے سید عمادالدین عماؔد پھلواروی کی شاعری کو بھی فرضی کہا ہے۔ڈاکٹر سید اختر اورینوی کی کتاب بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا پر تبصرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اعتراضات کئے ہیں:

(۱) ولادت سنہ ۱۰۶۵ھ وفات سنہ ۱۱۲۴ھ بحوالہ ک ۵۵ (یعنی تجلیات انوار) لیکن ایک تحقیقی مقالہ کے شایان شان یہ ہوتا کہ قدیم ترین سند جو مل سکتی تھی پیش کی جاتی۔

(۲) مصنف نے ان کا تخلص عماؔد بتایا ہے۔میں ان کی اردو شاعری کو فرضی سمجھتا ہوں۔فارسی کہتے تھے یا نہیں اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔شاید فارسی گوبھی نہ تھے تو تخلص کا سوال نہیں۔

(۳) اشعار اردو، سید ھاراستہ اور ک ۱۸ (یعنی بہار اور اردو شاعری) کے حوالے سے درج ہیں۔تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ سید ھا راستہ کی طرح ک ۱۸ (یعنی بہار اور اردو شاعری) کے اشعار بھی جناب تمنا ہی کہ ذریعہ سے پھیلے ہیں۔ان کی نظم ونثر پھلواری کے کسی اور شخص کے پاس نہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کے مذکورہ بالا اعتراضات کا تجزیہ پیش ہے۔

مذکورہ بالا اعتراضات میں سے نمبر (۱) میں کوئی وزن نہیں ہے۔ڈاکٹر اورینوی نے پھلواری

شریف کے کتب خانہ اور حکیم شعیب پھلواروی کے پاس موجود مخطوطات اور ملفوظات سے استفادہ کیا ہے۔اس لئے قدیم ترین اور جدید ترین حوالہ کی بات نامناسب ہے۔اسی طرح نمبر (۲) کے اعتراض کے لئے کوئی وجہ اور حوالہ درج نہیں کیا ہے۔اور نہ اس کے لئے کوئی دلیل پیش کی ہے۔انہوں نے صرف اپنا فرمان جاری کردیا ہے کہ ''میں ان کی شاعری کو فرضی سمجھتا ہوں۔'' جبکہ ڈاکٹر سید اختر اورینوی نے دلیل کے ساتھ اس کی تردید کی ہے۔وہ تحریر کرتے ہیں:

بعض افراد سجادؔ اور عمادؔ کے کلام کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔لیکن میرے نزدیک وہ سب اصلی ہیں۔حکیم شعیبؔ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ حضرت نورالحق تپاںؔ پھلواروی نے حضرت سجادؔ کے کلام کی نقل کی تھی۔تپاںؔ شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے پوتے اور حضرت سجادؔ کے داماد تھے۔نورالحق تپاںؔ کی تحریریں خاندانی دستاویزات میں ملتی ہیں اور پھلواری کے شاہ صاحبان میں معروف ہیں۔میں نے اور پروفیسر عسکری صاحب نے بھی تپاںؔ کی تحریریں حکیم شعیب صاحب مرحوم کے پاس دیکھی ہیں۔تپاںؔ کے بہت سے خودنوشت مرثیئے پھلواری میں موجود ہیں اور ہم نے دیکھے ہیں۔پھلواری کے صوفیا کے کلام ہرگز الحاقی نہیں۔اگر تذکروں میں ان میں سے بیشتر کا ذکر نہیں، تو یہ تذکرہ نگاروں کی نارسائی ہے۔اب جو مخطوطات و مسودات ہمارے سامنے آرہے ہیں۔تو حقائق پر سے پردے اٹھ رہے ہیں۔داخلی شہادت بھی کوئی ایسی نہیں جس کی وجہ سے ہم انہیں جعلی یا الحاقی سمجھیں۔بزرگوں کے کلام کو شاہ نعمت اللہ (۱۱۶۰ھ تا ۱۲۴۵ھ) پھلواروی نے بھی مرتب کیا ہے۔قدیم منقولات بھی موجود ہیں اور بعد میں ان قدیم منقولات سے نقلیں ہوئی ہیں۔حکیم شعیب صاحب مرحوم نے شواہد کے ساتھ میرے اور پروفیسر حسنؔ عسکری صاحب کے سامنے اس مسئلہ پر تشفی بخش روشنی ڈالی تھی اور ہم مطمئن ہو گئے تھے۔حضرت عمادؔ اور حضرت سجادؔ کے کلام کے مخطوطات یا منقولات پھلواری سے باہر اب تک دستیاب نہیں ہوئے۔

سید ھارستہ سید عمادالدین عمادؔ پھلواروی کی تصنیف ہے۔لیکن قاضی عبدالودودؔ صاحب اس کو جعلی سمجھتے ہیں۔اس سلسلہ میں ان کا اعتراض ملاحظہ ہو:

(۴) ''سید ھارستہ'' ایک مختصر سا مذہبی رسالہ ہے جسے جناب تمناؔ نے معیار میں اشاعت کے لئے دیا تھا، میں نے معیار کے شمارہ اول میں اسے شامل تو کر لیا تھا لیکن اس کے متعلق یہ لکھا تھا:

''خاتمہ میں کاتب کا نام نہیں، لیکن جناب تمناؔ کا بیان ہے کہ حضرت شاہ وجہ اللہ قلندر کا لکھا ہوا

ہے۔ یہ بظاہر کم از کم ستر اسی برس کا معلوم ہوتا ہے'''' کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مصنف کا لکھا ہوا بھی موجود ہے، جناب تمنا اس کی تلاش میں ہیں'''' اگر مصنف کا سال ولادت ۱۰۶۵ھ ہے تو ۱۰۸۱ھ میں مصنف کی عمر ۱۶ رسال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی، اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ گیارہویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لئے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا، کتاب کے خاتمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاہل کی زندگی اختیار کرنے کے بعد تصنیف ہوئی ہے، حالانکہ جو حالات تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں (اٹھارہ انیس برس کی عمر میں تعلیم کے لئے دہلی جانا، ۲۵ برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہونا اور دو سال سادھورہ میں درس دے کر واپس آنا) ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کا زمانہ سنہ ۱۰۸۱ھ کے بہت بعد ہوگا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی مذکورہ بالا تبصرہ پر تحریر کرتے ہیں:

میرے خیال میں قاضی صاحب کے شکوک باوزن نہیں۔ پھلواری شریف میں ہندوستانی بولی کی طرف توجہ ابتدا سے تھی۔ دراصل صوفی خانوادوں میں تبلیغ حق اور ترویج اسلام کی لگن تھی اور اس غرض کے لئے عام بول چال کی زبان کو ہی ذریعہ اظہار بنایا جاتا تھا۔ کسی نہ کسی کو تو ابتدا کرنی ہی تھی۔ اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے حضرت عمادؔ ہی موسس اول ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر یہ کوئی انوکھی ریت نہ تھی۔ دکنؔ میں صوفیائے کرام قدیم اردو میں مذہبی رسالے تصنیف فرما چکے تھے۔ دوسرا شبہ عمر کے متعلق ہے۔ یہ بھی محض وہم ہے، آپ کی سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غیر معمولی طور پر تیز وطباع تھے۔ گھریلو زبان میں مذہبی معلومات کے متعلق مختصر سا رسالہ لکھنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ آج بھی ۱۶ سال کی عمر میں ذہین افراد ادب وشعر کی تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ اس عمر میں ڈگری کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اچھے خاصے مضامین لکھتے ہیں۔ تیسری بات تاہّل کی زندگی کے متعلق ہے۔ اس میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں۔ چودہ، پندرہ سال کی عمر میں بھی بعض شادیاں ہوجاتی ہیں۔ ممکن ہے حضرت عمادؔ کی شادی بھی پندرہ سولہ سال کے سن میں ہوئی ہو۔ اور آپ نے ''حسب فرمائش اہل خانہ خود'' رسالہ صراط مستقیم معروف بہ سیدھا رستہ، شادی کے بعد لکھا ہو۔ تکمیل تعلیم کے لئے آپ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں دہلی گئے۔ ۱۱۰۴ھ میں آپ مستقلاً وطن واپس آئے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ دوران تعلیم وہدایت بھی وطن آتے رہے ہوں۔ ہوسکتا

ہے آپ کی دو شادیاں ہوئی ہوں۔ میرے خیال میں ''سیدھا رستہ'' کی تاریخ تصنیف اور مصنف کے متعلق کوئی قباحت پیدا نہیں ہوئی، کتب خانہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، شہر پٹنہ والے نسخہ کے متعلق خود قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بظاہر کم از کم ستر، اسی برس قبل کا لکھا ہوا ہے۔'' (معیارؔ)

ہر چند کہ رسالے کے خاتمے پر کاتب کا نام درج نہیں لیکن بقول جناب تمنا پھلواروی۔ یہ نسخہ حضرت شاہ وجیہ اللہ قلندر (۱۲۱۱، ۱۱۸۲ھ) خواہرزادہ حضرت شاہ نور الحق طپاںؔ پھلواروی کا لکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے خط سے رسالہ ''سیدھا رستہ'' کا خط ملتا ہے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پھلواری شریف کے صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت اور تبلیغ و ترویج اسلام کے لئے حضرت عمادؔ کے وقت سے مسلسل اردو زبان کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضرات عمادؔ، سجادؔ، آیت اللہ جوہریؔ، نور الحق طپاںؔ، ظہور الحق ظہورؔ، وغیرہم۔ لہٰذا اس سنہری زنجیر کی پہلی کڑی کے متعلق وہم و شک میں مبتلا ہونا صحیح نہیں، حقیقت یہی ہے کہ سیدھا رستہ سے قدیم تر نمونہ ادب اس صوبہ میں اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

رسالہ سیدھا رستہ مولانا تمنا عمادی کے ساتھ پاکستان چلا گیا۔ جس کو پاکستان میں مولانا حکیم احمد اللہ ندوی نے بھی دیکھا اور اس کا تذکرہ اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں کیا ہے۔ سیدھا رستہ کے سلسلہ میں قاضی صاحب مزید تحریر کرتے ہیں۔ سیدھا رستہ کی عبارت ہے کیسو پیر بزرگ سیتی حاجت مراد مانگنا، کیسو کی درگاہ یا مزار او پر منت مراد مانگنا، کیسو کی قبر چومنا یا قبر کی خاک منھ یا کلیجہ پر لگانا اور ملنا، قبر پر چادر شرنی چڑھانا، یہ سب شرک اور حرام ہے'' کیا مصنف ثابت کر سکتے ہیں کہ اس عبارت میں جو عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے، واقعی ان بزرگ کا تھا جن کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے۔ (۵)

قرآن اور احادیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سیدھا رستہ کی عبارت قرآن و حدیث کے مطابق ہے۔ اور یہی عقیدہ تمام بزرگان دین کا تھا، ان کا بھی عقیدہ یہی رہا ہوگا جو کتاب میں مذکور ہے۔ قاضی صاحب نے جس عقیدہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی ابتدا بہت بعد میں ہوئی۔ اس طرح عقیدہ کی بات کا ذکر کر کے سیدھا رستہ کو جعلی قرار دینا تحقیق کے خلاف ہے۔

عماد پھلواروی نے ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء میں پھلواری میں وفات پائی۔

(۲)
ملا محمد علیم تحقیقؔ عظیم آبادی

محمد علیم نام، تحقیقؔ تخلص۔ خلف میر بدیع الدین سمرقندی عرف میر میتن ۱۰۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ تحقیقؔ عالم تھے، معقولات ومنقولات سے آگاہ۔ فن موسیقی کے ماہر تھے۔ اور تیر اندازی میں کامل۔ مرزا معز موسوی خان فطرت سے تلمذ حاصل تھا۔ فطرت ۱۰۸۲ھ میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ عظیم آباد میں دیوانی پر مامور تھے۔ تحقیق نے مرزا موسوی کے آگے زانوے شاگردی تہہ کیا۔ تحقیقؔ کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ دلی اور بنگال کا سفر اختیار کیا۔ پھر اپنے وطن واپس آگئے۔ زین الدین خاں ہیبت جنگ کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ عظیم آباد کے امراء وحکام ملا صاحب کو بہ عزت اپنے ساتھ بیٹھاتے تھے۔ (۶)

پروفیسر معین الدین دردائی تحریر کرتے ہیں:

ملا محمد علیم تحقیقؔ ہی کے ہم عصر سید عماد الدین عمادؔ (۱۰۶۵ھ تا ۱۱۲۴ھ) اور غلام نقشبند سجادؔ (۱۱۱۶ھ تا ۱۱۷۳ھ) ہیں۔ (۷)

مزید تحریر کرتے ہیں:

بعد مورخین نے مرزا بیدلؔ کے سر پر اولیت کا تاج رکھا ہے۔ لیکن ملا محمد علیم تحقیقؔ عظیم آبادی بیدلؔ سے پہلے گذرے ہیں۔ (۸)

ملا محمد علیم تحقیقؔ بیدلؔ سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں گذرے ہیں۔ بیدل کی پیدائش ۱۰۵۴ھ اور وفات ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔ جبکہ تحقیق کی ولادت ۱۰۷۰ھ اور وفات ۱۱۶۲ھ میں ہوئی۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

سر جن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دھاہے　　دیکھا ہوں جو تجھ مکھ کون نینا میرے چندھرا ہے

دیگر ؎

جمکھڑا باندھ دلمون سماجا　　سلو نورے ایدھر کون آجا

حمید عظیم آبادی نے اشعار کو یوں نقل کیا ہے:

جمکھڑا باندھ کر دل مون سماجا　　سلونو سانورے ایدھر کو آجا

دیگر ؎

سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دیا ہے　　　دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کون نینا میرے چندھرا ہے

(۹)

ملا محمد علیم تحقیق کا انتقال ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ میں ہوا۔

(۳)

تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ قادری

شیخ عالم فقیہ مجیب اللہ بن ظہوراللہ پھلواروی اپنے وقت کے مشہور عالم اور بزرگ تھے۔۱۱/ربیع الاول ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۴/فروری ۱۶۸۷ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ابتدائی کتابیں اپنے پھوپھا شاہ برہان الدین سے پڑھی۔ پھر حضرت خواجہ عماد الدین قلندر کے حلقہ درس میں رہے۔ پھر بنارس کا سفر کیا۔اور حضرت مولانا سید محمد وارث رسول نما بنارسی کی خدمت میں زانوے ادب تہہ کیا۔اورانہیں سے بیعت اور اجازت حاصل کی۔خواجہ عماد الدین قلندر کی وفات کے بعد پھلواروی میں مستقل اقامت اختیار کرلیا۔خواجہ عمام الدین قلندر نے آپ کو اجازت دے کر مریدین ومعتقدین کی تعلیم وتربیت کی خدمت سپرد کی۔آپ نے خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جو خانقاہ مجیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔**(۱۰)**

آپ کے کچھ اشعار ریختہ میں دستیاب ہیں۔ان کے یہ اشعار خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سفینوں میں ابھی بھی محفوظ ہیں۔

اشعار ملاحظہ ہو ؎

اٹھ جا پھرے کس فکر میں، آخر بسیرا گور ہے　　　رہتا نہیں کیوں ذکر میں، آخر بسیرا گور ہے
یوں رہتے کیا پچھتاوے گا آخر تو مرجاوے گا　　　اس گور میں پرلاوے گا، آخر بسیرا گور ہے
بشنو نصیحت اہل ہے، یہ زندگی سہل ہے　　　غافل جو رہتا جہل ہے، آخر بسیرا گور ہے
ساتھی جو تیرے چل بسے تجھ لوبھ کے پھندے پھنسے　　　تجھ دیکھ کر مور کھ ہنسے، آخر بسیرا گور ہے
دھرتی کہے تو پاؤں ناں تجھ کو جو مجھ میں آوں ناں　　　بھولا جو میں سمجھاؤں ناں، آخر بسیرا گور ہے

آیا جو تو کس چاؤ سیں، جاوے گا تو کس بھاؤ سیں　　ماٹی پڑے دھڑ پاؤں سیں، آخر بسیرا گور ہے
آیا جو تو کس کارنے، جاوے گا تو کس مارنے　　کیا آیا تھا جی ہارنے، آخر بسیرا گور ہے
اس نفس نے اندھا کیا سرتا قدم گندا کیا　　اپنا جو لی پیدا کیا، آخر بسیرا گور ہے
جگ میں بسے تم آئے کر، من کوں رکھا بھولا مگر　　کس نے کہیں سمجھا مگر، آخر بسیرا گور ہے
کیسی عمر ضائع کری تونے جو کچھ ناقص رہی　　چلنے کی بریا آپڑی، آخر بسیرا گور ہے
(۱۱)

(۴)

قاضی عبدالغفار غفاؔ

قاضی عبدالغفار غفاؔ پٹنہ ضلع کی ایک بستی رہوئی کے رہنے والے تھے۔ غفاؔ کے کلام میں صوفیانہ خیالات اور ہند کی بھگتی تحریک کا اثر نمایاں ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ایسی فضا بندھتی ہے کہ ہم عالم تخیل میں میراؔ، نام دیو، نانک اور کبیر کی دنیائے جذبات میں پہنچ جاتے ہیں۔ (۱۲)

ان کی تصنیف جواہرالاسرار ہے جس کو پروفیسر معین الدین دردائی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کے سلسلہ میں پرفیسر معین الدین دردائی لکھتے ہیں:

یہ تصوف کی ایک منظوم کتاب ہے۔ جو ۱۱۱۶ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔ اس کی زبان خاصی صاف ہے۔ البتہ سجادؔ وغیرہ کی طرح اس میں بھی مگدھی زبان کا عنصر بہت زیادہ شامل ہے۔ اس کتاب کی زبان اور زبان سے زیادہ اس کا نفس مضمون مجھے اس درجہ پسند آیا کہ میں نے ایک مقدمہ کے ساتھ اس کو ۱۹۳۷ء میں شائع کر دیا۔ (۱۳)

نمونہ کلا حسب ذیل ہے ؎

ظاہر دھوئے پاک نہ ہوئے　　پاک ہوئے جب باطن دھوئے
جہین معراج نمازی سوے　　بن معراج نماز نہ ہوئے (۱۴)

کہے غفاؔ، سنسار مون دیس بدیس　　سائیں آپے آپ کو سوائے مانک بھیس

آگ پڑے تن پیم کے جل بل بوجھا جیو　　کہے غفاؔ تم آگ مون دے جیو پایا پیو

کہے غفاؔ سن کان دے ایسے آیا ہاتھ　　مورت صورت رنگ کا لے گیا سائین ساتھ

کہے غفاؔ سبھ خوب سے جگ مون ایہی پاپ　　پر گٹھ ہوا پیو اور کچھ لوگ کہاویں آپ

غفاؔ سمندر پیم کا دیکھا غوطہ مار　　جو تھے موتی بھید کے آے ہمارے ہاتھ

کہے غفاؔ جنھ دیکھا دوئی　　پیم پتھ مون مشرک ہوئے

کہے غفاؔ جنھ آ بھلایا　　تن سائین کا درشن پایا

(۱۵)

(۵)

شاہ غلام نقشبند سجاؔد پھلواروی

شاہ غلام نقشبند نام، اور سجاؔد تخلص۔ والد کا نام شاہ عمادالدین قلندر قصبہ پھلواری شریف میں ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ تمام درسی کتابیں شیخ مجیب اللہ سے پڑھی۔ انہیں سے طریقت کا علم حاصل کیا۔ سجاؔد بچپن سے ذہین و ذکی واقع ہوئے تھے، اور طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ریختہ کا کلام قدامت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کا کلام رسالہ ''معاصر'' پٹنہ میں شائع ہوا۔ ان میں سے چند پیش ہیں ؎

مری حسرتیں دل میں گھبرا تیاں ہیں　　نکلنے کی راہیں نہیں پاتیاں ہیں
تری مست آنکھوں کی یہ پتلیاں تو　　تماشا قیامت کا، دکھلا تیاں ہیں

ادھر بدلیاں ہیں، ادھر میری آنکھیں وہ پانی، تو یہ اشک برساتیاں ہیں
صلاح اپنی آنکھوں کی اے دل سنیں کیا کوئی کام کی بات بتلا تیاں ہیں
خدا رابتادیں توٹک ہم کو سانسیں کہاں آیتاں ہیں کہاں جاتیاں ہیں
ارے یاس یہ حسرتیں ہیں جو میری ترا نام سن سن کے گھبراتیاں ہیں
بنیں جو کہ تیر بلا کا نشانہ فقط اہل دل ہی کی وہ چھاتیاں ہیں
سر بزم دکھلاویں ہیں بسکہ شوخی وہ آنکھیں جو خلوت میں شرماتیاں ہیں
امیدیں جو مہماں ہیں میرے دل میں لہو پیتیاں ہیں، جگر کھاتیاں ہیں
سنا ہوں کہ اکثر نگاہیں تمہاری مرے قتل کے بعد پچھتا تیاں ہیں
مواجائے سجادؔ ہی جس کے غم میں وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آتیاں ہیں

بھٹی کو چلا کیا، ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجادؔ ستی تھارات تلک تو کام اس کو اشغال ستی اور ادستی
ٹک میری طرف سے بادصبا جا کر کہہ صیادستی اب جان لبوں پر بلبل کے پہنچی ہے تیری بیدادستی
تنہائی فرقت میں کیا کیا اپنا نہ یہ دل گھبراوے ہے بہلے ہے جوٹک یہ ناشدنی تو صرف تمہاری یادستی
جب آگ دھندھکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہوا ے یار واک، ناشادستی
اے بادسحر! اے موج صبا! لے جلد ہماری آ کے خبر نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امدادستی
سن پایا ہے اس نے، دل میرا کعبہ ہے گھر اللہ کا ہے اب کھود کے اسکو پھنکوادے وہ بت نہ کہیں بنیادستی
جودیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے، پچھتاوے اور افسوس کرے بتلا دو کوئی کریں شکوہ کیا، ایسے ستم ایجادستی
ٹھانا تو بہت، اب جاویں گے، ہر گز نہ کسو کے کوچے میں ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشادستی
توڑا ہے وہ کب کا تقویٰ کو، بھٹی میں تو اوس کی گذرے ہے سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھ اب سجادؔ ستی

سمجھاؤں ہوں یہی دل ناکام کی تئیں آغاز بیچ سوچ انجام کے تئیں
چرخ بریں فرود ہے زینے ستی ترے بولیں ہیں عرش لوگ ترے بام کے تئیں
کیا جاویگا بگڑ کہیں قدرت کا ہاتھ ٹک دیوے پلٹ جو گردش ایام کے تئیں

سودا کرے ہے غم کا جو بازار عشق بیچ — سود کھ کے بھاؤ بیچے ہے آرام کے تئیں
واعظ سنادے سدرہ طوبیٰ کی گفتگو — ہم چاہیں اپنے سرو گل اندام کے تئیں
بولے ہے شیخ مجھ ستی ساقی کو کہہ دو تم — ایدھر کو بھی بڑھاوے کسو جام کے تئیں
واہد کرے ہے کعبہ میخانہ کا جو حج — رنگے ہیں مئے میں جامہ احرام کے تئیں
بھاوے نہیں ہے شیخ کی صحبت یہ میکشو — بیٹھا دو ساتھ مت کسو بدنام کے تئیں
سجادؔ کا ہے کھینچے ہے تو آہ نارسا — توڑے ہے کوئی بھی ثمر خام کے تئیں

یہ بولے کیا کہ ''رہے گھر میں بھی کوئی کہ نہیں — ملے حضور سے اب در میں بھی کوئی کہ نہیں؟
جنون عام ہے ایسا! بہار سے پوچھو — کہ رہنے پاوے گا اب گھر میں کوئی کہ نہیں؟
تھی اوس کی فوج بھی، نوکر بھی اور چاکر بھی — گیا مزار سکندر میں بھی کوئی کہ نہیں؟
سنا تو وامقؔ وفرہادؔ و قیسؔ کے قصے — موا ہے عشق پیمبر میں بھی کوئی کہ نہیں؟
اڑے جہاں میں لاکھوں کے مرغ جاں لیکن — ہے دام زلف معنبر میں بھی کوئی کہ نہیں؟
غریب جان کے سجادؔ کو جو مارے ہو — تو تم سے پوچھے گا محشر میں بھی کوئی کہ نہیں؟

ہجر کی رات بہت بھاری ہے — عشق کی بات بہت بھاری ہے
بھیج دیویں نہ کلیجا اپنا — یہ ہی سوغات بہت بھاری ہے
الٹی جاوے ہے بسات دل اب — ایسی تو مات بہت بھاری ہے
نامہ شوق کا آیا یہ جواب — اب ملاقات بہت بھاری ہے
نفی کے بعد ہے اثبات صحیح — خالی اثبات بہت بھاڑی ہے
کل جو بوجھا تھا بہت ہی ہلکا — آج ہیہات بہت بھاری ہے
خو گر غم کے تئیں بھی سجادؔ — غم مافات بہت بھاری ہے (۱۶)

جب موسم گل آن کے تائید کرے ہے — تب جوش جنوں عقل کی تردید کرے ہے

پرویز و نل و کوہکن و وامق و مجنوں — جو ہے وہ میرے بات کی تقلید کرے ہے
اٹھے گا یہاں پھر نہ کبھی شور تمنا — دل ہیچ یہی یاس اب امید کرے ہے
جو ہیچ محبت کے فنا ہووے ہے اے دل — حاصل وہی تو ہستی جاوید کرے ہے
جس روز کے پہنچے ہے نئی کوئی مصیبت — اس روز تیرا خوگر غم عید کرے ہے
رکھے ہے جبیں در پہ تیرا گنبد گرداں — سجدے تیرے دروازے پر خورشید کرے ہے
گردسم رہوار ترا پہونچے ہے جس جا — ہیبت سے وہاں خنگ قمر لید کرے ہے
قاصد کے تئیں چاہئے کہد ے جو کہن ہیں — کیوں اپنی طرف سے کوئی تمہید کرے ہے
سجاؔد، جو سمجھا ہے خود اپنے تئیں موجود — وہ فہم نہیں، معنئ توحید کرے ہے

(۱۷)

قاضی عبدالودود نے سجاؔد کی شاعری کو قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے۔ان کے اعتراضات کا تفصیلی تجزیہ گذشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔تحقیق کی روشنی میں سجاؔد کا کلام اصلی ہے۔

شاہ سجاد کی وفات ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں ہوئی۔

(۶)
مولانا شاہ نورالحق تپاںؔ پھلواروی

شاہ نورالحق نام، تپاں تخلص۔مولانا شاہ عبدالحق بن تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ کے صاحبزادے تھے۔آپ کی ولادت ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء میں ہوئی۔کتب درسیہ مولانا وحید الحق ابدال سے تمام کیا۔حضرت شاہ غلام نقشبند کی وفات کے بعد ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء میں خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشیں ہوئے۔آپ نے اس خانقاہ کو بہت ترقی دی۔

بچپن ہی سے شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔تپاں تخلص کرتے تھے۔طبیعت نزاکت پسند اور خیالات بلند تھے۔آپ کا دیوان دوجلدوں میں دست خاص کا لکھا ہوا خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں موجود ہے۔قصائد و مراثی کے چند اجزاء دست خاص کے لکھے ہوئے، نیز تصوف وملفوظات کے چند رسالے کتب خانہ مجیبیہ میں بھی موجود ہیں۔ (۱۸)

حضرت شاہ نور الحق تپاںؔ پھلواروی اکابر علماء وصوفیاء میں تھے، علمی فضل وکمال کے ساتھ زہد وتقویٰ میں بھی بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ ادب وانشا میں آپ کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی تھیں۔ آپ کے فارسی دیوان اور اردو کلام کا ایک اچھا ذخیرہ قلمی صورت میں خانقاہ سلیمانیہ میں محفوظ ہے۔ حضرت تپاںؔ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حضرت غلام نقشبند کے شاگرد تھے۔ **(۱۹)**

ڈاکٹر سید اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

''اوراد ووظائف کے مختلف رسائل کے ماسوا فارسی کے دو کلیات ضخیم آپ کی تصانیف سے ہیں۔ ایک بیاض ضخیم اردو مراثی کی ہے'' (بلخی) مراثی کی ایک بیاض میری نظر سے گذری ہے۔ یہ مجھے خانقاہ سلیمانیہ پھلواری سے حاصل ہوئی تھی۔ اس بیاض میں شاہ ظہورؔ الحق کے مرثیہ بھی ہیں۔ حکیم شعیب صاحب مرحوم کا یہ قول ہے کہ بیاض میں خود نوشتہ مرثیے ہیں۔ طپاںؔ اور ظہورؔ کی شان تحریر مرحوم بخوبی پہنچانتے تھے۔ طپاںؔ کے مرثیوں کی ایک دوسری قلمی بیاض پٹنہ سٹی کی خانقاہ میں ہے۔ پروفیسر ذکی الحق صاحب سلمہ بی۔ این۔ کالج نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں دوسری بیاض کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ میں نے جو قلمی بیاض دیکھی ہے، اس کے مرثیوں کے اختتام پر تاریخ تصنیف یوں درج ہوتی ہے: ''غمناک شدفی سنہ'' فلاں یا ''المناک شدفی سنہ'' فلاں یا ''خوبنار شدفی سنہ'' فلاں۔

جناب محی الدین تمناؔ پھلواروی نے طپاںؔ کی ۲۱ رغزلیں قلمی بیاضوں سے نقل کر کے رسالہ معاصر، پٹنہ میں شائع کروائی تھیں۔ **(۲۰)**

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

جو کام تیرا ہے سو کر، رٹ یعنی نام اللہ کا
کر لیوے گا اللہ جو ہووے گا کام اللہ کا

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا — بیٹھا منہ پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا
عقل کو چھوڑ دیا تو نے تو ہوشیاری کی — پڑ گیا نام طپاںؔ کیونکر دیوانہ تیرا

عزم آنے کا جو وہ اے دل بیتاب کریں — فرش ہم راہ میں جا دیدہ بے خواب کریں
لے لیا ہے تو کریں قدر بھی میرے دل کی — آپ برباد نہ یہ گوہر نایاب کریں

بیچ دیویں گوہر دل کیوں نہ اوس دلبر کے ہاتھ — قدر جوہر ہے لگے گر صاحب جوہر کے ہاتھ
جھک نہ آوے دست بوسی کیلئے پیر فلک — لو نہ انگڑائی خدارا دونوں اوپر کر کے ہاتھ

مارتے ہیں نظر کے بھالے سے — اور دیکھے میں بھولے بھالے سے
چارہ گر! ٹک سمجھ سے بھی لے کام — موت ٹلتی نہیں ہے ٹالے سے
مونہہ سے خم ہی لگا دے اے ساقی — کون پیتا رہے گا پیالے سے
اپنی کملی ہی میں مگن ہیں تپاںؔ — کام کیا شال سے دوشالے سے

پانی کی جگہ مئے تھی تو مٹی کی جگہ درد — سرمست ازل سے ہے مری آب بھی گل بھی
ہم جان رہے تھے کہ فقط زلف ہے آفت — واللہ غضب ہے ترے رخسار کا تل بھی

اِک خواب سے بڑھ کر نہیں یہ ہستی موہوم — وہ خواب جو شرمندہ ہے تعبیر کے آگے

جی تو چاہے ہے بہت قاتل! مگر — ہائے کب جی بھر کے تڑپا جائے ہے
تیرے عاشق، تیرے شیدائی کا یہ حال — ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے
لگ گئی ہے آگ سی سینے کے بیچ — اور دل کمبخت بجھتا جائے ہے
کب مٹے ہے دل سے یارو روئے یار — سر سے کب زلفوں کا سودا جائے ہے
منزل مقصود پاوے ہے وہی — جو ترے رستہ میں کھویا جائے ہے
اُٹھ رہا ہے درد دل جب بار بار — دل سے پوچھو کا ہے بیٹھا جائے ہے
اب بلاوا آرہا ہے یار کا — دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے

(۲۱)

رسالہ معاصر پٹنہ بابت ۱۹۴۱ء میں مرقوم ہے کہ راسخؔ عظیم آبادی نے ایک قطعہ لکھ بھیجا تھا۔ سوال ''سانس'' کی تذکیر و تانیث کا تھا، وہ قطعہ یہ ہے:

نیر اوج طریقت شمع بزم ابتدا   پیرومرشد و کعبہ ہمارے مقتدا
دست بستہ عرض ہے باصد ادب بعد از سلام   کل سنا بھائی سے آنحضرت کا کچھ اردو کلام
کیا کرے فدویؔ بیاں جو کچھ اٹھایا اس نے حظ   جانے ہے دل ہی کچھ اسکو جس نے پایا اس سے حظ
ہے مگر اک عرض جس نے پائی ہے شکل سوال   استفادے کے سوا کیا ورنہ فدویؔ کی مجال
سانس کو حضرت نے باندھا ہے مونث اک جگہ   میرؔ کا تذکیر والا شعر ہے پیش نگہ
ہو سند تانیث کی بھی گر کوئی حضرت کے پاس   بھیجدیویں اپنے اس پروردۂ نعمت کے پاس

(۲۲)

اس کے جواب میں شاہ نورالحق تپاںؔ نے جو قطعہ لکھا وہ یہ ہے:

میر کیا استاد بھی بولے جو کوئی میرؔ کا   میں کبھی قائل نہ ہوں گا سانس کی تذکیر کا
حضرت سجادؔ کو تانیث اس کی تھی پسند   میرؔ پر ترجیح ان کو دیوے گا ہر عقلمند
شعر درج ذیل ہے حضرت سجادؔ کا   جو سخن تھے آپ کے استاد کے استاد کا

وہ شعر حضرت سجادؔ کا یہ ہے:

خدارا بتادیں تو ٹک ہم کو سانیں   کہاں آتیاں ہیں کہاں جاتیاں ہیں؟

(۲۳)

نوٹ: بہت سی جگہوں پر تپاںؔ (ط) سے تحریر ہے۔

دورِ متوسطین

دورِ متوسطین

اس دور میں اردو شاعری ترقی کے بہت سے منازل طے کر کے آئی ہے۔اور طے کرتی نظر آرہی ہے۔اس دور میں زبان میں کافی صفائی آ گئی ہے۔ پرانی ترکیبیں دھیرے دھیرے متروک ہوتی نظر آرہی ہیں۔ خیالات میں پاکیزگی ہے۔ساتھ ہی مضامین میں رنگا رنگی بھی۔ایہام گوئی اور عامیانہ خیالات سے علماء کی شاعری بالکل پاک ہے۔وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے فلسفوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔فارسی اور عربی شاعری کے اثرات اس دور کے علماء کے شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔عشق حقیقی اور عشق مجازی کا واضح تصور موجود ہے۔حسن وعشق کو مختلف انداز پر پیش کیا گیا ہے۔علماء نے اپنی شاعری میں اپنے محبوب کو عریاں کر کے رسوا نہیں کیا۔ بلکہ اس کو راز بنا کر راز ہی رکھا۔استعارہ، کنایہ، صنائع وبدائع اور فصاحت وبلاغت کا پورا لحاظ اس دور کے علماء کی شاعری میں موجود ہے۔اس دور کے علماء نے ہیئت وموضوع کو بھی وسعت دی۔لسانی اعتبار سے زبان کی قدامت کو بھی دور کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ بھی اس دور کے علماء کی شاعری سے عیاں ہے۔

چند علماء کی مختصر سوانح اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں

(۱)

مولانا شاہ ابوتراب آشناؔ پھلواروی

شاہ ابوتراب نام، آشناؔ تخلص ۔قصبہ پھلواری شریف وطن مالوف۔حضرت شاہ نعمت اللہ کے صاحبزادے ۔اور حضرت شاہ مجیب اللہؒ کے پوتے تھے۔۲۷ر شوال بروز سہ شنبہ ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۹ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔مولانا احمد ابن وحید الحق پھلواروی سے علم حاصل کیا۔اپنے والد سے طریقت کا علم حاصل کیا۔اوران کے ساتھ ایک مدت تک رہے۔

قادرالکلام شاعر تھے۔تاریخ گوئی میں غیر معمولی مہارت تھی۔آپ کے تاریخی قطعات فارسی میں زیادہ ہیں۔اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔آپ کے اردو کلام میں فصاحت ومعنویت موجود ہے۔

۷ر ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء میں پھلواری شریف میں وفات پائی۔مقبرہ مجیبیہ میں دفن کئے گئے۔(۲۴)

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

شب جدائی سے ترے دل کس قدر بیتاب تھا　　دل نہ تھا سینہ میں میرے پارۂ سیماب تھا
شب بجائے آب جاری چشم سے خوں ناب تھا　　دیدہ خون گریہ ہے ہم رنگ پر سرخاب تھا
ڈوب مرنے کی جگہ ہے یہ کہ سیل اشک کو　　میں کہوں تھا سر سے بالا وہ کہے پایاب تھا
بحر غم سے تھا نکلنے کا مرے اسلوب کون　　موج نے پھیکا اسی جانب جدھر غرقاب تھا
عشق پیچاں عاشقوں کے قبر کی پہنچان تھے　　چادر گل کے عوض رکھنا گل لیلاب تھا
جب تلک دشت جنوں میں میں رہا سرسبز تھا　　آبلہ پا سے مرے جو خار تھا شاداب تھا
نالہ وافغاں مرا پہنچا نہ اس کے کان تک　　آہ وزاری میں یہاں شب کٹ گئی واں خواب تھا

آشناؔ پیدا کرو کچھ حال چھوڑو قال کو
قال تیرا اگرچہ مرغوب دل احباب تھا

بے پروبال اب ترستے ہیں　　جن کے پر ہے مزااڑاتے ہیں
لب شیریں کا تیرے سن کرشور　　خوبرو تجھ پہ زہر کھاتے ہیں
پیچ میں اس کے زلف کے ہم سے　　ہیں پڑے پیچ وتاب کھاتے ہیں
تیرے درکی جو چھانتے تھے خاک　　اب تو وہی کیمیابناتے ہیں
جب سے پردہ نشیں ہوئے ہیں وے　　خواب میں بھی نہیں وے آتے ہیں
کیونکراس غنچہ لب سے بات کریں　　ہم نہیں کوئی راہ پاتے ہیں
تیرے کوچہ میں بیٹھے ہیں ووہی　　سر پہ جو سو بلااٹھاتے ہیں
لب شیریں کے گھاٹ پراب تو
آشنؔا بار بار آتے ہیں

ہے شرف ہم کو کہ ہیں اس در کے خانہ زاد ہم　　اس غلامی سے نہ ہوں یارب کبھی آزاد ہم
جوش آہنگی نہ رنگ بال وپر کچھ بھی نہیں　　ہیں گرفتارقفس کس بات پر صیاد ہم
مرگئے حسرت میں آزادی کے پرچھوٹے نہیں　　کیاقفس ہی کے لئے پیدا ہوئے صیاد ہم
ہم اگر کہلائیں اس مولائے عالم کے غلام　　شکر میں اس کے کریں لاکھوں غلام آزاد ہم
عہد سے مجنوں کے بڑھ کرآشنؔا کے عہد میں　　دیکھتے ہیں خاندان عشق کو آباد ہم

وہ جفا پیشہ ہے کام اس کا ستم رانی ہے　　اس سے امید وفارکھنی ہی نادانی ہے
کیا کہا تونے صبا کہہ تو، چمن میں کیوں آج　　غنچے کو تنگدلی ،گل کو پریشانی ہے
تیری ہی آنکھوں میں ہم خار ہیں زاہد ورنہ　　بزم رنداں میں مری خوب قدردانی ہے
ہاتھ سے عشق کے بچنے کی امید نہیں　　سینہ افگار ہے،دل خوں ،جگر پانی ہے
آشنؔا دیدۂ ودانستہ دیا تو نے دل　　اب شکایت ستم یار سے نادانی ہے

سر ہے اپنا،اور تیغ یار،ہونی ہوسوہو　　جان رہے یا جائے،اب کی بار ہونی ہوسوہو

گہ نہ رہنے پائیں اس کوچے میں لیکن جائیں گے	جب تلک ہے طاقت رفتار ہونی ہوسو ہو
ہم سے کوئے یار کو جانا نہ چھوٹے کا کبھی	جو ستم چاہیں کریں اغیار ہونی ہوسو ہو
آشنا سہنا جفا اغیار کی، پر ہاتھ سے	چھوڑ یئے نہ دامن دلدار، ہونی ہوسو ہو

(۲۵)

(۲)

مولانا انور علی یاس آروی

شیخ انور علی نام، یاس تخلص۔ شیخ محمد حیات کے فرزند۔ شہر آرہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر آرہ میں حاصل کی۔ پھر عظیم آباد آئے اور قاضی عباس علی سے متداول علوم کی کتابیں پڑھیں۔ نہایت ہی ذہین وفطین تھے۔ اپنے بھائی مولانا کرامت علی کے انتقال کے بعد آرہ شہر کے مفتی مامور کئے گئے۔ مفتی عدالت آرہ کی خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

۲۵ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ اور عظیم آباد میں مدفون ہوئے۔ (۲۶)

تحصیل علم کے زمانہ میں شعر وسخن کا شوق پیدا ہوا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمانے لگے۔ اس وقت شہر عظیم آباد میں استاد وقت شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کی اردو شاعری کا غلغلہ تھا، جو میر تقی میر دہلوی کے صحبت یافتہ اور شاگرد تھے۔ یاس آروی نے راسخ عظیم آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور اپنا اردو کلام دکھانے لگے۔ استاد اور شاگرد میں رفتہ رفتہ ارتباط بڑھتا گیا۔

جناب یاس آروی کے داماد مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی اور مولوی علی اکرم آروی نے مشترکہ کوششوں سے یاس آروی کے فارسی اور اردو منظوم کلام اور چند فارسی مکتوبات کو یکجا فراہم کر کے ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی کانپور میں ۲۵۰ صفحات پر شائع کیا۔ اور اس کا نام دیوان انور علی یاس رکھا۔ اس دیوان کے آخر میں مولانا محمد سعید حسرت نے حضرت یاس کے حالات بھی قلم بند کردیئے ہیں۔

یاس آروی کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

آخر اس کے سب تماشائی ہوئے	جو ترا محمو تماشا ہوگیا

عشق میں حال دل ودیدہ نہ پوچھ ایک صحرا ایک دریا ہوگیا
چشم ترلب خشک،اور چہرہ اداس یاسؔ یہ کیا حال تیرا ہوگیا؟

پلٹتی رہتی آہ آتشیں ہے سینہ ولب تک بنایا تو نے اے ضبط فغاں دولاب آتش کا
دل سوزاں کی آگ ان آنسوؤں نے اور بھڑکائی ترقی بخش ہے روغن صفت یہ آب آتش کا
تومل اس شمع رو سے یاسؔ گو جاں کا ضرر ہوئے کرے ہے خوف کب پروانہ بیتاب آتش کا

دیجیو ہر چاند رات میری نیاز میں ہوں کشتہ ہلال ابرو کا
میں ہوں گا تمہارا دامنگیر داغ مت دھوو میرے لو ہو کا

اصلاح خط کو آیا تھا پران کے منہ کو دیکھ حیراں مثال آئینہ حجام رہ گیا

چین ابرو قاتل سے نکل جائے تو اچھا ہے راست کہ تلوار سے بل جائے تو اچھا
خطرا ہی رہے ہے مجھے اس شیشہ دل کا اے عشق! تری آنچ سے گل جائے تو اچھا
تیری ہی تجلی نہ ہو جب خانہ دل میں آگ اس میں لگے اور یہ جل جائے تو اچھا

ایمان کا نور گور کے جانے کو ہے ضرور ایسے اندھیرے گھر میں نہ رکھ بے چراغ پا
وے خوب تھے کہ تنگی دنیا کے ہاتھ سے پھیلا کے سوئے قبر میں جو بافراغ پا
آواز نہ جرس کی نہ نقش قدم ہے یاں کیونکر رکھوں میں رہ میں تری بے سراغ پا
افتادگان خاک کو اے یاسؔ خوف کیا شبدیز چرخ سفلہ اگر ہو چراغ پا

یہ زیبا تھا کہ تو جب راہ چلتا جلو میں تیرے مہر وماہ چلتا
طریق وصل اگر ہو تادم تیغ میں تو بھی سر کے بل واللہ چلتا

نہیں کوئی طریق پر خطر میں کسی کو بے لئے ہمراہ چلتا
دلے راہ عدم کیا بے خطر ہے کہ ہے اکلا گداؤ شاہ چلتا

تر وخشک اپنا بحروبر سمجھتے جو یاسؔ اودھر باشک وآہ چلتا

باہر ہوئے گناہ ہمارے شمار سے! کچھ سوچ اب نہیں ہمیں روز حساب کا
ابر تنک ہوسایہ فگن جیسے ماہ پر دیکھا جو ان کے مونہہ پہ عالم نقاب کا
دریائے اشک یاسؔ ہوا چشم سے رواں آیا جو ذکر راسخ غفراں مآب کا

کبھی شاہوں سے نہ ہرگز وہ سرانجام ہوا کام جو کچھ کہ ترے در کے گدا سے آیا
میری آنکھوں میں نظر آئے سراسر اسرار سرمہ جس دم تری خاک کف پا سے آیا
لطف نے اس کے کیا دل کو باامید قوی یاسؔ جب مجکو ہراس اپنی خطا سے آیا

ہاں قدرت خالق سے تو کیا ہو نہیں سکتا پر تجھ سا تو بت نام خدا ہو نہیں سکتا
ہے لال زباں شرح میں رنگ کف پا کے سرسبز یہاں رنگ حنا ہو نہیں سکتا

میرے گلرو سے اس کو کیا نسبت منہ تو دیکھے بھلا بہار اپنا
منتیں ان کی کیں تمہارے لئے بات کرنا تھا جن سے عار اپنا
ہائے نکلے وہ دشمن جانی جن کو جانا تھا دوستدار اپنا

سودائی سا پھرتا ہوں دم سرد میں بھرتا ہے دم سے مرے گرمی بازار محبت
کرتا نہیں بے سود میں زخموں کو نمک سود سمجھے یہ مزا ہو جو دل افگار محبت
پانی نہ ہو جب تک دل خوں گشتہ عاشق کھلتا ہی نہیں عقدہ دشوار محبت

بند ہستی سے نکلنے کی تمنا کیا کہوں　　دل سے قیدی کے کوئی پوچھے رہائی کی ہوس
ارتباط شمع سے روشن ہے پروانہ کا حال　　کیا کرے کوئی کسی سے آشنائی کی ہوس
شیوہ اپنا خاکساری گر بعکس اہل کبر　　ہے اگر آئینہ دل کی صفائی کی ہوس

بال باندھے،کبھی پر کترے کبھی قید کیا　　جو رصیاد کے مجھ پر ہوئے اقسام تمام
بیٹھنا خاک پہ اور تخت پہ یکساں ہے یاسؔ　　حرص اٹھ جائے جو دل سے تو ہو آرام تمام

کرے وہ جنگجو گر جنگ کی تدبیر پانی میں　　سپر گرداب ہو اور موج ہو شمشیر پانی میں
جو آیا بحر ہستی میں عدم کے پہنچا ساحل تک　　زبان موج کرتی ہے یہ تقریر پانی میں
دل سنگیں سے تیرے دھوئے کینہ کب تلک آنسو　　مٹادے نقش پتھر کا کہاں تاثیر پانی میں
(۲۷)

(۳)

مولانا سید شاہ امیر الدین وجدؔ بہاری

سید شاہ امیرالدین نام، وجد تخلص۔ نویں محرم ۱۲۱۳ھ کو پیدا ہوئے۔ علوم متعارفہ کی تعلیم مولانا سید عزیز اللہ بن شاہ قطب الدین سے پائی۔ آپ نے نعمت باطنی اپنے والد کے فیض صحبت سے کی تھی۔ حضرت شاہ حسین عطا شطاری کے دست حق پرست پر سلسلہ فردوسیہ میں بیعت طریقت حاصل کر کے راہ طلب حق کو اختیار کیا۔ اور کمالات باطنی سے آراستہ ہو کر جمیع سلسلہ کے مجاز ہوئے۔ آپ کو حضرت شاہ حمید الدین فردوسی راجگیری سے بھی ارشاد و فیض حاصل تھا۔ آپ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر فکر سخن میں مشغول رہتے۔ حکمت و معارف کے واردات و دلی جذبات کے نقشے غزلیات، مثنوی، رباعی، قطعات، مسدس، مخمس وغیرہ جملہ اصناف شاعری میں ظاہر فرماتے تھے۔ فارسی میں ظلومؔ اور اردو میں وجد تخلص کرتے تھے۔ اور راسخ بہاری کی روش پسند کرتے تھے۔ دونوں قسم کی شاعری میں آپ کو

کمال حاصل تھا۔ پانچویں جمادی الاولیٰ ۱۲۸۷ھ اور آپ کا وصال ہوگیا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

پوچھ مت عشق کی پابندیوں کی شادی کا ۔۔۔ لطف ہے قید میں حاصل مجھے آزادی کا
کھینچی پستی سے بگولے کی طرح سمت عروج ۔۔۔ خاصہ ہے یہ اسی عشق کی بربادی کا

آبروئے دیدہ مردمِ حیاوشرم ہے ۔۔۔ پردہ مژگاں حجاب چشم جاناں ہوگیا
زخم شمشیر نگہ منت کش مرہم نہ تھا ۔۔۔ اب جراحت شور احساں کا نمکداں ہوگیا
تن مرا کس لالہ رو کی یاد میں ہے داغ داغ ۔۔۔ میں بھی اس گلشن میں یک سرو چراغاں ہوگیا
یاد میں کس غنچہ لب کے خوں فشاں ہے میری چشم ۔۔۔ جو گرا آنسو وہیں لعل بدخشاں ہوگیا
بحر دل کا جوش اب آنکھوں میں آٹھہرا ہے وجدؔ ۔۔۔ ساحل دیدہ یہ لنگرگاہ طوفاں ہوگیا

نہال عشق کے اے چشم تر! رہ آبیاری میں ۔۔۔ بھرے گا ثمرہ امید سے دامن شجر کا سا
سروتو پابند شاخ وبرگ ہے اس باغ میں ۔۔۔ وجدؔ کس نے اس کو بخشا ہے خطاب آزاد کا

دھواں اٹھا تھا نہ جب تک جگر سے عاشق کے ۔۔۔ یہ پیچ وتاب کہاں زلف پر شکن میں تھا

سب موتیوں میں ہے وہی نایاب وبے بہا ۔۔۔ جس کو کسی کے کان کا گوہر بنا دیا

نازاں بہت تھا اپنی صفائی پہ آئینہ ۔۔۔ منہ لے کے دیکھو، اس کے مقابل میں رہ گیا

نیش زن بھی ہو تو بچھو سا نہ ہو دنیا میں وجدؔ ۔۔۔ مثل زنبور عسل جامع ہو نیش ونوش کا

جاں تک تو دی مشغلہ عشق میں تیرے ۔۔۔ فرمائیے! جو اور کوئی کام رہ گیا

وہ لوگ اٹھ گئے تھا جنہیں پاس دوستی اب دہر میں وفا کا فقط نام رہ گیا

جب تک کہ وجدؔ فضل نے اس کے مدد نہ کی سید ھا کسی طالع واژ گوں نہ ہو سکا

کب دل میں حسن باطل یوں جلوہ گر رہے گا گر شاہد حق اپنے پیش نظر رہے گا!

تماشا ہے کہ جس کو چشم عالم سے نہاں پایا اسی کا جلوہ حسن نہاں ہر میں عیاں پایا

رلا یا چٹکیاں لے لے کے اتنا وجدؔ پیری نے لگا کے گدگدی جتنا جوانی نے ہنسایا تھا

بند میری ہی زباں کیا یار کی محفل میں ہے شمع سے پروانہ تک تو سب کی دل ہی دل میں ہے

مرے رونے کی حالت دیدہ یعقوب جانے ہے حقیقت درد کی ہمدرد ہی کچھ خوب جانے ہے

بے یار کے جینے سے تو مرنا ہی بھلا ہے اب جان مری تن سے نکل جائے تو اچھا
(۲۸)

(۴)

قاضی مخدوم عالم مخدومؔ پھلواروی

مخدوم عالم نام، مخدومؔ تخلص۔ آپ کی پیدائش ماہ رجب ۱۲۱۶ھ میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم آپ کے دادا قاضی سید عالم سے ہوئی اور تکمیل استاذ الاساتذہ مولانا شاہ عبدالغنی محدث سے ہوئی، جو فن حدیث میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بلاواسطہ شاگرد تھے۔ روحانی تعلیم حضرت مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری مجیبی، حضرت فرؔد اور مولانا شاہ ابوالحیات آشنؔا سے ہوئی۔

مولانا احمد اللہ ندوی تحریر کرتے ہیں:

آپ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں کاوش فرماتے تھے۔آپ کے فارسی اور اردو کلاموں کا مجموعہ غزلوں اور چند مثنویوں کے سوا کل مرثیوں پر مشتمل ہے۔جن کی قلمی بیاض موجود ہے۔ یا دس راتوں کو پڑھی جانے والی مطبوعہ ''عمدۃ المجالس'' نامی وہ مجلس ہے،جن میں واقعات کربلا نظم و نثر میں لکھے گئے ہیں۔

آپ کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

باندھ لو زلف میں دل زخمی چھوڑتا ہے کوئی شکار اپنا؟

کشتہ کرنا اب میرا دشوار ہے اے شعلہ رو بیقراری سے دل بیتاب پارہ ہوگیا
ہم نے اے مخدومؔ لکھی ان کی افشاں کی جو مدح نوک خامہ سے گرا جو رشحہ تارہ ہوگیا

لحد میں بھی نہ تنہائی رہے گی وہاں بھی ساتھ ان کا غم رہے گا
تری الفت کا دم بھرتے رہیں گے ہمارے دم میں جب تک دم رہے گا
جو ہوگا گرم بازار شفاعت قیامت میں عجب عالم رہے گا
کہے گا بے نشاں ہر شخص ہم کو نشاں اپنا بھی یہ کیا کم رہے گا

(۲۹)

آپ کا انتقال ۱۳۰۴ھ میں ہوا۔

(۵)

مولانا میر محمد حسن حسنؔ چھپروی

میر محمد حسن نام،حسنؔ تخلص۔مسکن موضع کھجوہ ضلع سارن۔ولادت بتاریخ ۳/ذی قعدہ ۱۲۲۳ھ/ ۱۵/دسمبر ۱۸۱۸ء کھجوہ ہی میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مکان ہی پر حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لئے لکھنو تشریف لے گئے۔وہاں انہوں نے سلطان العلماء اور دوسرے مجتہدین کے سایہ عاطفت میں تعلیم مکمل کی۔

جناب حسنؔ کی ذہنی نشوونما دینی ماحول میں ہوئی تھی۔اس لئے وہ فطری طور پر عبادت گزار تھے۔

جناب حسنؔ کو مرزا دبیرؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ مرزا دبیرؔ سے انہیں والہانہ عقیدت تھی جس کا اظہار وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں مرزا دبیرؔ کا رنگ نمایاں ہے۔

۱۵؍صفر ۱۲۹۵ھ/ ۱۸؍فروری ۱۸۷۸ء کو انتقال فرمایا۔

جناب حسنؔ کو مرثیہ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ وہ روایت کی صحت پر کافی زور دیتے تھے۔ وہ پورا اہتمام کرتے اور تاریخ کی حیثیت سے مطمئن ہوجاتے تب ہی اس کو منظوم کرتے تھے۔ اس طرح ان کے مراثی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک مرثیہ کے چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

مارے گئے حسینؑ دہائی رسول کی
لوٹی ستمگروں نے کمائی بتول کی
یا مصطفیٰؐ حسینؑ ہوئے بے گنہہ شہید　　پامال مرکبوں سے ہوا وہ شہ سعید
جس کے لئے بنے تھے شترتم بروز عید　　سینہ پہ اس کے آہ چڑھا قاتل پلید
ہنگام عصر جمعہ کو سید کا خوں ہوا
واحسر تا کہ کعبہ دیں بے ستوں ہوا
زہرا نے جس کو پالا تھا اپنا پلا کے شیر　　پانی کا فرق اس پہ رہا تا دم اخیر
بے جان ہوئے حسینؑ کے سارے جوان و پیر　　ششماہہ تک شہید ہوا کھا کے رن میں تیر
حضرت کو کیا خبر نہیں دارالسلام میں
تن دشت کربلا میں ہے سر ملک شام میں
جس سر کو اپنے سینہ پہ تم رکھتے تھے سدا　　اس پر ہوئے یہ ظلم وستم وامحمدا!
نوک سناں پہ شمر نے اس کو کبھی دھرا　　خونی کے گھر تنور میں پنہاں اسے کیا
پتھر لگائے کوفہ میں اہل عناد نے
لٹکا یا در پہ قلعہ کے ابن زیاد نے

حسنؔ فن رباعی میں بھی طاق تھے۔ اس میں بھی مضمون آفرینی کی جو بہار دکھائی ہے ملاحظہ ہو ؎

منصف اگر ایک بھی ستمگر ہوتا میدان میں پھر قتل نہ اکبرؔ ہوتا

اکبرؔ بھی وہ اکبر کہ جسے کہتے تھے سب سایہ جو نہ ہوتا تو پیمبر ہوتا

مرثیہ نگاری کے علاوہ حسنؔ نے سلام بھی کہے اور اس میں بھی جو ملکہ انہیں حاصل تھا ملاحظہ فرمائیے ؎

اعدا سے شاہ بولے کہ اے لشکر جفا — نانا ہمارا شافع محشر ہے یا نہیں
ماہ فاطمہ ہے نور و چشم رسولؐ حق — بابا ہمارا کیا اسد کبر یا نہیں
یعسوب دین و قائد غیر المحجلین — حیدر اگر لقب ہے تو کیا ایلیا نہیں
قبضہ میں اپنے تیغ دو سر ہے وہ شعلہ رو — اب تک جہاں میں جس کے کوئی منہ چڑھا نہیں
پڑ جائے کوہ پر تو کٹے کاہ کی طرح — کیا اس جبرئیل کے پر آشنا نہیں
رستم ہمارے سامنے ہے زال کی مثال — وہ کیا ہے زور جو ہمیں حق نے دیا نہیں
مختار کائنات ہمیں ہیں خدا گواہ — رتبہ ہمارا سب پہ عیاں ہے چھپا نہیں
سب جانتے ہیں یہ کہ نواسا رسول کا — کوئی جہاں میں اور ہمارے سوا نہیں
ہم ہیں قسیم کوثر و تسنیم و سلسبیل — سو ہم کو تین روز سے پانی ملا نہیں
کیوں منصفو! یہی ہے مدارات میہماں — پاس نبیؐ نہیں تمہیں خوف خدا نہیں
تقصیر وار ہوں میں تمہارے گمان میں — معصوم بچوں کی تو بھلا کچھ خطا نہیں
بے دیں پکارے طالب دنیا میں ہم فقط — سادات کے ستانے میں شرم و حیا نہیں
فرمایا شہ نے خیر حیا ہے دلیل دیں — تم کو حیا نہیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

(۳۰)

(۶)

شاہ وصی احمد نام، وصیؔ پھلواروی

شاہ وصی احمد نام، وصیؔ تخلص قصبہ پھلواری شریف کے سر برآوردہ فضلاء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲۲۶ھ میں ہوئی۔ ابتدائی کتابیں مولانا احمدی سے پڑھی۔ درسیات کی تکمیل حضرت مولانا شاہ محمد حسین سے کی۔ آپ نے مزید علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم حضرت مولانا شاہ محمد ابوالحسن فردؔ سے حاصل کی۔ جوانی ہی میں آپ کو شعر وسخن کا ذوق پیدا ہوا۔ آپ نے اس کی اجازت حضرت فردؔ سے چاہی، جس کی آپ کو اجازت دی گئی۔ اور ہدایت کی گئی کہ بزرگان کرام

کے دیوان کو مطالعہ میں رکھیں۔ چنانچہ آپ نے اس کا پورا لحاظ رکھا۔

جناب وصیؔ خانقاہ مجیبیہ کے دور ثانی کے شعراء میں بڑے متحرک شاعر تھے۔ اکثر طرحی مشاعرے کی محفل منعقد کرتے تھے۔ آپ کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ کلیات مولانا وصی احمد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی بیاض بھی ہے۔ جس میں فارسی اور اردو کی غزلیں ہیں۔

آپ کے کلام میں تاثیر باطنی اور سوز کی فراوانی ہے۔ الفاظ سلیس اور بندش لطیف ہے۔ آپ کا کلام حقیقت معارف، حمد اور نعت پر بھی مشتمل ہے۔ اور عشق کی آنچ دے کر آپ نے بادہ عرفاں کو دو آتشہ اور سہ آتشہ بنا دیا ہے۔

۲؍ربیع الاول روز یکشنبہ ۱۲۹۳ھ کو آپ کا وصال ہو گیا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل میرا اگر مائل اشعار نہ ہوتا　　باتوں سے مرے عشق کا اظہار نہ ہوتا
گر سحر بیانی مری مشہور نہ ہوتی　　وہ غنچہ دہن مائل گفتار نہ ہوتا
ہو حشر تلک طول شب وصل کو یارب　　تا حشر رخ ہجر نمودار نہ ہوتا
اس کوچہ میں غیروں کو سراغ اپنا نہ ملتا　　پاؤں میں اگر آبلہ اے خار نہ ہوتا
اس مست شکر خواب سے آہستہ گذریو　　اے بادسحر کاش وہ بیدار نہ ہوتا
اے کاش نہ ہو شام مرے وصل کے دل کی　　آثار شب تار نمودار نہ ہوتا

آوازہ شفاعت کا نبی کے جو نہ سنتے
عصیاں پہ وصیؔ کو کبھی اصرار نہ ہوتا

چھوٹی بحر میں یہ غزل سہل ممتنع کو ظاہر کرتی ہے:

حال اپنا کہا نہیں جاتا　　درد دل کا لکھا نہیں جاتا
خستہ و خوار محبت دنیا میں　　آج کل تو سنا نہیں جاتا
عزم ہے جان سے گذر جاؤں　　رنج دنیا سہا نہیں جاتا

مجھ سے مفلس کے ہاتھ سے اے کاش　　نسخہ کیمیا نہیں جاتا
ہم غریبوں کو ایک نظر تھی بس　　تم سے اتنا کیا نہیں جاتا
اب چلو اے وصیؔ مدینہ کو
ہند میں تو رہا نہیں جاتا

تذکرہ مسلم شعرائے بہار سے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

خانہ دل کی بنا ٹوٹی رکا جب سیل اشک　　یہ نہ سمجھے دیدہ صحن دل کا اک میزاب تھا
سرخی مژگان و دیدہ نے دکھائی شب بہار　　گویا زیر شاخ مرجاں دانہ عناب تھا
پھر مری آنکھیں بھر آئیں ابر غم جو چھا گیا　　شکر ہے کتنے دنوں سے خشک یہ تالاب تھا

اس نے نقاب زلف جو رخ پر جھکا دیا　　ایک ابر تھا کہ چاند کو اس نے چھپا دیا
اس بے نوا کو تازہ خریدار دیکھ کر　　مول اپنا خود فراموش نے حد سے بڑھا دیا

درد دل کے لئے کیا کیا نہ دوا کرتے ہیں　　نالہ و آہ و فغاں شور و بکا کرتے ہیں
تیغ ابرو تلے گردن نہ کٹا دیں کیوں کر　　عشق کا حق ہے اس سر سے ادا کرتے ہیں
غیرت شیشہ فانوس ہے سینہ میرا　　شمع ساں داغ جگر اس میں جلا کرتے ہیں
ایسے خونریز کو کیا رنگ حنا کی حاجت　　میرے ہی خون سے ہاتھوں کو رنگا کرتے ہیں

میرے رونے پہ مسکراتے ہیں!　　یعنی ہنس کر مجھے رلاتے ہیں!
کوچہ عشق میں جو آتے ہیں　　خانماں اپنا بھول جاتے ہیں

سردار راہ عشق میں وہ ہے کہ جس کا سر　　منصور وار تا بہ سردار جا سکے
دوازہ میرے خانہ دل کا یہ چشم ہے　　اس در پہ تو جو آئے تو اندر بھی جا سکے

سیاہی دل کی زاہد کے گئی ہے مئے کی برکت سے
چھڑایا اس نے اس داغ سیہ کو آب رحمت سے
شکستہ تا نہ ہووے شیشہ دل تنگ فرقت سے
حوالے کر دیا تجھکو صنم رکھیو حفاظت سے
سرور میکشاں حاصل کہاں ہے زہد و تقوی سے
ابھی کرتا ہوں ترک مئے جو حاصل ہو ریاضت سے

(۳۱)

(۷)
مولانا شیخ فقیر حسین عظیمؔ سیوانی

شیخ فقیر حسین نام، عظیمؔ تخلص۔ حکیم شیخ تفضّل حسین صدیقی کے صاحبزادے۔ مولد حسین گنج۔ مسکن کھجوہ، ضلع سیوان، ولادت جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ/ جنوری ۱۸۲۸ء میں ان کی نانہال کھجوہ میں ہوئی۔ انہوں، نے لکھنؤ میں جملہ علوم حاصل کئے۔ وہیں طبابت بھی پڑھی۔ وطن واپس ہوئے تو مطب شروع کیا۔ شہرت ہوئی تو دور دور سے مریض آنے لگے۔ جو آتا شفایاب ہو کر جاتا۔ حج کی واپسی پر عروس البلاد بمبئی میں مطب شروع کر دیا۔ عوام کا ہجوم جمع ہونے لگا۔ ہزاروں روپے کی آمدنی ہونے لگی۔ اتنی خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی ان کی اقربا نوازی اور غربا پروری تھی۔ اپنا چلتا ہوا مطب چھوڑ کر بمبئی سے صرف اس لئے گھر چلے آئے کہ ان کا کوئی غریب رشتہ دار ان کے گھر بیمار ہو کر آ گیا تھا۔ آتے ہی اس کا علاج شروع کیا وہ شفایاب ہو کر گھر لوٹ گیا۔

لکھنؤ کی فضا راس آئی۔ شعر گوئی کا شوق ابھرا تو مرزا دبیرؔ کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انہوں نے اکثر اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ لیکن سارا زور مرثیہ نگاری پر صرف ہوا۔ طرز ادا میں وہ بانکپن، وہ گھن گرج، وہ زور بیان اور وہ ندرت خیال جو خود مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات ہیں، ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مرثیہ کے چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

کیوں زلزلہ میں از سر نو چرخ بریں ہے
کیوں رعشہ میں بالائے فلک مہر مبین ہے
کیوں سکتہ میں میں رن خوف زدہ خاک نشیں ہے
کیوں دبدبہ کے ڈر سے دبی رن کی زمین ہے

ہاں غلغلہ برپا ہے شجاعان زمن میں
آمد ہے خداوند اولو العزم کی رن میں
اب صبح کے چہرے کی طرح فق ہیں سب آفاق طوق مہہ نواب ہے نہ عیوق کا اب طاق
خورشید کو شق حبیب سحر کرتا ہوا شاق لوخلق پہ آیا غضب اے ایزد خلاق
غل ہے کہ نہ اب دورۂ افلاک رہے گا
گر کاخ فلک الٹے تو پھر خاک رہے گا
مردوں کو تزلزل ہے زمیں لیتی ہے کروٹ دریا میں روانی، نہ سمدر میں ہے بڑھ گھٹ
اب اشہب گردوں کا نہ کاوا ہے نہ سرپٹ بھاگیں بھی تو ثابت نہ ہو رفتار کی آہٹ
ہے سیر ثوابت بھی ذرا ہل نہیں سکتے
ڈر سے مہہ و خورشید گلے مل نہیں سکتے
نابود میں ہے بود تزلزل میں ہے عالم افلاک تہہ خاک دبے جاتے ہیں پیہم
تھراتا ہے دہشت کے سبب نیر اعظم تعظیم وادب سے سر تسلیم کئے خم
ہیں ایک جگہ آٹھوں بہشتوں کے فرشتے
استادہ ہیں پہلو میں فرشتوں کے فرشتے
اس دم ہے نزول غضب قادر بے چوں عالم ہے سامنا فنادم بدم افزوں
پیدا ہے اذاز لزلت الارض کا مضموں ہوجائے کہیں پنبۂ حلاج نہ گردوں
ٹوٹیں گے ستاروں کی طرح چرخ بریں آج
گنجینہ قاروں کو الٹ دے گی زمیں آج

آگے چل کر یوں کہتے ہیں۔آہنگ ملاحظہ ہو ؎

نقارۂ رزمی پہ پڑی چوٹ دمادم آواز یہی آتی ہے ہر چوٹ پہ پیہم
ہاں اے عمر وسعد ستم پیشہ واظلم کیوں مائل دنیا ہوا فانی ہے یہ عالم
فرعون نہ قاروں ہے، نہ ضحاک فریدوں
دنیائے دنی دوں ہے، ارے دوں ہے ارے دوں **(۳۲)**

(۸)

مولانا عبدالحمید پریشاںؔ صادقپوری

عبدالحمید نام، پریشاں تخلص۔ آپ کی ولادت محلہ صادقپور، ضلع پٹنہ میں ۸ر شوال ۱۲۴۵ھ میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولانا فیاض سے پڑھیں۔ پھر بقیہ کتابیں آپ نے اپنے والد ماجد جناب مولانا احمد اللہ سے پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر بھی تشفی نہیں ہوئی تو ۲۶ر برس کی عمر میں لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہاں جا کر مولانا واجد علی جو اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے ان سے دو برس تک علوم درسیہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ فراغت کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے اور لکھنؤ ہی میں رہ کر طب کی تعلیم حاصل کی۔

آپ بڑے نامی طبیب تھے۔ طبابت ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ لیکن درس و تدریس سے بھی اپنے آپ کو منسلک رکھا۔ راتوں کو طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔

شعر و شاعری میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں قصائد، غزل، رباعی، قطعات، مثنوی وغیرہ بکثرت موجود ہیں۔

آپ کی وفات ۵ر جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ملاحظہ ہو ؎

گلوں کو پھول گئی، دیکھ کر چمن میں صبا
بس اب سماتی نہیں اپنے پیرہن میں صبا

الجھ کے رہ گئی، گیسوئے پرشکن میں صبا
خدا کی شان ہے لو بند گئی رسن میں صبا

ہوائے کاکل مشکیں میں ہوگئی برباد
بگولا بن کے پھرتی ہے چمن میں صبا

زمین تنگ میں رکھتی نہیں ہے طبع رواں
کسی سے بندھ نہیں سکتی کبھی رسن میں صبا

تموز دشت میں آئے تو حال ہو معلوم
یہ ٹھنڈی گرمیاں کرتی رہے چمن میں صبا

لپٹ کے پتوں سے دیتی ہے واہ واہ کی صدا
جواب دیتی ہے بلبل کا ہر سخن میں صبا

تو باد پائی میں بس اس کی ہمسری کرلے
وہ شوخی تجھ میں کہاں جو کہ ہے ہرن میں صبا

عجب دماغ سے چلتی ہے سیر گلشن میں
تراشتی ہے کچھ اپنے کو بانکپن میں صبا

وہ غنچہ لب ہنسا تو کھلا مثل گل دہن — شیشہ جو کھلکھلا کے ہنسا جام ہوگیا
قاصد کے ہاتھ چومے جو بوسہ کیا طلب — پیغام بوسہ، بوسہ بہ پیغام ہوگیا
کیا بڑھ چلا ہے مرتبہ اب خال چشم کا — یہ تل کا تیل روغن بادام ہوگیا
ساتھ اپنے لے چلے دم آخر خیال یار — اب آؤ یا نہ آؤ مرا کام ہوگیا
نام خدا صنم ہے مرا برہمن پسر — لچھمن کو پیار ہم نے کیا رام ہوگیا

ایک اپنی ہی نہ توڑوں قفس میں تیلیاں — بس چلے تو توڑ دوں دو چار دس کی تیلیاں
مرغ جاں ہے قید تن میں جب تلک آتی ہی سانس — ہیں قفس میں جسم کے تار نفس کی تیلیاں

پیار وہ کرتے ہی خفا ہوگیا — ہائے میں کیا سمجھا تھا کیا ہوگیا
دل مرے پہلو سے جدا ہوگیا — اے مرے اللہ یہ کیا ہوگیا
مرکے جو قاتل کے قدم پر گرا — سجدۂ شکرانہ ادا ہوگیا
قتل پہ میرے انہیں رحم آگیا — دست ستم دست دعا ہوگیا

تحریر نے سرمہ کی کیا قتل جہاں کو — اس کاٹ کی دیکھی نہیں بیمار کی تلوار
جو ہر سے وہ تھی سبز پری خوں میں نہا کر — لولال پری ہوگئی اب یار کی تلوار
چال ان کی دم تیغ قتال جہاں ہے — رفتار کی رفتار ہے تلوار کی تلوار

(۳۳)

(۹)

مولانا سید شاہ قطب الدین احمد باقی گیاوی

سید شاہ قطب الدین احمد نام، باقی تخلص۔ حضرت سید شاہ عطا حسین فانی منعمی کے فرزند تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں اپنی نانہال قصبہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں مختلف اساتذہ سے پوری کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ اور اس فن میں مولانا سید

منیر الدین احمد کیفی سے تلمذ تھا۔

حضرت باقی کی وفات ۲۹ر ذی قعدہ ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔

مولانا احمد اللہ ندوی تحریر کرتے ہیں:

استاذ کا دیوان جب ضائع ہوا تو آپ نے بھی اپنا مرتب دیوان ضائع کر دیا۔ عزیزی مولانا سید شاہ حسین الدین احمد مرحوم جو حضرت باقی کے پوتے ہیں، کی توجہ سے حضرت باقی کی بعض غزلیں مختلف سفینوں سے دستیاب ہوئی ہیں۔ جو یہاں لکھی جاتی ہیں ؎

فلک تھرا گئے، جس دم ہوا یہ دل تپاں اپنا ۔۔۔ گیا ہے نالہ ء آتش فشاں دیکھو کہاں اپنا
اٹھایا جس گھڑی دست دعا وہ روٹھ کر بیٹھے ۔۔۔ اجاڑا اپنے ہی ہاتھوں سے ہم نے آشیاں اپنا
ہوا کس کے خدنگ ناز کا زخمی محبت میں ۔۔۔ تڑپتا ہے جو پہلو میں یہ مرغ نیمجاں اپنا
ہمارے نالہء دل کی صدا سن سن کے راتوں کو ۔۔۔ فلک پر تھام لیتے ہیں کلیجا عرشیاں اپنا
لگی ہے اس لئے مہر خموشی لب پہ اے باقی ۔۔۔ کرے گی میز بانی خود مری، قصہ بیاں اپنا

نہ آئی لب تلک ذکر دہن میں گفتگو برسوں ۔۔۔ خموشی آئینہ بن کر رہی ہے روبرو برسوں
خیال روئے روشن میں گنوائی آبرو برسوں ۔۔۔ کیا ہے دور اس قرآں کا میں نے باوضو برسوں
کوئی جا کر خبر آتنی خیال یار سے کہہ دے ۔۔۔ رہی ہے دل میں اپنے درد ہو کر آرزو برسوں
بتوں کی عشق بازی بے ملایا خاک میں تقویٰ ۔۔۔ رہا ہے حسن عالم سوز میں ٹھنڈا وضو برسوں
نہ پوچھا اک سر موان بتوں نے بیوفائی سے ۔۔۔ خیال زلف نے ناحق رکھا آشفتہ مو برسوں

زندگی بے یار کی اچھی نہیں ۔۔۔ عادت اب انکار کی اچھی نہیں
اے مسیحا! تیرا دم بھرتا ہے وہ ۔۔۔ حالت اس بیمار کی اچھی نہیں
پھانستی ہے یہ دل عشاق کو ۔۔۔ یاد زلف یار کی اچھی نہیں
خون ہو کر ٹپکے گا آنکھوں سے دل ۔۔۔ چشم پوشی یار کی اچھی نہیں
وعدۂ فردا پہ کیوں ٹالئے ۔۔۔ حشر پر دیدار کی اچھی نہیں

شغل رکھ عشق بتاں سے باقیؔ زندگی بیکار کی اچھی نہیں

مقابلے کی تو کیا لے گا یہ بیچارہ چاند مگر کرے گا ترے حسن کا نظارہ چاند
تمہارے جلوۂ رخ کی جو تاب لا نہ سکا تو ڈھونڈ ہنے لگا وہ ابر کا سہارا چاند
ہلال ساں میں گھٹا غم سے اور نہ آئے آپ کٹا امید میں صد حیف اپنا سارا چاند
سحر کے ہوتے ہی لطف شب وصال گیا ادھر تو آپ سدھارے ادھر سدھارا چاند
اسے بتا کہ میں جس مہ لقا کا طالب ہوں تو اپنی شکل دکھا تا ہے کیا خدارا چاند
ملا جو لطف شب مہ تو یار خود آیا اتارلایا ہے کیا عرش کا یہ تارا چاند
نقاب یار نے الٹا تو چاندنی چھٹکی ہٹا جو ابر ہوا کیسا آشکارا چاند
عجب یہ غم ہے کہ گردش میں رات دن ہے فلک غم حسین میں پھرتا ہے غم کا مارا چاند
ہٹا تو دے رخ جاناں سے زلف کو باقیؔ چھپا ہے ابر کے ٹکڑوں میں کیا پیارا چاند

چین سے سو بھی رہو ورنہ قباحت ہوگی گر ٹلی وصل کی شب صبح قیامت ہوگی
تم جو پہلو سے اٹھے جان بھی رخصت ہوگی تن تنہا یہ مصیبت پہ مصیبت ہوگی
بھولا پن دیکھ کے پھنسنے نہ پڑو، حضرت دل ابھی کم سن ہے بھری اس میں شرارت ہوگی
وعدۂ وصل کو فردا پہ نہ تالا کیجئے انہیں باتوں میں کسی روز قیامت ہوگی
ترے زلفوں کے تصور سے بڑھے گا سودا شب دیجور سے افزوں شب فرقت ہوگی
حشر میں تجھ سے سمجھ لیں گے خدا کے آگے لب پہ اے دل !اگر اس بت کی شکایت ہوگی
ہم گنہگاروں کو کیا حشر کی امید رہے مہرباں ہم پہ وہ ہوایسی بھی نوبت ہوگی
داغ دل اپنے اگر قبر میں ہونگے روشن خاک جل جل کے یہ شمع سر تربت ہوگی
اشک آنکھوں سے جو نکلا وہ ترے در تک پہونچا اب تو کچھ صاف ترے دل کی کدورت ہوگی
نامہ بر سے کہا اس شوخ نے کیا جاؤں میں داستان شب غم سننے کی نوبت ہوگی
باندھ لیں گے ترے مضمون دہن غنچہ دہن ہاں شگفتہ جو کسی روز طبیعت ہوگی

یار نے وعدۂ دیدار جو فرمایا ہے — منتظر رہتا ہوں کس روز قیامت ہوگی
قصہ بڑھ جائے گا گر وعدہ خلافی ہوگی — آئے گا تو حکایت نہ شکایت ہوگی
دم لبوں پر ہے تو دل صدمے سے باہر ہوگا — یار گر آتا نہیں جان بھی رخصت ہوگی
دم حسینوں کی محبت کا جو تو بھرنے لگا — ہاں کوئی روز میں باقیؔ تری شہرت ہوگی

سبز خط عارض رنگیں پہ ترے کیا نکلے — ہم ہرا کرنے کو زخم دل شیدا نکلے
جس طرف راتوں کو اے بت ترے شیدا نکلے — انگلیاں اٹھنے لگیں عاشق لیلا نکلے
اپنے پہلو سے خدا یا دل شیدا نکلے — یا وصال بت پرُ فن کی تمنا نکلے
اڑگئی نیند خیال شب گیسو میں مری — یاالٰہی سر شوریدہ سے سودا نکلے
وہ لگا ہاتھ کہ چھٹکارا ہو غم سے قاتل! — دہن زخم سے بھی شکر خدا کا نکلے
دم کریں سورۂ یوسف کو تری صورت پر — کنج مرقد سے تپاں روح زلیخا نکلے
اک قیامت ترے انکار سے ہوگی برپا — وصل کی ٹھہرے تو دل سے غم فردا نکلے
قتل کرنے کے لئے منع تو ہم کرتے ہیں — ڈھونڈلو پہلے کوئی چاہنے والا نکلے
خضر رہ وحشت دل بحر الم میں جو ہوئے — تھام کر ہاتھوں سے ہم دامن صحرا نکلے
حسن بندش کی مجھے داد وہ خود دینے لگے — دہن یار کے مضمون بھی گویا نکلے
خال وخط نے بت ناداں وہ بڑھایا جو بن — ہو کے ناداں ترے عشق میں دانا نکلے
جگر ودل تو گئے اشکوں کے شامل باقیؔ — روح اس جامے سے کیونکہ تن تنہا نکلے

(۳۴)

(۱۰)

مولانا سید برکات احمد برکاتؔ بہاری ٹونکی

سید برکات احمد نام، برکاتؔ تخلص۔ آپ کے والد ماجد کا نام حکیم سید دائم علی تھا۔ موضع میر نگر کے رہنے والے تھے۔ جو موضع گیلانی ضلع پٹنہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آپ نے علم طب اپنے والد حکیم دائم علی سے پڑھا۔ علوم عقلیہ کی تعلیم علامہ فضل حق خیر آبادی سے حاصل

کی۔مطب کی مشق کے لئے لکھنؤ کے مشاہیر اطبا کے خدمت میں رہے۔بھوپال میں قاضی ایوب صاحب سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔فراغت کے بعد ٹونک تشریف لے آئے۔آپ کے والد نواب کے معالج تھے۔یہاں آکر اپنے والد کے مسند کو آباد کیا۔ساتھ ہی علوم عقلیہ،نقلیہ اور طب کا درس دینا شروع کیا۔بہت سے لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ **(۳۵)**

مولانا برکات احمد کو اپنے بہاری ہونے پر فخر اور ناز تھا وہ اپنے شاگردوں کو جب سند فراغ عطا کرتے،تو اس پر دستخط کرتے وقت اپنے نام کے آخر میں میر نگری بہاری ثم ٹونکی لکھا کرتے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کی وفات پر جو مرثیہ انہوں نے کہا وہ نمونہ کے طور پر پیش ہے۔

زندگی کی کوئی باتوں میں نہ جانا ہرگز — دار فانی میں کبھی دل نہ لگانا ہرگز
نہ پیمبر رہے زندہ نہ امیر اور فقیر — جاکے دنیا سے کسی کو نہیں آنا ہرگز
جو ہیں زندہ انہیں مرنا ہی پڑے گا اک روز — موت سے بچ نہ سکا کوئی گھرانا ہرگز
ہاں!مگر رنج اگر ہے تو فقط اس کا ہے — کہ نہیں پائیں گے ہم ایسا یگانہ ہرگز
رنج اور رنج بھی مرنے کا پھر اک کامل کے — حشر تک صبر تو دل کو نہیں آتا ہرگز
کس قیامت کا یہ غم ہے،غم مرگ استاد — دل میں آکر اسے آتا نہیں جانا ہرگز
فلسفی ویسا جہاں میں کوئی اب پیدا ہو — وہم یہ بھول کے بھی دل میں نہ لانا ہرگز
اگلے خاموش ہوں جس بات میں وہ بھی کہہ جائے — ایسا دیکھا نہ جہاں میں کوئی دانا ہرگز
آج تک لذت تقریر ہے کانوں میں رچی — آئے گا یوں تو کسی کو نہ رجھانا ہرگز
ہند تھا خطۂ یونان اسی کے دم سے — ایسے کامل کو فلک!تھا نہ اٹھانا ہرگز
ایک ہی دم سے ہیں وابستہ ہزاروں جانیں — تونے یہ ملک الموت!نہ جانا ہرگز
ہم بہت رنج اٹھائے ہوئے بیٹھے ہیں فلک — رحم کر اب کوئی فتنہ نہ اٹھانا ہرگز
مر کے زندہ نہیں ہوتے کبھی مرنے والے — درد مندوں کو یہ باتیں نہ سنانا ہرگز
دل پہ ہر لحظہ گزرتی ہے نئی کیفیت — صبر سے غم نہیں ہوتا ہے پرانا ہرگز
کیوں رہی تو کہ اٹھانے پڑے صدمات مجھے — زندگی!تو مجھے اب منہ نہ دکھانا ہرگز
اب نہیں آئی تو آنے کی ضرورت پھر کیا؟ — اب کبھی موت!مرے پاس نہ آنا ہرگز

کام لیتے ہیں بہت اور تری حالت ہے خراب　　کام ہی سے دل ناکام! نہ جانا ہرگز
زندہ درگور ہوئے جاتے ہیں یو ناں علوم　　اس کو دیکھو! نہ تہ خاک چھپانا ہرگز
لوگ کس کوچے سے جاتے ہیں جنازہ لے کر　　اب یہ صورت نہ دکھائے زمانہ ہرگز
یہی سنسان کھنڈر تھے کبھی کاخ تعلیم　　ایسا برباد نہ ہو کوئی گھرانا ہرگز
ہوگیا کیا تری رونق کو مرے خیرآباد　　اب ہمیں تو کبھی مہماں نہ بنانا ہرگز
چھوڑ کر سب کو لگے تھے ترے دامن سے ہم　　یوں مناسب نہ تھا دامن کو چھڑانا ہرگز
ہاں تو واللہ! بہت چشم وفا تھی تم سے　　تھامنا سب تمہیں آنکھیں نہ چرانا ہرگز
حشر میں اور نیا حشر بپا کردوں گا　　مرے آگے صف محشر میں نہ آنا ہرگز
اللہ اللہ! تری یکتائی فن، اف رے کمال　　تیرے پیچھے بھی نہیں کوئی یگانا ہرگز
جن مسائل میں ترا ذہن رسا ہوتا تھا　　ایسا باریک نہ تھا کوئی نشانہ ہرگز
تو مٹائے تو گیا اگلے حکیموں کے شکوک　　ورنہ مرنے کا نہ تھا تیرے زمانہ ہرگز
اپنے مانند کوئی ایک تو چھوڑا ہوتا　　ایسی جلدی تمہیں لازم نہ تھا جانا ہرگز
تھی جو جانے کی شتابی تو چلے جاتے آپ　　فلسفہ تھا نہ زمانے سے مٹانا ہرگز
منطق وفلسفہ دنیا سے اٹھا تو نہ اٹھا　　ان فنوں میں کوئی تجھ سا نہیں دانا ہرگز
اب اگر شبہ طبیعت میں کوئی پیدا ہو　　تو کہے کون کہ "یہ وہم نہ لانا ہرگز
کس سے پڑھنا ہے جو راتوں کو کتابیں دیکھیں　　ہائے افسوس! نہیں لطف شبانا ہرگز

جس طرح روتا ہے استاد کے غم میں برکاتؔ
یوں تو دشمن کو بھی یارب! نہ رلانا ہرگز

(۳۶)

۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء کو آپ کا وصال ہوا۔

دورِ جدید

دور جدید

دورجدید میں اردو شاعری عالمگیر ادبی اصول اپناتی نظر آتی ہے۔شاعری کے عالمی ادبی رجحانات کے اثرات علماء کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔اس دور میں جو تجربات کئے گئے،ان میں علماء کا بھی اہم رول ہے۔حسین وموزون بیانات،طرز بیان اور اسلوب میں ہندوستانیت،زبان میں مقامی رنگ علماء کی شاعری میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔جذبات وخیالات اور پاکیزگی بیانات علماء کا طرہ امتیاز نظر آتا ہے۔ اردوشاعری کو نئے رنگ سے ہم آہنگ کرنے اور طرز اظہار میں دلکشی ورعنائی اور فلسفیانہ و عارفانہ رنگ وخیالات سے اردوشاعری کے دامن کو وسیع کرنے میں علماء پیش پیش نظر آرہے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ فکر وفن کی ہم آہنگی بھی ان کی شاعری میں پورے طور پر موجود ہے۔اس دور کے علماء نے زبان وبیان کی سادگی،حسین وفصیح الفاظ اور بلیغ جملوں کے استعمال کے ذریعہ اردوشاعری کو بہتر سے بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔مشرقی زبان وادب میں مہارت کی کمی کی وجہ سے بہت سے اردو کے شعراء نے اس دور میں اردو شاعری کو مغرب زدہ بنانے کی کوشش کی۔اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔لیکن علماء نے اپنے علمی سرمایہ پر فخر کرتے ہوئے،اس سے خوشہ چینی کی اور اردوشاعری جو ترقی کے نئے نئے مراحل طے کررہی تھی،اس کو مزید ترقی کے منازل سے ہمکنار کیا۔اور اردوشاعری کو لسانی ،ثقافتی اور مشرقی اعلیٰ اقدار کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے نئے افکار وخیالات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔بلکہ صالح روایت کو برقرار رکھنے میں اور اس کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔اور یہ اس دور کے علماء کی شاعری میں نمایاں ہے۔

چند علماء کی مختصر سوانح اور ان کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

مولانا سید امین احمد شوقؔ بہاری

سید امین احمد نام، شوقؔ تخلص۔ سال ولادت ۱۲۴۸ھ ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام حضرت سید شاہ امیر الدین وجدؔ ہے، حضرت شوقؔ خانقاہ مخدوم الملک بہاری کے سجادہ نشیں تھے۔ آپ کی قادر الکلامی زمانے میں مشہور تھی۔ شعر گوئی میں کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔ مثنوی گوئی میں آپ بے عدیل تھے۔ اردو کا دیوان مرتب تھا، طبع ہوا کہ نہیں یہ معلوم نہ ہوسکا۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ بھی مرتب ہے جس میں دوسو رباعیاں ہیں۔ اس کے علاوہ خمسہ نظامی کے انداز پر چار مثنویاں پیغمبروں کے احوال میں اس کتاب کا نام ''عبرت افزا ہے''۔ یہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

اور سال وفات ۴؍ جمادی الآخر ۱۳۲۱ھ ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

ہوگیا میں شیفتہ اس غیرت شمشاد کا
سرو بھی اک بندہ ہے جس کے قد آزاد کا

حال صحرائے جنوں میں پوچھتے کیا ہو مرا
ہوں بگولا بھی، تو ہوں اک خانہ برباد کا

اب تو دل اس سنگدل کا اور پتھر ہوگیا
ہائے ہم نے کیوں دیا قصہ سنا فرہاد کا

آتش دل سے ہے مضموں میں بھرا سوز وگداز
ہے مرا جو شعر اک واسوخت ہے آباد کا

اپنی طاقت کی ہوا مت باندھنا زور آورو
دیکھو صرصر نے کیا کیا حال قوم عاد کا

ہے شغل تصور جو ترا دمبدم اپنا
سب کار سے بڑھ کر ہے یہی کار اہم اپنا

انساں کا معاصی سے ہے بچنا نہیں آساں
ہاں اس پہ خدا گر کرے فضل وکرم اپنا

ہو کوئی زمیں، ہوگا رواں، اشہب خامہ
رکتا ہے کہیں شوقؔ کسی جا قلم اپنا

لذت درد جو حاصل ہوجائے میرا ہر عضو بدن دل ہوجائے

نہ کم کو اور نہ بیشتر کو دیکھتے ہیں جو لطف کی ہو نظر، اس نظر کو دیکھتے ہیں

کہوں کیا تجھ سے ہمدم! ہو رہا ہے حال کیا دل کا
کہ جیسے دم نکلنے میں تڑپنا مرغ بسمل کا

جما ہے رات دن نقشہ جو اس لیلیٰ شمائل کا | ہماری آنکھ کا پردہ بنا ہے پردہ محمل کا
فرشتہ خو بہت ہاروت آسا گر پڑے آ کر | ہوا چاہ ذقن میں تیرے عالم چاہ بابل کا
عجب انداز اپنی بیدلی نے اب کیا پیدا | کہ لذت بخش ہر ہر شعر ہے دیوان بیدل کا
مقرر یار کو آغوش میں اے شوقؔ کھینچو گا | دکھاؤنگا اثر اک روز اپنے جذب کامل کا

اللہ تیرا عام جو انعام ہوگیا | جاری مری زباں پر ترا نام ہوگیا
کر اس کی جستجو وہ ملے گا تجھے ضرور | کوشش جو تو نے کی تو ترا کام ہوگیا

کوئی اور غم مجھکو ہوتا تو ہوتا | مگر رنج فرقت خدایا! نہ ہوتا

تن سے سر کٹ گیا، حل ہوگئی مشکل مری | واہ کیا عقدہ کشا ناخن شمشیر بھی تھا

عیاں کس جگہ تیرا جلوہ نہیں ہے | ولیکن مجھے چشم بینا نہیں ہے
لب جانفزا کا تمہارے ہے شہرہ | کوئی نام عیسیٰ کا لیتا نہیں ہے
نگاہ تلطف کو ہرگز نہ کم کر | ستم اس سے کوئی زیادہ نہیں ہے
ہے زخم کہن اپنا ویسا ہی تازہ | کوئی اور احوال تازا نہیں ہے
جو چاہے ستم کر گوارا ہے مجکو | مگر تیری فرقت گوارا نہیں ہے
ہے طاعت پہ مغرور نادان زاہد | ترے سجہ میں رام دانا نہیں ہے
رہِ منزل دل نہ کیوں کر ہو مشکل | یہ پاؤں سے جانے کا رستہ نہیں ہے
مسخر ہوا وہ پریرو ہمارا | سلیماں سے کم اپنا رتبہ نہیں ہے
تجھے بحر غم سے گزرنے کو اے شوقؔ | ہماری غزل کا سفینہ نہیں ہے

طرز غالبؔ مجھے اب شوقؔ بہت ہے مرغوب | ابتدا میں تو میں کچھ معتقد میرؔ بھی تھا

(۳۷)

(۲)

مولانا شاہ محمد علی حبیب نصؔر پھلواروی

شاہ محمد علی حبیب نام، نصؔر تخلص۔ حضرت مولانا شاہ ابوالحسن فردؔ کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت ۲۵؍رمضان روز چہارشنبہ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۵ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولانا ابوتراب سے حاصل کی۔ اور تکمیل درسیات مولانا محمد حسین سے ۴؍شعبان بروز جمعہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ آپ کو حدیث سے بے انتہا شغف تھا۔ اس لئے اپنے چچازاد بھائی مولانا شاہ آل احمد محدث مہاجر مدنی کو مدینہ طیبہ سے بلوایا۔ اور عرصہ تک اپنے یہاں مقیم رکھ کر ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۲۶۳ھ میں اپنے والد حضرت فردؔ سے مرید ہوئے۔ ۲۹؍ربیع الاول ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء میں خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں ہوئے۔

۲۷؍ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔

حضرت نصؔر شعر وسخن کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ کلام حقائق ومعارف سے لبریز ہوتا تھا، نصؔر تخلص کرتے تھے۔ دیوان آپ کا ''دیوان معجز بیان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے اردو کلام میں پختگی اور برجستگی ہے۔ آپ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے، لیکن اردو اشعار میں فارسی ترکیبات استعمال نہیں کی ہیں۔ بہت صاف اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

صحرا نوردی اپنی بڑھی یہاں تلک کہ اب — پھیلا یا بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤں
ہاں اے کمندزلف کچھ امداد چاہئے — جا کر پھنسا ہے قعر میں چاہ ذقن کے پاؤں
اس آہوئے رمیدہ کا ہم پا، ہے دل مرا — اس کی چلن نے دل کو کیا جیون ہرن کے پاؤں
ہے فرش راہ دیدۂ نرگس، اگر چہ وے — رکھتے نہیں ہیں اس پہ بھی اندر صحن کے پاؤں
کم خواب آنکھیں ہوگئیں حسرت میں آپ کے — آنکھوں پہ آکے رکھیے گل ونسترن کے پاؤں

تشریف لاکے خانۂ دل آباد کیجئے
یا پاس رکھئے نصؔر کے بیت الحزن کے پاؤں

کوچہ میں تیرے بیٹھے رنج ومحن سے نکلے — اس خاک در پہ تیرے آرام تن سے نکلے

روکھا سخن ہو اس کا دل پر نہ جس کے گذرے　　کیونکر یہ درد و لذت خالی سخن سے نکلے
اخگر فشاں ہے آتش سینہ کیا عجب ہے　　مرنے کے بعد میرے شعلہ کفن سے نکلے
دشنام تلخ گذرے غیروں پہ گرچہ ہم کو　　ہے شہد زہر بھی جو تیرے دہن سے نکلے
اے دل ربا میں دل سے دھو بیٹا ہاتھ اب تو　　گیسو کے تیرے کیونکر پیچ و شکن سے نکلے
چشم ہرن سے کیا ہے آنکھوں کو تیری نسبت　　کب وہ ادائے غمزہ چشم ہرن سے نکلے

اے نصرؔ کاش بینم روئے حبیب خودرا
جان عزیز جس دم اس قیدتن سے نکلے

حضرت نصرؔ کے کچھ اردو مراثی بھی ہیں۔ مرثیہ کی زبان زیادہ سلیس و فصیح ہے۔

مرثیہ کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وحشت گربت میں جگر بند بوتراب　　آج تنہا رہ گئے ہیں اور اعدا بے حساب
فوج میں ان شامیوں کے وہ شہ عالی جناب　　آسمان نیلگوں پر جس طرح سے آفتاب
سبط پیغمبر حسین ابن علی جان عرب　　رونق بزم امامت فخر ارکان عرب
تشنگی سے خشک لب ہیں وہ شہ والا تبار　　کربلا میں بے کس و بے مونس و بے غمگسار
کیوں نہ ہوے چشم زہرا غیرت ابر بہار　　ہائے ابن ساقئ کوثر کو ہو یوں قحط آب

(۳۸)

(۳)

مولانا شاہ محمد حسین رمزؔ حاجی پوری

شاہ محمد حسین نام، رمزؔ تخلص۔ پہلے زار پھر رمزؔ تخلص اختیار کیا۔ حضرت شاہ واحد علیؒ کے صاحبزادے۔ مولد و مسکن جروہہ (حاجی پور) ضلع ویشالی۔ سال ولادت ۵ رمحرم ۱۲۷۱/۲۸ ستمبر ۱۸۵۴ء۔ روز پنجشنبہ ہے۔ اصل وطن بخارا تھا، لیکن ان کے جداعلیٰ شاہ محمد خلیل عرف شاہ بھیگا بہ سلسلہ ملازمت ہندوستان آئے۔ خدمت درگاہ ماموں بھانجہ کے سبب جروہہ، حاجی پور میں آباد ہو گئے۔ صغر سنی ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے تعلیم و تربیت کا بوجھ اپنے سر لیا۔ حصول تعلیم کے لئے اپنی نانیہال یوسف پور ضلع سارن میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ماں کے سایہ

عاطفت سے محروم ہوئے تو پٹنہ چلے گئے۔ درگاہ شاہ ارزاں میں ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے جناب سید شاہ منیر الدین اور جناب سید شاہ عزیز الدین سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ پھر پھلواری شریف چلے آئے اور خانقاہ مجیبیہ میں فارسی کی کتابیں حضرت مولانا سید شاہ محمد بدرالدین اور منشی ولی الحق وحشیؔ پھلواروی سے پڑھیں۔ تکمیل درس مولوی احمد کبیر حیرت پھلواروی سے کی۔ یہیں تقریباً ۱۲۸۹ھ میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ حکیم عظیم الدین اثر استھانوی سے کچھ غزلوں پر اصلاح لی۔ پھر اساتذہ کے دیوان کو مشعل ہدایت بنا کر مشق سخن کرتے رہے۔ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، داغؔ دہلوی، وحیدؔ الہ آبادی، شاغلؔ دہلوی، صفیرؔ بلگرامی، اکبرؔ دانا پوری، شادؔ عظیم آبادی، شوقؔ نیموی، احقرؔ بہاری اور اثرؔ عظیم آبادی سے ان کے مراسم تھے۔ تصانیف میں نعتیہ دیوان اور عشقیہ دیوان موجود ہیں۔ ایک مسدس ارشاد و سنن بھی مطبوعہ ان کی یادگار موجود ہے۔ جو مطبع حنفیہ بخشی محلہ پٹنہ سے ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔

حضرت رمزؔ نے ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں انتقال فرمایا۔

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ دل تو دے جو ترے نام پر رہے قرباں — وہ سر تو دے جو رہے جبہ سا ترے در پر
ہمارا عہد وفا یہ کہ جان تک دے دی — تمہارا وعدۂ دیدار وہ بھی محشر پر
وہ مست ہوں کہ ہر اک غنچہ کو سبو سمجھا — گمان ساغر کامل کا کیا گل تر پر
فراق یار میں ایسا نحیف و زار ہوں میں — گراں ہے مور کا سایہ بھی جسم لاغر پر

کیا وجہ کہ سب کرتے ہیں بدنام قضا کو — دھبہ کوئی لگتا نہیں شمشیر ادا کو
بننا تھا سنورنا تھا تری زلف دوتا کو — مٹنا تھا، بگڑنا تھا، مرے نقش وفا کو
اے یار کھلے ناخن تدبیر سے کیوں کر — قسمت کی گرہ مل گئی ہے بند قبا کو
نکلی ہوئی ہیں پیاس سے خنجر کی زبانیں — ہمت دے خدا حوصلۂ آبلہ پا کو
اے جاں یہ شب وصل ہے کر دیجئے رخصت — شوخی کو، شرارت کو، خموشی کو حیا کو

مزہ لے لے کے اے قاصد وہ سنتا داستاں میری — کسی ڈھب ترے منہ میں اگر ہوتی زباں میری

پس مردن ہوا کھاتا ہوں میں گلزار جنت کی
تری رحمت کے صدقے ایسی قسمت تھی کہاں میری

پے اظہار سوز دل تری محفل میں کیا آؤں
بہ شکل شمع کٹوائے گا ناحق تو زباں میری

کوئی آرام کا پہلو نہیں، کیا ضیق میں دم ہے
نکل جائے کہیں تن سے یہ جان ناتواں میری

کلیجہ تھام لیتا ہاتھ سے، بے تاب ہو جاتا
پہنچ جاتی اگر گوش ستمگر تک فغاں میری

جب آئی ساتھ تھی تو ساتھ ہی اے رمزؔ جانا تھا
مجھے کیوں چھوڑ کر تنہا گئی عمر رواں میری

تسلی کے لئے کہتی ہے یہ دل کی کشش دل سے
سفر میں چاہئے ہمت نہ ہارے بعد منزل سے

تہہ شمشیر قاتل ہر طرف وہ یاس سے تکنا
لرز جاتا ہے دل تیر نگاہ چشم بسمل سے

خبر ہے آج وہ آئیں گے دل برباد کرنے کو
مزا ہو گر بدل لوں اپنے دل کو غیر کے دل سے

نہ جانوں کیا کیا تیری ادا نے تیرے چتون نے
جو دل تھامے ہوئے نکلے ہزاروں تیری محفل سے

ہوئی ہے کس طرح تم کو حیات جاوداں حاصل
کوئی اتنا تو پوچھے کشتگان تیغ قاتل سے

کون دل لے گیا پہلو سے یہ آفت کیا ہے
شوخیٔ چشم ستمگر کی شرارت کیا ہے

ہو گی مائل نہ کبھی زینت دنیا کی طرف
ناز کرتا ہوں کہ میری بھی طبیعت کیا ہے

کیوں اٹھانے سے بھی اٹھتا نہیں لاشہ میرا
دل میں کمبخت کے باقی کوئی حسرت کیا ہے

دل وہ کیا رنج و الم کا متحمل جو نہ ہو
جو مصیبت میں نہ ٹھہرے وہ طبیعت کیا ہے

گو گرفتار محبت ہوں خبر کیا مجھ کو
کشش آہ ہے کیا، جذب محبت کیا ہے

یار دریا میں نہ دھو دست حنائی اپنا
آگ پانی میں لگانے کی ضرورت کیا ہے

جل گیا طور، ہوئے حضرت موسیٰ ؑ بے ہوش
کیا کہوں برق تجلی کی حقیقت کیا ہے

رکھ گئے قبر میں جس وقت عزیز واحباب
مجھ کو آغوش میں لینے تری رحمت آئی

جل کے دل خاک ہوا خاک بھی برباد ہوئی
اب تو ٹھنڈک تجھے اے سوز محبت آئی

غیر پہلو میں جو بیٹھا تو نہ آئی کچھ شرم
میں نے دو بات جو کی دور سے غیرت آئی

صاف ہو جاتا ہے انساں کا مکدر چہرہ
جب ذرا آئینہ دل میں کدورت آئی

بیکسی پر مری جب رحم کسی نے نہ کیا | شمع روتی ہوئی آخر سرتربت آئی
نعمتیں اوروں کو تقسیم ہوئی روزازل | میرے حصے میں یہ پھوٹی ہوئی قسمت آئی
عنبریں لفوں کا مارا ہوں تعجب کیا ہے | قبر میں میری اگر زلف کی نکہت آئی
راہ پر پیچ وخطر ناک تھی اے بادصبا | کوچہ زلف سے کیوں کرتو سلامت آئی
شکوۂ جور وجفا ان سے میں کرتا کیوں کر | آنکھیں جب چار ہوئیں دل میں مروت آئی
ہائے تقصیر کرے کوئی گنہگار ہو کون | آنکھیں اس بت سے لڑیں جان پہ نوبت آئی

آنے والی تھی مگر رمزنہ اتنی جلدی
ان کی رفتار سے بے وقت قیامت آئی

(۳۹)

(۴)

مولانا سید محمد ضمیر الحق قیسؔ آروی

سید محمد ضمیر الحق نام، ابوالخیر کنیت، اور قیسؔ تخلص۔ محلہ چوک آرہ ضلع شاہ آباد موجودہ ضلع بھوجپور کے رہنے والے تھے۔ ولادت ۲۱ر رمضان ۱۲۸۰ھ کو ہوئی۔ والد ماجد کا نام سید نبی بخش تھا۔

مختلف اساتذہ سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۹۸ھ کو مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے۔ اور جناب مولانا حافظ محمد عبد اللہ غازی پوری سے تعلیم حاصل کر کے شوال ۱۳۰۳ھ میں فراغت حاصل کی۔ پھر ۱۳۰۳ھ میں دہلی پہنچ کر فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین سے فن حدیث کی اجازت حاصل کی۔

ابتدا ہی سے جناب قیسؔ کی طبیعت کا میلان شعر وسخن کی طرف تھا۔ مولانا عبد الاحد شمشادؔ لکھنوی سے تلمذ تھا۔ آپ کا شعری مذاق پاکیزہ اور اسلوب بیان قابل تعریف ہے۔ جلسہ مذاکرہ علمیہ آرہ کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت کرتے۔ آپ کے کلام کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

طور ہی پر نہیں موقوف نظارہ تیرا | چشم بینا ہو تو ہر شئے میں ہے جلوۂ تیرا
بت کے پردے میں کہیں تیری پرتش دیکھی | ذکر ہوتے کبھی دیکھا لب ددریا تیرا

پرتو رخ کی جھلک ہی سے گرے غش کھا کر حسن کیا دیکھتے پھر حضرت موسیٰ تیرا

قیس نے جان محبت میں تڑپ کر دیدی اور منت کش اعجاز مسیحانہ ہوا

بجلی گرائی خرمن ہوش وحو اس پر کیوں دیکھ کر وہ میری طرف مسکرا دیا
مانا کہ تم کو غیر کی خاطر عزیز تھی لیکن یہ کیا کیا جو مرا دل دکھا دیا!
اے ناخن جنوں میں ترا شکر کیا کروں لب بند زخم جب ہوئے تونے ہنسا دیا

داغوں سے بنا ہے پر طاؤس دل اپنا سرسبز چمن اس کے برابر نہیں ملتا
تڑپاتے ہیں مجکو خلش نوک مژہ سے پھر بھی یہ شکایت ہے کہ نشتر نہیں ملتا

نادانی فرہاد تھی سر پھوڑ کے مرنا اس سے کوئی عشق میں کامل نہیں ہوتا
ہر دل میں حسینوں کی شباہت نہیں جمتی ہر آئینہ تصویر کے قابل نہیں ہوتا

بے حجابی میں تو ہے اللہ رے اتنا حجاب یہ نہیں معلوم کیا ہوتا اگر ہوتا حجاب

مرنے کے بعد بھی ہے اثر انتظار کا نرگس کے پھول پھولے ہیں مدفن کے آس پاس
کانوں تک آپ کے مرے نالے نہ جاسکے پھیرے لگا کے رہ گئے روزن کے آس پاس
ہیں دل کے اردگرد پھپولے پڑے ہوئے روشن ہیں قمقمے ترے مسکن کے آس پاس

تیری طلب میں تجکو بنائیں گے رہنما تیرا نشان لیں گے ترے نقش پا سے ہم
درد دل، درد جگر، سوز الم، داغ فراق جاتے ہیں یہ آفتیں لے کر تری محفل سے ہم

فرماتے ہیں سن کر وہ غم ہجر کے صدمے تصویر خیالی سے بہل کیوں نہیں جاتے
مانا کہ ہے دلسوز مری شعلہ بیانی تم موم کی صورت ہو پگھل کیوں نہیں جاتے

(۴۰) حضرت قیس آروی کی وفات ۲۹ رستمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔

(۵)

حکیم احتشام الدین مشرقیؔ منیری

حکیم احتشام الدین حیدر نام، مشرقیؔ تخلص، شاہ خلیل الدین احمد جوشؔ منیری کے فرزند تھے۔ قصبہ منیر ضلع پٹنہ مولد مسکن تھا۔ ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ ایام طالب علمی سے شعر وسخن کا ذوق تھا۔ حضرت صوفیؔ منیری کے شاگرد تھے۔ بچپن سے ہی مشق سخن جاری تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی فکر سخن کی ہے اور اردو سے زیادہ زوردار کلام فارسی کا ہے۔ کلیات فارسی موسوم ''بہ بضاعت مزجاۃ'' اور کلیات اردو ''مغتنمات'' آپ کی علمی یادگار ہے۔ کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ معنی آفرینی، نزاکت تمثیل اور جدت وندرت مضامین کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ سلاست اور صفائی زبان کا بھی لحاظ آپ کی شاعری میں موجود ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

میں بھی غضب کا شیفتہ ظلم یار تھا — ہر لحظہ طالب ستم روزگار تھا
سب مٹ مٹا گیا جو دل خاکسار تھا — کمبخت یہ بھی کوئی عدو کا مزار تھا
یارب! جو یاد ہوتو کروں کچھ شمار میں — میرا گناہ غم کی طرح بے شمار تھا
اک دن یہ ہے کہ دل مرا، ملتے ہو پاؤں سے — اک دن وہ تھا، گلے کا تمہارے یہ ہار تھا
کیا خوب حسن وعشق کا تھا مشرقیؔ! اثر — میں اس کا اور وہ مرا میدوار تھا

کیا بات کروں حشر میں اللہ کے آگے — مجکو تو نہیں اس بت کافر کے سوا یاد
میں بھول گیا نشہ میں باتیں تری واعظ! — ہاں ہے تو فقط ایک مئے ہوشربا یاد
کچھ خوف نہ کر، حشر میں اپنے ستموں سے — تیری ہی قسم ہے کہ نہیں مجھ کو ذرا یاد
مرجانے پہ بھی میری تڑپتی ہے رگ جاں — اب تک ہے گلے کو ترے خنجر کا مزا یاد
اس یاد سے پھر فائد کیا مشرقیؔ! آخر — دل میں تو ہیں بت اور زباں پر ہے خدا یاد

جو سوئے دور شراب رند ونگاہ پیر مغاں رہیگی — تو غم نہ کھاؤ کہ پھر مخالف نہ گردش آسماں رہیگی
پڑے تو ہو میرے دل کے پیچھے، کچھ اپنی حسرت کی بھی خبر ہے؟ — کہ اسکو ویراں اگر کروگے، تو پھر یہ آخر کہاں رہیگی

ہے گرچہ دل ایک قطرہ خوں ،مگر ہے سرمایہ دو عالم
کہ اے تونگر! وہ ایک دولت یہی ہے جو جاوداں رہیگی
ستم کرو یا کرم کرو تم ، ہیں مغتنم دونوں ہی، کہ آخر
نہ مجمع دشمناں رہے گا، نہ مجلس دوستاں رہیگی !

آباد کبھی اپنا بھی ویرانہ دل تھا
اک شمع سے پرنور تھا،کاشانہ دل تھا
سنگ ستم چرخ سے مئے خاک نے پی اور
اک لخت ہوا چور جو پیمانہ دل تھا
کیوں مشرقیؔ،غمزدہ کا دل نہ ہو بیجان
اب قبر کی ہے جان جو جانانہ دل تھا

ہم نے جب تک تجھے ڈھونڈا نہ ملا تو ہم کو
آپ جب کھوگئے تب ہاتھ لگا تو ہم کو
ہم نے مانا کہ ہے حق ''لیس کمثلہ شئی''
بارے کیسا ہے !کبھی منہ تو دکھا تو ہم کو
مشرقیؔ! تجھ کو ہمارے لئے زحمت کب تک
چھوڑ تقدیر پہ اب بہر خدا تو ہم کو

زاہد! وہ بت ہے نور خدا سر سے پاؤں تک
سر قضاہے اس کی ادا سر سے پاؤں تک
بولے، جب آئی زلف رسا سر سے پاؤں تک
پیچھے پڑی یہ کیسی بلا سر سے پاؤں تک
شوخی بھی شکل شعلہ فانوس ہے عیاں
گو ہے پڑا نقاب حیا سر سے پاؤں تک
کل مشرقیؔ کو میں نے جو دیکھا تو راہ میں
ڈوبا ہوا شراب میں تھا سر سے پاؤں تک

(۴۱)

۲۰ رشوال ۱۳۴۳ھ کو وفات پائی۔

(۶)
غلام مصطفیٰ فخرؔ سہسرامی

ابوالانوار کنیت، غلام مصطفیٰ نام، فخرؔ اور شفاؔ تخلص۔ والد ماجد کا نام شیخ فخر الدین صدیقی۔ عوام وخواص آپ کی بے حد تعظیم کیا کرتے تھے۔ ولادت ۱۲۸۵ھ میں پٹھان ٹولی سہسرام ضلع شاہ آباد (آرہ) موجودہ ضلع بھوجپور میں ہوئی۔ ابتدائی کتابیں سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں پڑھی۔ پھر حضرت مولانا فاروق چریا کوٹی سے علم وادب اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے

بعد مولانا عبد الوہاب بہاری سے بقیہ کتابیں دار العلوم کانپور میں ختم کیں۔ حدیث کی تعلیم حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے حاصل کی۔

شعر وسخن کا مذاق رکھتے تھے۔ کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

ترا وصف پاک تری ثنا تری شان جل جلالہ — نہ ہوئی کسی سے نہ ہوا ادا تری شان جل جلالہ
تو جلیل ہے تو جمیل ہے نہیں کوئی تیرا مثیل ہے — تو ہی لاشریک ہے ربنا تری شان جل جلالہ
تو رحیم ہے تو قدیم ہے تو علیم ہے تو کریم ہے — ترے رحم کی نہیں انتہا تری شان جل جلالہ
تو قریب ہے تو مجیب ہے تو حبیب ہے تو طبیب ہے — ترے نام پاک میں ہے شفا تری شان جل جلالہ
یہ جہاں کا ہے فسانہ کیا یہ زمیں کیا یہ زمانہ کیا — تو نے کن کہا تو یہ ہو گیا تری شان جل جلالہ
تری نعمتیں تری رحمتیں تری قدرتیں تری حکمتیں — انہیں کون سمجھے ترے سوا تری شان جل جلالہ
تو ہی راہبر تو ہی رہنما تو ہی بھولے بھٹکوں کا آسرا — مجھے سیدھی راہ عمل دکھا تری شان جل جلالہ
تو بیکسوں کا رفیق ہے تو ہی چارہ ساز شفیق ہے — تو ہی قید غم سے کرے رہا تری شان جل جلالہ
گل وغنچہ اور شجر میں ہے مہ ومہر شمس وقمر میں ہے — ترا نور سب میں ہے اے خدا تری شان جل جلالہ
جو بنا ہے اسکو بگاڑ دے جو جما ہے اسکو اکھاڑ دے — ترے قبضے میں ہے فنا بقا تری شان جل جلالہ
ہو غریب کوئی امیر ہو کوئی بے نوا ہو فقیر ہو — ہے یہ سب کے حق میں دوا دعا، تری شان جل جلالہ
اٹھوں جب میں قبر سے حشر میں جو چلوں میں ساتھ سولؐ کے — یہی حمد تیری پڑھوں خدا تری شان جل جلالہ
میں گناہ گار ہوں سر بسر مری معصیت پہ نہ کر نظر — مجھے بخش دے تو مرے خدا تری شان جل جلالہ
ہے خدا سے فخرؔ کی آرزو کہ جہاں میں رکھے وہ آبرو — بہ طفیل حضرت مصطفیٰؐ تری شان جل جلالہ

یار کی راہ میں مٹنے سے بقا ہوتی ہے — سرمہ پس جائے تو پھر آنکھ میں جا ہوتی ہے
زخم دل پھوٹ گیا نشتر غم سے شاید! — آبلے روتے ہیں سینے میں صدا ہوتی ہے

حسرتیں ہیں بند اپنی سینۂ صندوق میں — یہ متاع عشق بھی ہے قبضۂ معشوق میں
اک نگاہ قہر میں لاکھوں نشانہ بن گئے — کیا غضب کی مار ہے ظالم تری بندوق میں

ہم سے کوئی پوچھے ترے مقتل کا تماشا　　بے خودکوئی مضطر کوئی بسملؔ نظر آیا
ہے اپنی فناعین بقا خوب سمجھ لو　　خود سے جو ہوادور وہ واصل نظر آیا
ہشیار کہ غفلت ہے حجاب رہ مقصود　　اے فخرؔ تو اپنے ہی سے غافل نظر آیا

(۴۲)

(۷)

مولانا قاضی عبدالوحید وحیدؔ عظیم آبادی

قاضی عبدالوحید نام، وحیدؔ تخلص۔ والد کا نام عبدالحمید۔ سال ولادت ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء ہے۔ منظور الٰہی تاریخی نام تھا۔ ہمایوں کے زمانے سے اس خاندان کے لوگ قاضی ہوتے چلے آرہے تھے۔ اسی مناسبت سے نام سے پہلے قاضی شامل ہے۔ قاضی عبدالوحید نہایت ذی علم اور عظیم آباد کے رئیس تھے۔ بہت سے طلبہ کو دینی تعلیم کے لئے ماہانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔

حضرت وحیدؔ کو اردو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ آپ کا کلام گلدستہ فردوس خیال میں چھپا کرتا تھا۔

آپ کی وفات ۱۱/ربیع الاول ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔

گلدستہ خیال کے ۱۵/نومبر ۱۸۹۵ء کے شمارہ میں مصرع طرح تھا۔ ''بے رنج اٹھائے راحت نہیں ملتی'' اس پر وحیدؔ عظیم آبادی کی غزل یہ تھی۔

ملاحظہ کیجئے ؎

آلام نہیں ملتے کہ حسرت نہیں ملتی!　　کیا شئے ہے کہ اس دل کی بدولت نہیں ملتی
دل ڈھونڈھتا جس کو ہے وہ صورت نہیں ملتی　　آرام کی ہم کو کوئی ساعت نہیں ملتی
یوں کیوں نہیں کہتے ہو کہ آئیں گے نہیں ہم　　یہ کون سا حیلہ ہے کہ فرصت نہیں ملتی
وہ فضل سے اپنے جسے چاہے اسے دیدے　　علم وہنر وعقل سے دولت نہیں ملتی
دل پاس ہے ان کے تو تقاضے کی ہے صورت　　پروا نہیں مجکو جو امانت نہیں ملتی
آئینہ ذرا دیکھو تو وہ کون ہے بیٹھا　　کیا تم نے کہا؟ میری سی صورت نہیں ملتی
اللہ کرے رحم، مرادل ہے کھٹکتا　　جانے کی ہمیں آج اجازت نہیں ملتی

۱۵؍ردسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارہ میں مصرع طرح تھا۔''عیاں ہے جلوہ تر صاحب نظر کے لئے، اس پر حضرت وحیدؔ کی یہ غزل تھی۔

دم آخیر بھی آئے نہ وہ خبر کے لئے ترستے ہم چلے دنیا سے اک نظر کے لئے
مجھے یقین ہی ہوتا نہیں ہے اے قاصد! وہ اور آدمی بھیجیں مری خبر کے لئے
علاج خاطر آشفتہ کیا کروں ہمدم اجل بھی ہجر میں آتی نہیں خبر کے لئے
کھلے نہ باب اجابت تو کیا کرے کوئی دعا تو روز گئی چرخ پر اثر کے لئے
دل ان کو دے کے بڑھے اور حوصلے اپنے مجھے امید تھی چھوٹا میں عمر بھر کے لئے
کوئی گھڑی میں وہ آتے ہیں صبر کرائے دل! وہ پہنچی تیری دعا عرش پر، اثر کے لئے
قصور مجھ سے ہوا ابوسہ میں نے گر مانگا یہ حجتیں ہیں عبث حرف مختصر کے لئے
کسی کی زلف کا سودا ہے جب تلک اے دل! نہ ساز گار دوا ہوگی دردسر کے لئے
وحیدؔ دم میں خدارا نہ ان کے آجانا یہ اتحاد ہے سارا دل وجگر کے لئے

شمارہ جنوری ۱۸۹۶ء میں مصرع طرح تھا۔قہر کا توڑ تیرے ناوک بیدار میں ہے۔اس پر قاضی عبدالوحیدؔ کی غزل یہ تھی۔

ہچکیاں بے سبب آتی نہیں پیہم مجکو ہو نہ ہو آج کوئی شوخ مری یاد میں ہے
کیا کرے گا وہ ہمارے رگ سودا کا علاج اتنی تیزی ہی نہیں نشتر فصاد میں ہے
تم تو کہتے تھے مجھے تجھ سے تعلق ہی نہیں کون یہ جلوہ فگن خاطر ناشاد میں ہے
چشم تمنا کی کیوں تجھ سے تمنا کیجئے لطف کیا کم مجھے ظالم تری بیداد میں ہے
بال و پر نوچ کے بھی اس نے نہ آزاد کیا ابھی کیا جانئے کیا خاطر صیاد میں ہے
تم سے بے مثل کی تصویر وہ کیا کھنچیں گے یہ بھی اک خبط دل مانی و بہزاد میں ہے
جاں بلب بھی جو کوئی دیکھ لے اچھا ہو جائے معجزہ آپ کے یہ حسن خداداد میں ہے
سیکڑوں غیرت گل آتے ہیں ہنگام سحر کون سی ایسی ادا نکہت برباد میں ہے

اک نظر میں ہوئے دل اور جگر صاف وحیدؔ
ایسی تیزی بھی کسی خنجر جلاد میں ہے ؟

(۴۳)

(۸)
مولانا سید حسن مرتضیٰ شفقؔ رضوی عماد پوری

سید حسن مرتضیٰ نام، شفقؔ تخلص۔ ولادت ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید رضی اور دادا سید کرامت علی مفتی عدالت الہ آباد مقرر ہوئے تھے۔ شفقؔ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ان کا وطن عماد پور تھا جو ضلع گیا میں واقع ہے۔ پھر وہ اپنے والد کے ساتھ الہ آباد آ گئے۔ ان کے ایک اہم استاد علامہ شوقؔ نیموی رہے، جن سے انہوں نے حدیث کا درس لیا۔ شفقؔ ۹/ ۱۰ سال کی عمر سے نعتیہ اشعار کہنے لگے۔ پہلے انہوں نے حسنؔ تخلص کیا اور مولانا شوقؔ کی ایما پر اپنا تخلص بدل کر شفقؔ کر لیا۔

ویسے تو شفقؔ ایک پر گو شاعر تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ریاض شفقؔ کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظم، غزل، قصیدہ اور رباعی ہے لیکن ریاض شفقؔ میں ان کا پورا کلام نہیں ہے۔ (۴۴)

شفقؔ یوں تو مختلف لوگوں سے اصلاح لیتے رہے لیکن بقول کلیم عاجزؔ فکری اعتبار سے حالی اور شبلی اسکول سے متاثر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ

''امیرؔ مینائی یا شوقؔ نیموی کی شاگردی کے باوجود اس عہد کے شعراء کے برعکس شفقؔ کا مزاج اور ان کا عشق صرف غزل گوئی کے دائرے میں مقید نہیں رہا۔ شفقؔ نے اہل جدید کی اردو شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ اور ماحول کی عکاسی کی طرف متوجہ رہے۔ مسائل کو بھی شاعری کا موضوع بنایا۔ اور مختلف موضوعات مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ملکی مسائل کو فکر وفن کے سانچے میں ڈھال کر اپنے عہد کے عمومی شعراء کے میدان فکر سے آگے نکل گئے۔ شفقؔ فطری اعتبار سے حالیؔ اور شبلیؔ اسکول سے متاثر ہیں۔'' (۴۵)

نمونہ کلام یہ ہے ؎

شرمندہ احساس مسیحا نہیں ہوتا — اچھا ہے وہ بیمار جو اچھا نہیں ہوتا
فریاد نہیں ہوتی کہ نالہ نہیں ہوتا — اک تم نہیں ہوتے ہو تو کیا کیا نہیں ہوتا
آؤ گے یونہیں کل یہی تم آج ہو جیسے — ہونے کو تو کب وعدہ فردا نہیں ہوتا
جس داغ کا مرہم ہو نہ جس درد کا درماں — اس کی یہی صحت ہے کہ اچھا نہیں ہوتا
وہ برگ ہوں جو بار نہ ہو دامن گل پر — وہ پھول ہوں جس پھول میں کانٹا نہیں ہوتا

ہر شمع کی لو برق تجلی نہیں ہوتی — ہر داغ چراغ ید بیضا نہیں ہوتا
کھلتے ہیں شفقؔ پھول بھی پھلتے ہیں شجر بھی — ہاں بارور اک نخل تمنا نہیں ہوتا

(۴۶)

کیوں طور پہ جائیں اے موسیٰ وہ دل میں نظر آجائے گا — نزدیک سے دیکھا نہ گیا کیا دور سے دیکھا جائے گا
جب آخری منزل آئے گی وہ سامنے خود آجائے گا — اک اک پردہ دوری کا ہر سانس پہ اٹھتا جائے گا
گھر سے ہمیں کیا مطلب ہے شفقؔ گھر والے کے مل جانے سے غرض — بت خانہ میں وہ نہ ملا نہ سہی کعبہ میں نظر آجائے گا

جو ہو پاس ادب مانع عیاں راز نہاں کیوں ہو — دہن میں پھر زباں کیوں ہو زباں پر پھر فغاں کیوں ہو
مکاں یا لامکاں اس گھر میں تم ہو پوچھنا یہ ہے — نشاں اپنا بتا کر سب کو ایسے بے نشاں کیوں ہو
کبھی گل چیں کبھی صیاد جس کو دور سے تاکے — چمن میں ہمسفر اتنا اونچا آشیا کیوں ہو
کوئی دور ہو جہاں رکھ دوں گا سر بن جائے کعبہ — غرض سجدوں سے ہی پھر اک تیرا ہی آستا کیوں ہو
بہار آنے سے پہلے ہم اٹھا لے آشیاں اپنا — خفا گل چیں عدو صیاد دشمن باغباں کیوں ہو
خدا جانے یہ کیسی دوستی ہے دشمنی کیسی — بنو تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو
شفقؔ تو نے نہ کی جب قدر اپنی بے نیازی سے — کسی کو کیا غرض ایسے کا کوئی قدر داں کیوں ہو

(۴۷)

(۹)

مولانا اکرام الدین احمد عرفان اسلام پوری

اکرام الدین احمد نام، عرفان تخلص، والد کا نام شاہ معین الدین احمد ہے۔ آبائی وطن شیخپورہ ضلع مونگیر تھا۔ آپ کے والد نے اسلام پور میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آپ کی ولادت ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں اسلام پور میں ہوئی۔ آپ کے نانا چودھری ظہور الحق نے آپ کے تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ کی۔ اور حضرت مولانا سید محمد شہباز پوری کی خدمت میں تعلیم وتربیت کے لئے دیدیا۔ آپ نے مولانا سید سلیمان ندوی کے والد حکیم ابوالحسن سے بھی اکتساب فیض کیا۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ آپ نے غالبؔ کے شاگرد صوفی منیری سے اصلاح سخن لیا۔ اور باضابطہ فن شاعری میں اکتساب فیض کرتے رہے۔ آپ کے معاصرین میں زیادہ تر داغؔ دہلوی

کے شاگرد تھے۔اس لئے آپ کو داغؔ کا رنگ پسند آیا۔زبان میں داغؔ کے رنگ کی پیروی کی۔آپ کی شاعری میں غزل کی چاشنی، زبان کی دل آویزی اور تصوف کی دل گداختگی اور رنگارنگی بدرجہ اتم موجود ہے۔وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسلک جو تصوف کا اہم ترین مسئلہ ہے، عرفان اسلام پوری کے اشعار میں موجود ہے۔

آپ کا وصال ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء میں اسلام پور میں ہوا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

عاشق ہے گل عذار کس کا دل اس کا ہے داغدار کس کا
ہر گل میں یہ سب بہار کس کی ہے سنگ میں یہ شرار کس کا
نسبت تو ہے بس اسی سب کو گل اس کے ہوئے تو خار کس کا
عزت ہے مری تو بس یہی ہے وہ پوچھیں کہ تو ہے خوار کس کا
روکے اسے عشق و عاشقی سے ہے دل پر یہ اختیار کس کا
یہ حال کھلا نہ کچھ بھی عرفاںؔ
ہے تجھ کو یہ انتظار کس کا

اور ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

سرچشمۂ معانی ذوق خیال تیرا معنی زندگانی شوق وصال تیرا
دل خون کن عزیزاں شورجلال تیرا مجموعہ بہاراں رنگ جلال تیرا
اوراک سے منزہ یارب ہے ذات تیری کیا کر سکے تصور فکر خیال تیرا
مر کر ملے گی عرفاںؔ تجھ کو حیات تازہ
تیرے زوال میں ہے پنہاں کمال تیرا

حضرت عرفاں اسلام پوری کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور زبان کی دل آویزی بھی۔اس لئے ان کا کلام دو آتشہ بن گیا ہے۔ایک غزل کے تین اشعار اور ملاحظہ کیجئے ؎

اس کا جلوہ تو عیاں ہے کوئی مستور نہیں
دیکھ لے آنکھ مگر اس کو یہ دستور نہیں
کبھی جلنے کا نہیں لاکھ ہوں جلوے اس پر

ہے یہ نخل دل عاشق شجر طور نہیں
کیوں نہ دوزخ بھی ہو جنت مجھے جب خود وہ کہے
اس گنہگار کو لے جاؤ یہ مغفور نہیں (۴۸)

(۱۰)
سید شاہ سید علی کاملؔ اسلام پوری

سید شاہ سید علی نام، کاملؔ تخلص، قصبہ اسلام پور ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ وطن ہے۔ ۱۲/صفر ۱۲۹۵ھ تاریخ ولادت ہے۔ آپ حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیریؒ تلمیذ حضرت غالبؔ دہلوی کے فرزند اصغر اور حضرت سید شاہ ولایت علیؒ کے نواسے تھے۔ جو خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشیں تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد کے زیر سایہ ہوئی۔ علوم عربیہ دینیہ کی تحصیل حضرت مولانا حکیم سید شاہ محمد رفیق سے کی۔ پھر کانپور کے مشہور عالم حضرت مولانا احمد حسن کی طرف رجوع کیا۔

کاملؔ اسلام پوری ایک بزرگ و صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے بہار کی صوفیانہ شاعری کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ مشورہ سخن حضرت عرفان اسلام پوری سے فرماتے تھے۔ حضرت صوفیؔ منیری نے خلافت سے نوازا اور اپنے اشعار کا مجموعہ کلیات صوفیؔ منیری اپنی زندگی میں عطا کر دیا۔ (۴۹)

نمونہ کلام یہ ہے ؎

پھر وہ رشک گل تر یاد آیا — پھر وہ منظور نظر یاد آیا
حیف اس دل پہ ہے جس کو اے دوست — جز ترے کوئی اگر یاد آیا
بعد مدت کے چلے ہیں ناوک — آج پھر میرا جگر یاد آیا
اس کے سہنے کو بھی ہم ہیں تیار — کچھ ستم دور اگر یاد آیا
کعبہ ہو یا دیر ہوشیدا کو ترے — ہر جگہ تیرا ہی در یاد آیا
کچھ بھی یاد اب دل کاملؔ کو نہیں — تو ہی یاد آیا اگر یاد آیا

آج کس شان سے وہ سوئے گلستاں نکلا — جس نے دیکھا اسے وہ چاک گریباں نکلا

حامل بار امانت جو یہ انساں نکلا　　اس کی رحمت، کہ خلافت کا یہ شایاں نکلا
ہے ترے پاس ہی وہ جان جہاں اے غافل!　　ڈھونڈھنے جس کو تو ہر سمت پریشاں نکلا
شان قدرت ہے یہ سب لطف خداوندی ہے　　خلعت خاص کے لائق جو یہ انساں نکلا
بہتر اس سے تو کوئی جنس مرے پاس نہیں　　اور کیا دینگے انہیں، دل بھی اگر ارزاں نکلا
آج تھا باغ میں کیا لطف بہار تازہ　　سیر گلشن کو جو وہ نوگل خنداں نکلا
شرم سے ماہ فلک چھپ گیا کاملؔ جس دم　　بام پر جلوہ کناں وہ مہ تاباں نکلا

جس دل میں تیرا گھر نہ ہو، وہ دل خراب ہے　　جو دل ہے محو یاد وہی کامیاب ہے
ہے مثل آفتاب عیاں بھی نہاں بھی ہے　　عارض پہ تیرے فرط تجلی نقاب ہے
ہر شئی میں گو ہے اس کی تجلی عیاں مگر　　یہ غایت ظہور خود اس کا حجاب ہے
ہم میں وہ جلوہ گر ہے، مگر دیکھیں کس طرح　　اپنا وجود ہی تو سرا سر حجاب ہے
کیا پوچھتے ہو حضرت انساں کے مرتبے　　''انی نفخت فیه'' انہیں کا خطاب ہے
بے خود بنا دیا مجھے بس اک نگاہ میں　　یہ چشم سحرفن ہے کہ جام شراب ہے
عارض پہ اس کے زلفوں کے سایہ کو دیکھ کر　　ہم سمجھے زیر دامن ابر، آفتاب ہے
کاملؔ ہو خوف کیا گنہ بے شمار کا　　اپنا شفیع، شافع یوم الحساب ہے

اشتیاق وصل دیکھو بعد قتل　　خون عاشق جم گیا شمشیر پر
بھیج کوئی خط کہ ہے اب منحصر　　زندگی اپنی تری تحریر پر
ان کے نور حسن کو ترجیح ہے　　چاند کیا خود مہر کی تنویر پر
خاک کوئے یار کاملؔ! چاہئے　　ہے فضیلت اس کو سوا کسیر پر

آنکھیں لڑی ہیں جب سے کسی گلعذار سے　　دل ہاتھ سے نکل گیا، صبر اختیار سے
قاصد! قمیص یوسف مصر جمال لا　　کور آنکھیں ہوگئی ہیں غم انتظار سے
دامن سمیٹے آئے مری قبر پر انہیں　　اب تک غبار ہے مرے مشت غبار سے

اچھا ہوا یہ دل بھی ہوا ان کے ہمرکاب　　وہ برق ساں تڑپ کے جو اٹھے کنار سے
کاملؔ! شفیع ہیں مرے محبوب کبریا　　پھر مجکو خوف کیا گنہ بے شمار سے (۵۰)

(۱۱)
مولانا علیم الدین سوزاںؔ سہسرامی ثم دربھنگوی

علیم الدین احمد نام، سوزاں تخلص، مولوی کمال الدین احمد قادری سہسرامی کے صاحبزادے مولد سہسرام موجودہ ضلع رہتاس۔ مسکن محلہ لال باغ، دربھنگہ ولادت تقریباً ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام میں داخل کئے گئے۔ ان دنوں مولانا حسن جان حسن سہسرامی ابوالعلائیؒ اسی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے۔ فارسی وعربی کی کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد علم طب حاصل کرنے لکھنؤ چلے گئے۔ حکیم عبدالعزیز سے تین سال تک طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں وطن لوٹ آئے۔ کچھ دنوں وہیں قیام فرمایا۔ پھر بھاگلپور چلے گئے۔ جہاں ان کے والد ملازمت کرتے تھے۔ وہاں حکیم عبدالسلام کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان سے اکتساب فیض کیا۔ کچھ دنوں بعد سہسرام آ گئے۔ پھر چھپرہ سارن آ گئے۔ ۱۹۲۷ء کے اوائل تک وہاں رہے۔ اسی سال ۱۹۲۷ء میں دربھنگہ تشریف لے گئے۔ اور موضع ملکی چک میں اقامت اختیار کی۔ ۱۹۳۴ء میں شہر دربھنگہ کو اپنا مستقر بنایا۔ محلہ لال باغ میں ٹاؤن ہال کے پورب اپنا رہائشی مکان بنایا۔ اور تادم حیات اسی میں اقامت گزیں رہے۔ اور مطب کے ذریعہ خلق کی خدمت کرتے رہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلے علیم تخلص کرتے تھے۔ بعد کو سوزاںؔ ہو گئے۔ ابتداء میں حسنؔ سہسرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر چھپرہ میں قیام کے دوران جناب عبداللطیف شفاءؔ چھپروی سے اکتساب فیض کیا۔ دربھنگہ میں حکیم شاہ تدبر حسن نوشہ کی صحبت ان کے کلام پر اثر انداز ہوئی۔ ان تلامذہ کی کثیر تعداد ملکی چک اور شہر دربھنگہ میں اب بھی موجود ہے۔ جناب سوزاںؔ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام اور نوحہ کے علاوہ قطعات تاریخ بھی خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں اپنے اشعار ہلکے ترنم سے خوب سناتے تھے۔ کبرسنی کے سبب آخر عمر میں عام مشاعروں میں شرکت تو ترک کر دی تھی، لیکن خصوصی نشستوں میں شریک ہوتے اور کلام سناتے۔

۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۶ء میں انتقال فرمایا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

دل لگانا نہ کبھی گلشن ہستی میں علیمؔ
گل کو سو رنگ گلستاں میں بدلتے دیکھا

کبھی سکون، کبھی اضطراب پانی میں ہمیشہ ہوتا رہا انقلاب پانی میں

ہو گئے قیدی جو دیکھا یار کا حسن و جمال خود نگاہ شوق اپنی پاؤں کی زنجیر ہے
کھینچتا ہوں اس لئے فرقت میں جاناں کی شبیہ مشغلے کا مشغلہ، تصویر کی تصویر ہے

شاید کہ امتحاں ہے جبین نیاز کا ان کی گلی ہے اور کہیں نقش پا نہیں

توہین مئے نہ کیجئے رندوں کے سامنے واعظ یہ لت بری ہے زمانہ خراب ہے

آج ہنستے ہیں مری جامہ داری پہ احباب کل تبرک انہی ہاتھوں میں گریباں ہوں گے

زنجیر بھی خموش ہے زنداں بھی ہے اداس شاید رہائی قید سے دیوانہ پا گیا

تارے گننا کبھی اشکوں سے بھگونا دامن تیرے دیوانے کی یوں رات بسر ہوتی ہے

کیا کہیں ہم تری درگاہ سے کیا ملتا ہے جو طلب کرتے ہیں اس سے بھی سوا ملتا ہے
رنگ کیا لاتی ہے اب دیکھئے پس کر قاتل آج مہندی میں تری خون مرا ملتا ہے

چراغ بزم کو داغ جگر سے کیا نسبت
یہ رات بھر کے لئے ہے وہ عمر بھر کے لئے

اخیر وقت ہے فکر مآل کر سوزاںؔ
کہ زادراہ تو کچھ چاہئے سفر کے لئے

خاص یہ اپنے تخلص کا اثر ہے سوزاںؔ جل گیا جب تو مرتب ہوا دیواں اپنا

پونجی یہی ہے عاشق شوریدہ بخت کی دامان مدعا میں ہے آنسو لئے ہوئے

گرتی ہیں کس طرح دل عاشق پہ بجلیاں
گلشن میں شاخ گل پہ نشیمن بنا کے دیکھ

چلے تھے پی کے جس کے ہاتھ سے ہم ساغر عرفاں اسی ساقی، اسی پیر مغاں کی یاد آتی ہے
جہان عشق میں بے مائگی کا ذکر کیا سوزاںؔ
محبت میں کہاں سود و زیاں کی یاد آتی ہے

کھلی جو آنکھ تو الفت ہوئی اس زلف پیچاں کی یہی تعبیر تھی شاید مرے خواب پریشاں کی
جسے تم ابر کہتے ہو مرے دامن کا ٹکڑا ہے جسے تم کہکشاں کہتے ہو دھجی ہے گریباں کی
ہوا رخصت بہار آتے ہی قید غم سے دیوانہ
جنوں نے توڑ دی اک جست میں دیوار زنداں کی

خون جگر کا رنگ چمن کو کہاں نصیب دو پھول کھل کے حاصل گلزار بن گئے

فیض کرم سے ان کے سلامت ہے آشیاں بجلی ہزار بار گری ہے بہار میں

دل کے زخموں میں تمنائے دلی بھی ہوگی پھول گلشن میں کھلے ہیں تو کلی بھی ہوگی

الجھنوں کو مری سمجھیں گے وہی اہل کمال — جن کی کشتی کبھی طوفان میں بہی بھی ہوگی
بار ہا اٹھتا ہے دامن کی طرف دست جنوں — ہے یہی رنگ تو پھر جامہ دری بھی ہوگی
کیا خبر تجھ کو بھلا لذت مئے کی زاہد — تو نے کمبخت کبھی ہوش میں پی بھی ہوگی
لطف آئے گا اسے شعر و سخن کا سوزاںؔ
ان قوافی میں غزل جس نے کہی بھی ہوگی

کیا کہوں کیا نہ کہوں اہل گلستاں تم سے — اک مسافر ہوں بہت دور ہے مسکن اپنا
خوگر قید محبت کا نہ پوچھو احوال — وہ سمجھتا ہے قفس ہی کو نشیمن اپنا
کوئی شبہ نہیں ہم خاک نشیں ہیں لیکن — غیر کے سامنے پھیلایا نہ دامن اپنا
مرتبہ خاک کا افلاک نے سمجھا کیا ہے — شاخ طوبیٰ ہے ازل ہی سے نشیمن اپنا
آ کے ہم گلشن ہستی میں ہوئے یوں غافل — یاد آتا نہیں بھولے سے بھی مسکن اپنا
کیا خبر تھی مجھے برباد یہ دل کی سوزاںؔ
رہنما ہی تھا وہ عشق میں رہزن اپنا (۵۱)

(۱۲)
مولانا سید مرشد حسن کاملؔ دھرمپوری

سید مرشد حسن نام۔ کاملؔ تخلص، مولوی سید طالب حسین کے صاحبزادے۔ مولد و مسکن دھرم پور نستانواں شہر سمستی پور ضلع دربھنگہ موجودہ ضلع سمستی پور تھا۔ صاحب سخن شعراء نے انہیں عظیم آبادی لکھا ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ عظیم آباد سے ان کے روابط ضرور تھے لیکن انہوں نے وہاں مستقل بود و باش اختیار نہیں کی تھی۔ مولف تاریخ شعرائے بہار نے بھی ان کو عظیم آبادی قرار دے کر دربھنگہ کا مقیم گردانا ہے۔

شاداں فاروقی تحریر کرتے ہیں:

''محققین کرام نے تفتیش سے کام نہیں لیا ہے۔ ورنہ آئینہ ترہت (ص ۱۰۰) سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کا مولد و مسکن وہی دھرم پور نستانواں تھا جو دریائے بوڑھی گنڈک

کے کنارے سمستی پور کے پچھّم واقع ہے۔ بقول مولوی محمد الیاس رحمانی مرحوم جناب کامل کا قیام محلہ قاضی محمد عظیم، در بھنگہ میں تھا اور انکی زندگی کا معتد بہ حصہ یہیں درس و تدریس میں گذرا۔''

علم معقولات و منقولات میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ اپنے شاگردوں کو عربی کی بڑی سے بڑی کتابیں پڑھاتے تھے۔ حصول علم میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ جس فن کے جو صاحب کمال استاذ ملتے حضرت مولانا ان سے ضرور استفادہ فرماتے۔

صرف و نحو مولوی محمد حمید عظیم آبادی سے پڑھی۔ منطق اور فلسفہ مولانا سراج الدین لکھنوی، مولانا واجد علی بنارسی، حدیث و تفسیر حضرت مولانا تراب علی لکھنوی سے اور طب حضرت مولانا حکیم محمد ابراہیم سے حاصل کیا۔ یہ علم ریاضی میں بھی طاق تھے۔ سات سال لکھنؤ میں رہ کر اپنے استاذ حکیم صاحبؒ کی سرپرستی میں طبابت بھی کی۔ عربی کے ساتھ فارسی میں بھی حضرت کاملؔ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ فارسی نثر نویسی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ نثر اچھی اور سلیس ہوتی تھی۔

فن شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ اردو میں شعر زیادہ کہتے تھے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ ان کا کلام بھی خواجہ وزیر ہی کی طرح فصیح و بلیغ ہوتا۔ الفاظ کی چستی، سلاست زبان اور خیالات کی بلندی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔

شاداںؔ فاروقی تحریر کرتے ہیں:

''ان کا سال ارتحال ٹھیک نہیں بتایا جاسکتا۔ مؤلف تاریخ شعرائے بہار نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء تک زندہ تھے۔ آئینہ ترہت کا سال طباعت بھی ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء ہے اور اس میں جو حال ان کا مذکور ہے اس سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس وقت زندہ تھے۔ اندازاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی تقریباً ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں ان کا انتقال ہوا ہوگا۔''

سخن شعراء سے ان کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

چٹکی انگشت حنائی کی بجا کر کہتے ہیں　　بولتا ہے لال لو دیکھو حنا کے رنگ کا

ایک دو ہر روز بے جرم و خطا ہوتے ہیں قتل　　چار دن سے شوق ہے سفاک کو چورنگ کا

نفع اپنوں سے نہیں ہوتا ہے بے تائید غیر　　دیکھ سکتی ہے کبھی بے آئینہ رخسار آنکھ

ریاض ترہت میں یہ شعر مذکور ہے ؎

دم گریہ تصور ہو اگر زلف معنبر کا　　رگ ابر سیہ بن جائے ڈورا دیدہ تر کا

آئینہ ترہت میں یہ اشعار مذکور ہیں ؎

حرم میں، دیر میں، کعبے میں اور کلیسا میں　　کہاں کہاں نہ ترے واسطے خراب رہا

عکس پڑ جائے اگر قاتل دل بیتاب کا　　ہو ترے خنجر میں عالم ماہی بیتاب کا
توسن عمر رواں چلتا نہیں اب ساقیا　　تازیانہ لائیو موج شراب ناب کا
کم نہیں اکسیر سے ترک ہوائے مال و جاں　　کشتۂ سیماب ہے مرنا دل بیتاب کا
وقت گریہ دل جو پس کر نکلے ہمراہ سرشک　　سرمہ بن جائے ہویدا دیدۂ پر آب کا
مر گئے ہیں چاند سا مکھڑا کسی کا دیکھ کر　　چاہیئے ہم کو کفن بھی چادر مہتاب کا

سبزہ خط نکل آیا تو تماشا ہوگا　　طوطی آئینہ رخسار سے پیدا ہوگا
میری مٹی میں بھی رونے کی رہے گی تاثیر　　جب بخارا اٹھے گا اک ابر کا ٹکڑا ہوگا
داستاں اپنی سناتا ہوں تو وہ کہتے ہیں　　ایسا افسانہ جو کہیئے گا تو قصہ ہوگا
چادر آب رواں صاف بنے گا اے گل　　تر پسینے سے جو شبنم کا دوپٹہ ہوگا
دیکھ لیں گے تجھے ہم چشم تصور سے صنم　　غم نہیں ہم کو اگر بیچ میں پردا ہوگا

سینے میں ہے سوز، آنکھوں میں اشکوں کی لڑی ہے　　جلتا ہے کہیں گھر کہیں ساون کی جھڑی ہے
غفلت کدۂ دہر میں ہوشیار ہو ہوشیار　　یوں بیٹھ نہ غافل کہ اجل سر پہ کھڑی ہے
میں جوشش وحشت سے نہ زنداں میں ٹھہرتا　　سو مرتبہ زنجیر مرے پاؤں پڑی ہے
ممنون ہوں مشکور ہوں میں کم سخنی کا　　بولو جو نہ غیروں سے تو یہ بات بڑی ہے

غافل تو نہ رہ زاد رہ ملک عدم سے
کامل یہ سفر دور ہے منزل یہ کڑی ہے

سراپا سخن میں ان کی ایک غزل ہے وہ پیش ہے ؎

عشق جسم ناتوان یار سے ہے زار آنکھ — اپنی پتلی کو بھلا کیوں کر نہ سمجھے خار آنکھ
برق خاطف سے نہیں کم نالہ سوزاں مرا — فرط گریہ سے اگر ہے ابر دریا بار آنکھ
نفع اپنوں سے نہیں ہوتا ہے بے تائید غیر — دیکھ سکتی ہے کبھی بے آئینہ رخسار آنکھ
حال پر میرے یہ روتی ہے مجھے اس کا ہے غم — میں ہوں غمخور آنکھ کا اور ہے مری غمخوار آنکھ
جھانکنے کا، تاکنے کا، اس کو چسکا پڑ گیا — کیاں کہوں ناصح اس عادت سے تو ہے لاچار آنکھ
رشک اسکندر جو تو ہے یار تیری دید کو — آئینے سے رکھتی ہے گھر کی تری دیوار آنکھ
عین بے ہوشی میں دیکھا ساقی سرشار کو — دل تو غافل تھا ہمارا ہے مگر ہشیار آنکھ
شکل یوسف طلعتوں کی پھر رہی ہے ہر گھڑی — اے زلیخا دیکھ لے ہے مصر کا بازار آنکھ

نرگس بیمار جاناں کا ہوا کامل جو عشق
ہوگیا جسم اپنا لاغر ہوگئی بیمار آنکھ (۵۲)

(۱۳)
مولانا محمد قمرالدین قمرؔ اعظمی، دربھنگوی

محمد قمرالدین نام، قمرؔ تخلص۔ جناب شیخ منصب علیؒ بن شیخ اشرف علیؒ کے صاحبزادے۔ وطن ہمئی پور ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی)۔ سال ولادت معلوم نہیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جون پور کے کسی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ وہاں انہیں حضرت مولانا ابوبکر جیسے استاذ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ تھوڑی ہی دنوں میں فراغت حاصل کرکے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں داخلہ لیا۔ وہاں حضرت مولانا عبدالحمید سے تعلیم حاصل کرکے فراغت حاصل کی۔ اور جون پور لوٹ آئے اور وہیں درس وتدریس میں منہمک ہوگئے۔

حضرت مولانا اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ فن خطابت میں بے مثال تھے۔ قوم وملت نے انہیں خطیب الہند اور سحبان الہند جیسے خطابات سے نوازا۔

جب دارالعلوم مشرقیہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ کا احیاء ہوا تو حضرت مولانا حسن علی نے حضرت مولانا عبدالحمیدؒ کو الہ باد سے دربھنگہ بلایا اور دارالعلوم کی نظامت ان کے سپرد کی۔ اور وہ خود اپنے وطن

چھپرہ لوٹ گئے۔ مولانا عبدالحمید نے اپنے شاگردوں کو بھی الہٰ باد سے دربھنگہ آنے کا حکم دیا۔ حسب ارشاد ان کے تین شاگرد مولانا عبدالرحمٰن قیسؔ، مولانا فتح اللہ آزادؔ اور مولانا محمد قمرالدین قمرؔ تشریف لے آئے۔ اور یہیں دارالعلوم مشرقیہ حمیدیہ میں درس وتدیس میں منہمک ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد یہیں سکونت اختیار کر لی۔ محلہ اردو بازار دربھنگہ میں اپنا رہائشی مکان بنایا اور تاحیات اسی میں سکونت پذیر رہے۔

دربھنگہ سے ماہنامہ پروانہ (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء) جاری ہوا تھا جس کی ادارت کچھ دنوں ان کے ہاتھوں میں بھی رہی۔ صحافت کا جو ستھرا ذوق ملا تھا وہ ناقابل فراموش ہے اور آج بھی مقامی صحافت کے لئے مشعل راہ ہے۔

حضرت مولانا قمرؒ نے ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء میں دربھنگہ میں انتقال کیا۔

قمرؔ اعظمی بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ جون پور میں حفیظؔ جونپوری اور دوسرے اکابر کی صحبت نے حضرت قمرؔ کے کلام پر اپنا اثر ڈالا۔ اور قمر کی شاعری میں صفائی اور سادگی پیدا ہوئی۔ حفاظت کا کبھی کوئی التزام نہیں کیا۔ اس لئے زیادہ تر حصہ ضائع ہو گیا۔

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

عاشق ومعشوق میں ہوتا ہے دو علم کا فرق — خود ملا کر دیکھ لو تصویر سے تصویر کو
مجھ کو دھکے دے کے باہر کر دیا اچھا کیا — کہہ دو درباں سے کہ روکے خاک دامن گیر کو

ہائے وہ حسرت نگاہی جبکہ دیکھا پاس سے
آپ کو نخچیر نے اور آپ نے نخچیر کو

ماہ میں ساقی جو دے وے آفتاب — پھر قمر بھی دیکھے خورشید ہے

آیا جو قتل کرنے مجھ ناتواں کو تو ہے — اک ہاتھ اور قاتل بانی رگ گلو ہے
نکلا ہوں میکدے سے کعبہ بھی سامنے ہے — دو سجدہ چل کے کر لو باقی وہی وضو ہے

خدا کے واسطے اب تو لب نازک سے ہاں نکلے
سنا ہے جان دے دے کر تمہاری اک ''نہیں'' برسوں

گو کہ اٹھلاتی ہوئی بادصبا آئی ہے — پر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا آئی ہے
خواب میں تجھ کو کلیجے سے لگا آئی ہے — میری حسرت تجھے اے شوخ! جگا آئی ہے
ہیں جو ظاہر میں ہرے ان کا ہے باطن خونیں — سارے عالم کو بتانے یہ حنا آئی ہے
قتل کرنا ہے تو خنجر کا یہ رکنا کیسا — میرے قاتل تجھے کس وقت حیا آئی ہے
سچ کہا تونے قمرؔ ہے یہ مجھے بھی تسلیم
شاعری بھی کہیں بے فضل خدا آئی ہے (۵۳)

(۱۴)
مولانا سید شاہ عبدالکریم رکنؔ بہاری

سید شاہ عبدالکریم نام، اور رکنؔ تخلص ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید شاہ عنایت کریم اور جدامجد کا نام سید شاہ رحیم بخش ہے۔ محلہ چھوٹی تکیہ قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ مسکن تھا۔ عربی وفارسی کی اونچی استعداد رکھتے تھے۔ حضرت رکنؔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعروشاعری کرتے تھے۔ انہیں حضرت وحیدؔ الہ آبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا کلام آتشزدگی میں تلف ہوگیا۔ متعدد لوگوں نے آپ سے اردو غزلوں پر اصلاحیں لی ہیں۔ ان میں سے سید ناظر حسین بہاری عرف وزیر علی فائق، سید شاہ مولوی تفضّل حسین حقیرؔ تخلص، سید شاہ مصاحب حسین بہاری شفاؔ تخلص، مولوی محمد یوسف بہاری تخلص غریبؔ۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

حضرت رکنؔ کی ایک غزل رسالہ گلدستہ بہار بابت ۱۸۸۳ء سے نقل کی جاتی ہے ؎

اس قدر دل دادگوں سے اے بت عیار کھینچ — دامن اپنا ہاتھ سے مرے نہ اے دلدار کھینچ
یار گر مطلوب ہے تو زحمت اغیار کھینچ — گل اگر مقصود ہے تو خار کا آزار کھینچ
دامن طفلاں ہے خالی، سر میں ہے سودا بھرا — ائے جنوں! للہ سوئے دامن کہسار کھینچ
کون بیتابی میں اب تک کھینچ لائے گا مجھے — آہ کا مشکل ہے اب تو اے دل بیمار کھینچ
کم نہیں گر سنگ طفلاں سے ہوا سودا کا زور — ایک دن لے لوں گا سر پر دامن کہسار کھینچ
جیب وداماں کے تو پرزے اڑ چکے اگلے برس — دشت وحشت! جامہ ہستی کا ابلے تار کھینچ

رخصت دیدار غیروں کو رہوں میں بے نصیب — دست رس پاؤں تو لوں میں دیدہ اغیار کھینچ
کب تک آنکھوں میں رہے اس طرح بیخوابی کا روگ — چادر اپنے منہ سے بہر دیدہ بیدار کھینچ
ہم زباں ہوگا جرس کا قافلے میں ہائے کون؟ — یاں تو فرط ضعف سے نالوں کا ہے دشوار کھینچ
انگلیاں کیا، لاکھوں سر کٹ جائینگے اے جذب دل! — لا تو یوسف کو مرے اک دن سر بازار کھینچ
روشنی چشم تجھ کو رکنؔ اگر منظور ہے — اپنی آنکھوں میں غبار کوچہ دلدار کھینچ

(۵۴)

(۱۵)

حکیم محمد شعیب رضوی نیرؔ پھلواروی

سید محمد شعیب نام، نیرؔ تخلص، مولانا سید محی الدین احمد رضوی پھلواروی کے صاحبزادہ۔ ولادت ۱۳۰۱ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ درسیات مولانا عبداللہ رام پوری سے پڑھی۔ اور تکمیل مولانا عبدالرحمن سے کی۔ فن طب کی تکمیل حکیم وارث حسن منیری سے کی۔ شعر و سخن میں استاد وقت تھے۔ تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ وفات ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

مہر و مہ چکر میں ہیں روئے درخشاں دیکھ کر — چھپ گئی بجلی چمک کر ان کو خنداں دیکھ کر
انکا ہنسنا یاد آیا برق خنداں دیکھ کر — بڑھ گیا سودائے گیسو سنبلستاں دیکھ کر
جس طرف وہ ناز سے نکلے بپا محشر ہوئی — کتنے مردے جی اٹھے ان کو خراماں دیکھ کر
بڑھ گیا دست جنوں اب حبیب و داماں کی طرف — ٹکڑے ٹکڑے کر دیا چاک گریباں دیکھ کر
وہ سراپا نور آنکھوں میں ہماری پھر گیا — بزم عشرت میں قد نخل چراغاں دیکھ کر
عفو کی سرگرمیاں اس نے بڑھا دی شکر ہے — مجھ کو اس امید پر سرگرم عصیاں دیکھ کر
بلبلان ہند نے نغمہ سرائی چھوڑ دی — نیرؔ نغمہ سرا کو پھر غزل خواں دیکھ کر

کوئی تدبیر برآتی کہ اس کو رام کر لیتے — تمنائیں برآتیں دل کا سارا کام کر لیتے
کسی گوشہ میں اپنے در کے ہم کو چھوڑ دیتے وہ — جہاں ہر صبح کی ہم نے وہیں پر شام کر لیتے
ابھی سے تھک گئے پاؤں بہت باقی ہے چلنے کو — کڑی ہے عشق کی منزل ذرا آرام کر لیتے

مٹا دیتے محبت میں تری نام ونمود اپنا　　تو ہم بھی جانثاروں میں ترے کچھ نام کر لیتے
بڑھی ہے گردش تقدیر مری یا تری گردش　　ترا بھی امتحاں اے گردش ایام کر لیتے
اگر منظور تھا نظارہ ان کا ہر گھڑی نیرؔ　　ہمیشہ کے لئے گھر اپنا زیر دام کر لیتے

(۵۵)

(۱۶)

مولانا سید محی الدین تمناؔ عمادی پھلواروی

سید محی الدین نام، تمناؔ تخلص۔ حسان الہند کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید شاہ نذیر الحق فائز ہے۔ سال ولادت شوال ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء پھلواری شریف ضلع پٹنہ آپ کا قدیم مولد ومسکن تھا۔ درس نظامی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے تمام کیا۔ حدیث شریف مولانا حکیم علی نعمت سے پڑھی۔ اور طب کی تعلیم اپنے والد، شاہ علی اور حکیم عبدالحمید سے حاصل کی۔ فارسی شاعری اور عربی ادب میں علامہ شبلی نعمانی سے تلمذ حاصل تھا۔ شعر وشاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ابتدائی مشق میں اپنا کلام مولانا شمشادؔ لکھنوی کو دو برس تک دکھلایا۔ پاکستان بننے کے بعد آپ مشرقی پاکستان ترک وطن کر کے چلے گئے۔

صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ کی شاعری سے اردو ادبیات کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندوستان کے اردو رسالوں میں آپ کا کلام بکثرت شائع ہوا۔ آپ کے تلامذہ کافی تعداد میں صوبہ بہار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع تھا۔ کلام استادانہ ہوتا تھا۔ نت نئے قوانی پر طبع آزمائی فرماتے تھے۔ جدت اور ندرت فکر سے آپ کا کلام مالا مال ہے۔ آپ کی قادر الکلامی مشہور ہے۔ اور فن عروض کے آپ ماہر تھے

نمونہ کلام یہ ہے ؎

شب امید مرے گھر سے پشیمان گئی　　میں اسے جان گیا وہ مجھے پہچان گئی
مصحف روے بتاں پر تھی دم نزع نظر　　کافر عشق تھا میں، روح مسلمان گئی
تم سے تو موت ہی اچھی رہی میرے حق میں　　مہرباں ہوگئی جو میں نے کہا مان گئی

دیکھتے رہتے ہیں آئینہ سمجھ کر تیرا　　که نظر آتی ہے قرآن میں صورت تیری

وہ خفا ہیں کہ ہر ایک نقش قدم کو ان کے　　کیوں جبیں اہل عقیدت کی مٹا دیتی ہے

ساقی گھٹا ہے، صحن چمن ہے، بہار ہے　　اب کار خیر میں تجھے کیا انتظار ہے
کرتی ہے تیرے خندہ بیسا ختہ کی قدر　　جو آنکھ مست گریہ بے اختیار ہے
تار نفس کا بھی نہ رہا سلسلہ جو تھا　　ہاں، ایک رشتہ نگہ انتظار ہے
کہنے لگے وہ سن کے مری بیقراریاں　　سمجھا ہے وہ غلط کہ یہ دار القرار ہے
اک سانس بھی بغیر تری یاد کے جو آئے　　وہ دل کے آئینہ کے لئے اک غبار ہے
صبح امید تو ہے سامنے مگر　　منہ پر نقاب دامن شبہائے تار ہے

(۵۶)

تم تمنا سے کیوں نہیں ملتے　　آدمی ہے بڑی محبت کا

گلشن میں دبے پاؤں صبا! بچ کے نکلنا　　مرکز میں تمنؔا کے ابھی آنکھ لگی ہے

(۵۷)

(۱۷)

مولانا غلام رسول قوسؔ حمزہ پوری

سید غلام رسول نام، قوسؔ تخلص، حمزہ پور علاقہ شیر گھاٹی ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ ۲۷/دسمبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید حبیب الحسین تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر مولوی فدا حسین صاحب سے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء ندوۃ علماء لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور وہیں سے تعلیم کی تکمیل کی۔

ناوک حمزہ پوری تحریر کرتے ہیں:

''عمر شریف کی ابتدا میں ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۲ء تک قوس یا تو حمزہ پور ہی میں رہے۔ یا پھر

حصول تعلیم کے لئے گیا میں رہا کیئے۔ ۱۹۰۲ء میں ان کی شادی ہوگئی۔اور یوں تلاش معاش کا مرحلہ پیش آیا۔اس سلسلہ میں وہ حسن پور تشریف لے گئے۔اور وہاں بابو ارشاد علی خاں زمین دار بھدریا کے دو عزیزوں کو تعلیم دیتے رہے۔'' **(۵۸)**

مذاق سخن زمانہ تعلیم ہی سے تھا۔گیا میں زیر تعلیم تھے،تو وہاں شعروشاعری کا بہت چرچا تھا۔اور مشاعروں کی گرم بازاری بھی تھی۔عرشؔ،شفقؔ،فریادؔ،حشرؔ وغیرہ جان محفل تھے۔اسی سے ان کا ذوق سخن ابھرا۔ ۱۹۰۲ء میں شفقؔ عماد پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

قوسؔ کی شاعری کے سلسلہ میں مظہر امام تحریر کرتے ہیں:

قوسؔ حمزہ پوری کو الفاظ کے دروبست پر پوری قدرت حاصل ہے۔ان کے یہاں ایک فنی شائستگی،رچاؤ اور جذبے کا گداز ہے۔انداز بیان کی بے ساختگی اور وارفتگی نے ان کے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کردیا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں آپ کی وفات ہوئی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

سایہ پڑا گلوں پہ جو رخسار یار کا — ہے عرش پر دماغ عروس بہار کا
کہتے ہیں برق طور جسے تھا نقاب رخ — اللہ رے فروغ تجلائے یار کا
زخم جگر کی بتیاں جلتی ہیں بعد مرگ — روشن نہیں فتیلہ چراغ مزار کا
فطرت کو آب دار نہ جب تک کرے خودی — ہوتا نہیں ظہور کسی شاہکار کا
ثمرے برے عمل کے ہیں ساری مصیبتیں — شکوہ نہ بخت کا نہ گلہ روزگار کا
نازک گلوں کی قوت برداشت دیکھئے — ہر پنکھڑی میں تیر ہے پیوستہ خار کا
دور خزاں میں روئے نہ تو قوسؔ کیا کرے — غفلت میں کھو چکا ہے زمانہ بہار کا

(۵۹)

یاس ہے عیسیٰ کو درد عشق پنہاں دیکھ کر — موت ہنستی ہے مجھے محتاج درماں دیکھ کر
تاب گویائی نہ اس میں ہے، نہ مجھ میں تاب نطق — بلبل تصویر ہوں،تصویر جاناں دیکھ کر
حسن کی بھی عشق کے پردے میں رسوائی نہ ہو — اے زلیخا چاک کر یوسف کا داماں دیکھ کر
بڑھ گئے ہیں اب تو حسن و عشق کے ناز و نیاز — تیری صورت اور میرے دل کے ارماں دیکھ کر

نزع میں آئے ہیں وہ تسکین عاشق کے لئے — واہ کیا اندھیر ہے شام غریباں دیکھ کر
چٹکیاں لیتی ہے دل میں حسرت صبح وطن — آہ کیا اندھیر ہے شام غریباں دیکھ کر
آسماں سرکش، وہ ظالم سنگدل، دشمن رقیب — اے دل اس کافر سے کرنا عہد و پیماں، دیکھ کر
مرمٹوں کی قبر سے اے قوسؔ آتی ہے صدا — پڑھتے جاؤ فاتحہ گود غریباں دیکھ کر

(۶۰)

(۱۸)

مولانا سید شاہ محمد الیاس یاسؔ بہاری

سید شاہ محمد الیاس نام، یاسؔ تخلص تھا۔ سید شاہ امین احمد فردوسی کے فرزند تھے۔ قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ محلہ خانقاہ آپ کا مسکن تھا۔ ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں مولانا عبدالعزیز ساکن خاص گنج بہار شریف سے پڑھی۔ پھر مدرسہ غوثیہ حنفیہ بین میں درسیات کی تکمیل کی۔ تکمیل الطب کالج لکھنو سے طب کی سند حاصل کی۔ شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ابتدائی مشق مولانا احمد علی عشرتؔ گیاوی سے کی۔ پھر مولانا حنیف علی رعب شاہ آبادی کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ یاسؔ کی طبیعت کا عام رجحان رنگینی کی طرف تھا۔ عامیانہ تغزل پسند نہیں کرتے تھے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی اتباع پسند کرتے تھے۔ اکثر اشعار میں مومنؔ کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کی شاعری میں مرقع نگاری بھی ہے۔ آپ کے کلیات میں اردو اور فارسی کی غزلیں مسدس، مرثیہ، مثنوی اور رباعیات شامل ہیں۔

حضرت یاسؔ بہاری کا انتقال پر ملال ۲۱/ربیع الاول ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء کو ہوا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

جلوۂ دکھلا کے ترا محو حیا ہوجانا — حشر اک اور سر حشر بپا ہوجانا
خاک کا ڈھیر نہیں غیر نمود ہستی — شمع سے سیکھ لے پروانہ فنا ہوجانا

حوصلہ مضطر ہے کیوں؟ آہ فلک سوز کا — یوں بھی نہیں اعتبار پیر کہن روز کا
وہ نہیں پہنچا تئے غم نے بدل دی جو شکل — جلوہ ہوا بے حجاب حسن دل افروز کا
خود ہے نوید وصال خون ہزار آبرو — خندۂ گل مثردہ ہے آمد نوروز کا

مرا دل کس قدرت لذت کش اندوہ وحرماں تھا — کہ یہ گل کی طرح صد چاک ہونے پر بھی خنداں تھا
فریب وعدہ نے کچھ کی جنوں کی ہمت افزائی — مری وارفتگی کو عرصہ حشر ایک میداں تھا

آ جاتی ہے جان درد جب اٹھتا ہے جگر میں — پنہاں ہے حیات اپنی غم مرگ اثر میں
تمہید سکوں جوش ہے بیتابی دل کا — دم بھر کی تڑپ دیکھتے ہیں برق وشرر میں

بزم میخانہ ہے ہشیار ذرا اے واعظ — کہ یہاں مئے کی طرح ہوش اڑا کرتے ہیں
قتل کے نام سے ڈرتے نہیں مرنے والے — ہم تو تلوار کا منہ چوم لیا کرتے ہیں
رفع زحمت کی توقع جو ہے دونوں کے لئے — چارہ گر اب مرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

خواہان قتل کیا ہوں تری نازکی سے ہم — وعدہ ہی کر کہیں کہ مریں اس خوشی سے ہم
مطلق ہو جبکہ حسن تو قید محل ہے کفر — منزل کی راہ پوچھتے ہیں گمرہی سے ہم
رنگ اس کے رخ کا دیکھتے رہتے ہیں دیر تک — کہتے اگر ہیں راز محبت کسی سے ہم

ہماری نالہ پیمائی دلیل زندگانی ہے — جو ہم چپ بیٹھتے ہیں اقربا فریاد کرتے ہیں
پس مردن ہمارے ضبط غم کی داد ملتی ہے — وفا کا نام جب آتا ہے ہم کو یاد کرتے ہیں
تپش کی راحت اندوزی کہ روح زندگی میری — وہ کیسے لوگ ہیں جو درد سے فریاد کرتے ہیں
ہمیشہ ہم نے دیکھا ان کو محو خود فراموشی — خدا جانے جناب یاسؔ کس کو یاد کرتے ہیں

کوئی ایک چلو سے محروم ساقی — سر بزم ملتے ہیں ساغر کسی کو
ہوئے اب تو دشمن بھی اے یاسؔ! نالاں — نہیں چھوڑتا وہ ستمگر کسی کو

زبان عشق میں چشم بتاں کی ہے تاثیر — تری نگاہ کا انداز میری آہ میں ہے

جو غم چھپانے کو ہم ضبط، ناصحا کرتے　　تو وضع خامُشی و رنگ رخ کو کیا کرتے
وہ جلوہ جاں طلب اور ہم بھی زیست سے بیزار　　اب ایسے وقت نہ مرتے تو جی کے کیا کرتے
ہم اور شکوۂ عشق ستم معاذ اللہ　　کہاں تھی شکر سے فرصت کے کچھ گلا کرتے
تڑپ کے خوب ہوا یاسؔ آپ کا مرنا　　وگرنہ درد کا وہ اعتبار کیا کرتے

وہ جوش کہاں جان داد خواہ میں ہے　　عجب کرشمہ محبت بھری نگاہ میں ہے

مثل گل غم سے مرے دل میں خوشی رہتی ہے　　چاک دامن ہے مگر لب پہ ہنسی رہتی ہے

دل جلے طول شب غم کی دعا کرتے ہیں　　شمع کے واسطے ہے موت سحر ہو جانا

دل تھا آتشکدہ تو نالہ بھی　　آگ بن کر زبان سے نکلا

دل کا جو غنی ہے وہی دراصل غنی ہے　　دولت سے کوئی یاسؔ تونگر نہیں ہوتا

بڑھتی جاتی ہے ترے تیغ ستم کی لذت　　آ گیا وقت کہ ہر جزو بدن دل ہو جائے

اے یاسؔ ہم کو درد کے جانے کی کیا خوشی　　جانے کو تو گیا مگر لے کے جان گیا

تیر دلدوز کا پیوند رگ جاں کرنا　　آج ہے عشق کے بیما پر احساں کرنا
خلش درد ہے میرے لئے سامان حیات　　اقربا چاہتے ہیں چارہ درماں کرنا
تابش جلوہ رخسار نے مارا مجکو　　ظلم ہونے لگا اب آپ کا احسان کرنا

اثر جو تھا نگاہ دلستاں میں خدا نے بھر دیا میری فغاں میں
ترے بیتاب کو موت آئے گی کیا سکوں ممکن نہیں برق تپاں میں

یاس کے ایک مرثیہ کے چند بند پیش ہے جو انھوں نے اپنے چھوٹے لڑکے کے وفات پر کہا ؎

سرمایہ آسائش دنیا ہے پسر سے ہر دردو غم دل کا مداوا ہے پسر ہے
روشنگری بزم تمنا ہے پسر سے دل گھر ہے تو اس گھر کا اجالا ہے پسر سے
دل کا جو ہے مرغوب وہ محبوب یہی ہے
نور نظر دیدہ یعقوب یہی ہے

پر نور اسی شمع سے کاشانہ جاں ہے خوشبو سے اسی پھول کی پر مشک جہاں ہے
ماں باپ کے قالب میں یہی روح رواں ہے سر میں ہے یہی ہوش یہی دل میں تواں ہے
ویران ہے گلستاں میں وہ مشمول نہیں ہے
افسوس کہ جس باغ میں یہ پھول نہیں ہے

رفتار میں انداز نسیم سحری کا چالوں سے اڑالائے وہ دل کبک دری کا
بوٹا ساوہ قدحور کا رخسارہ پری کا تھا ایک نمونہ وہ جمال بشری کا
گلبرگ لب ولالہ رخ وغنچہ دہاں تھا
تھا طفل مگر حسن کے کے عالم میں جواں تھا

یاسؔ کی ایک سیاسی نظم ملاحظہ ہو ؎

آفاق کی رت بدلی، عالم کی فضا بدلی آئین چمن بدلا، بلبل کی نور بدلی
طبع علماء بدلی، نظم شعرا بدلی دو دن میں زمانے کی کیا آب وہوا بدلی
شق ہوگیا پتھر بھی مجبور اثر ہوکر
ہر ذرہ تڑپ اٹھا صحرا میں شرر ہوکر

آسان نہیں، مشکل ہے گو عقدے کا حل ہونا وہ آج کرو حاصل جس شے کو ہے کل ہونا
تمہید اجل سمجھو، تم پاؤں کا شل ہونا ہے راز حیات دل سرگرم عمل ہونا
برآئے مسلم خوابیدہ بے خوف اجل ہوجا
تھا پھول سپر کا تو، اب تیغ کا پھل ہوجا

جینے کی تڑپ دیکھو موجوں کی روانی میں　　بادل کے گرجنے میں بہتے ہوئے پانی میں
فرہاد کے قصوں میں، مجنوں کی کہانی میں　　اور سینہ بلبل کی خونابہ فشانی میں
بجلی کی حیات آخر بجلی کا کڑکنا ہے
شعلے کے لئے جینا، شعلے کا بھڑکنا ہے
حق مانگتا ہے تجھ سے محبوب وطن تیرا　　اک خاک کا تودہ ہے سرسبز چمن تیرا
ہے اب وہ کہاں؟ جوش ہنگامہ فگن تیرا　　اے پیکر حریت مشہور تھا فن تیرا
زندہ وہ نہیں رہتا مرنے سے جو ڈرتا ہے
جیتا تو اسی کا ہے مرنے پر جو مرتا ہے
افسوس کہ ٹھنڈک سے اک برف کی سل تو ہے　　باقی نہیں خودداری جس میں وہی دل تو ہے
تحریک وطن کا آج افسوس مخل تو ہے
ہے یاسؔ کو اک حیرت کیوں پائے بہ گل تو ہے

''تاج محل''، آگرہ پر حضرت یاسؔ بہاری کی مرقع نگاری ؎

اے پہر عظمت! اے سرتاج صنع روزگار　　قبہ سیمیں پہ تیرے گنبد گردوں نثار
اللہ اللہ کس طرح سانچے میں ڈھالا ہے تجھے　　یہ معمہ آج تک ہوتا نہیں ہے آشکار
اعتراف عجز مغرب کو ہے تیرے سامنے　　آج صنعت سے تری قائم ہے مشرق کا وقار
قصر جنت سے ملک تجکو اٹھا کر لائے تھے　　عالم تعمیر کیونکہ لائے تجھ ساشاہکار
اس ترقی کے زمانے میں ہے ہر فن کو عروج　　پھر بھی آگے تیرے ہیں صناع عالم شرمسار
قبلہ عالم ہے تو تیری زیارت کے لئے　　دور سے آتے ہیں سیاحان امصار و دیار
کم متاعی سے ہیں محروم نظارہ جو غریب　　وہ فدا ہوتے ہیں فوٹو پر ترے پروانہ وار
اہل صنعت سنگ مرمر کے بنا کر اسٹیچو　　جمع کرتے ہیں بدولت تیری بیشمار
نردبان چرخ اعظم اپنی رفعت سے ہے تو　　ہے بجا خورشید اگر تیرا ہوا آئینہ دار

صفحہ گیتی پہ ہے یہ گنبد سیماب کون؟　　یا کنول کا پھول، سطح بحر ناپیدا کنار
عکس خور سے جس طرح مہتاب ہے روشن نصیب　　تاج سے یونہیں دل خورشید ہے انوار پار

کام کرتی ہے ستوں کا چار مینار بلند ورنہ سقف آسماں اتنی نہ ہوتی استوار
اندرونی منظر اس کا دلکشی میں کم نہیں جس طرح ہے جلوۂ بیرونی ازحد خوشگوار
جالیاں وہ سنگ مرمر کی وہ منبت کاریاں حسن وہ میناکاوہ دیوار کانقش ونگار
دامن دیوار میں گلہائے رنگیں کے شجر محو حیرت جن سے نظریں ہوتی ہیں آئینہ دار
جس کے ہر گوشہ میں آباد ایک دنیائے حسن ہے بظاہر اک گھر یہ گنبد گردوں حصار
گلشن آفاق کی کتنی بہاریں لٹ چکیں لیکن ایمن ہے خزاں سے آج تک اس کی بہار
ملکہ ممتاز بانو کی ہے یہ آرام گاہ جس کے پہلو میں ہے خود ہندوستاں کا تاجدار
سرخوش کیف محبت ایسے ہی ہوتے ہیں یاسؔ ہے یہ بعد مرگ بھی مست شراب وصل یار
تاج سے بیگم کو شہ نے دی حیات جاوداں اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی وفا کی یادگار
آج نہر بے ستوں پر کوہکن کو ناز ہے
تاج لیکن ''تاج ہے'' سرتاج ہے ممتاز ہے (۶۱)

(۱۹)
مولانا سید محمد محمودؔ باروی

مولانا سید محمد محمود نام اور محمودؔ تخلص تھا۔ مولوی حکیم سید زین العابدین حیرت کے صاحبزادے تھے۔ ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء میں موضع بارو ضلع مونگیر موجودہ ضلع بیگوسرائے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن شریف کا حفظ بھی گھر ہی پر کرایا گیا۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کئے گئے۔ وہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔ حکومت وقت سے انہوں نے تعلیمی وظیفہ بھی پایا۔ تکمیل حدیث فقہ وتفسیر کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ مسٹر ہارلے پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے انہیں اپنے یہاں بلالیا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک وہیں درس تدریس میں منہمک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں کھلنا ضلع اسکول (مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش) میں ان کا تبادلہ ہوگیا۔ وہاں دوسال ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے۔ اور ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں انتقال فرماگئے۔

محمودؔ کو شعروسخن سے فطری مناسبت تھی۔ اردو فارسی دونوں ہی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلام کی حفاظت کا انہوں نے کوئی التزام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام کا بہت سا حصہ

ضائع ہوگیا۔فن شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔

اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ارسطوئے زمانہ اور سکندر جاہ ہوتا ہے — مگر ہوتا ہے دنیا میں کوئی انسان مشکل سے
بصیرت ہے تو اک ذرہ گویا ماہ کامل ہے — بصارت گر نہیں حاصل ہے کیا پھر ماہ کامل سے
جو بدذوق عمل رہبر تو پھر آسان ہے مشکل — نہیں تو سہل بھی ہوتا ہے آساں سخت مشکل سے
نہیں مشکل زباں دینی کہ اک جنبش زباں کی ہے — مگر وعدے کے پکے ہوتے ہیں دنیا میں مشکل سے

دوروزہ زندگی پر کیا جان دے رہا ہے
دودن کی چاندنی ہے تاریک پھر زمانہ

تیرے کرم نے کردیا گستاخ اے کریم!
جو شکوہ سنج میں دم گفتار ہوگیا **(۶۲)**

(۲۰)
مولانا شاہ محمد قائم قتیلؔ داناپوری

شاہ محمد قائم نام، قتیلؔ تخلص۔ ۲۸ ؍جمادی الاولیٰ بروز جمعہ ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء شاہ ٹولی داناپور میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سید شاہ محمد حسین قادری اویسی تھا۔اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔آستانہ چشتیہ نظامیہ محلہ شاہ ٹولی داناپور کے سجادہ نشیں رہے۔آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔اشعار کا مجموعہ تجلیات قتیلؔ ہے۔صاحب دیوان شاعر تھے۔قتیلؔ تخلص کرتے تھے۔

اپنی شاعری کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں۔''فارسی شاعری میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں۔اردو میں جناب مولانا سید امیر حسن صاحب بدرؔ آروی جانشین حضرت علامہ صفیر بلگرامی علیہ الرحمۃ کا کمترین شاگرد ہوں۔میرا رنگ طبعی صائب ایرانی اور غنیؔ کشمیری کا تھا۔حضرت استاد نے مجھے اس رنگ سے روکا۔''

مولانا احمد اللہ ندوی تحریر کرتے ہیں:

راقم کہتا ہے کہ حضرت قتیلؔ داناپوری کے اردو دیوان کا ایک شعر ہے۔

کھینچ ہی لیتا ہے تصویر جمال معنی   قلم اہل سخن خامہ بہزاد نہ ہو

یہ شعر خود حضرت قتیلؔ کے کلام پر صادق آتا ہے۔ آپ کے ماہرانہ قلم نے کلام میں شاہد معنی کا وہ جمالی تصویر کھینچی ہے اور صورت لفظی میں وہ تنویر پیدا کردی ہے کہ صاحب ذوق اور ارباب بصیرت آپ کا کلام معجز نظام دیکھ کے اور پڑھ کے بیحد لطف وسرور حاصل کرتے ہیں۔ آپ کا کلام سلاست، لطافت اور حلاوت سے پر ہے۔ آپ کے کلام کی تشبیہات وتمثیلات حقیقت اور واقعیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ حضرت قتیلؔ نے اپنے کلام کے رنگ اور طرز بیان کی تشریح اپنے اس شعر میں خود ہی فرمادی ہے۔

رنگ وزیرؔ وبندش ناسخؔ ہوائے قتیلؔ   سکہ وہاں چلاؤ جہاں چل سکا نہ ہو

(۶۳)

حضرت قتیلؔ کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

عاشق کبھی مصروف فغاں ہو نہیں سکتا   بختہ ہوا گر اگ، دھواں ہو نہیں سکتا
ممکن ہی نہیں فیض کبھی اہل ستم سے   پانی کبھی خنجر کا رواں ہو نہیں سکتا
سیدھی نہ کبھی ہوگی کماں، صورت ناوک   جو ہوگیا بوڑھا، وہ جواں ہو نہیں سکتا
ہے سخت مزاجی پہ شرف نرم دلی کو   دنداں کوئی ہمسنگ زباں ہو نہیں سکتا
درکار جوانوں کو ہے پیروں کا سہارا   بے زور کمان، تیر رواں ہو نہیں سکتا

مٹ کر بھی حسن یار کا ہم نے بڑھا دیا   قدموں پہ پس گئے بھی تو رنگ حنا دیا
داغ فراق، سوز جگر، اضطراب دل   سب کچھ ہے ان کے عشق میں اللہ کا دیا

مکیں ہو جاؤ تم جس میں وہ دل ویراں نہیں ہوتا   مقید جس میں یوسف ہو وہ گھر زنداں نہیں ہوتا
نہ ہو پیدا بشر میں حسن خلق آدمی جب تک   ملک ہو جائے ممکن ہے مگر انساں نہیں ہوتا

صدف کو بحر میں گوہر، گلوں کو زر گلستاں میں   تماشا فضل کا تیرے، کرشمہ تیری قدرت کا

کف قاتل میں آ کر ہوگئی، شمشیر بھی خونی　　اثر دنیا میں ہو کر ہی رہا کرتا تھا صحبت کا
کہاں وہ قطرہ بیساں، کہاں درج صدف یارب　　کہیں بھی ہو پہنچ جاتا ہے دانہ منہ میں قسمت کا

اہل گردش سے جفا کاروں کو ملتی ہے مدد　　سان پر چڑھتا ہے جو ہر خنجر فولاد کا
دور راحت کا ہوا کرتا ہے ہر آفت کے بعد　　نیش جو کھاتا ہے پاتا ہے عسل زنبور کا
بے سبب پاتے ہیں پاکان ازل نشوونما　　خانہ دل میں قدم آتا نہیں مزدور کا
سر بلندوں کی تباہی میں ہے نفع خاص وعام　　ہوگیا کحل الجواہر جل کے پتھر طور کا

سرخرو غیب سے ہوتا ہے اک اک صاحب درد　　دہن زخم نہ محتاج ہوا پانوں کا
سنگ دل آپ ہی مٹ جاتے ہیں رفتہ رفتہ　　ٹوٹ جانا تو یہی کہتا ہے دندانوں کا

ساتھ چھوٹ جانے پہ بھی رہتا ہے صحبت کا اثر　　پھول کی خوشبو بسی ہے، پھول روغن میں نہیں
جا نہیں سکتے ہیں روشن دل بھی تا اہل عدم　　شمع بھی جلتی رہی مدفن پہ، مدفن میں نہیں

احتیاج غیر سے آزاد ہیں عالی مقام　　تیغ ماہ نو، کسی دن سان پر آتی نہیں
دوسروں کے غم سے ہوں اہل نزاکت کیا خبر　　چشم نرگس نالہ بلبل پہ بھر آتی نہیں
بروالوں سے وقت بد ہو کیا چشم کرم　　حلق بسمل تک کبھی آب گہر آتی نہیں

ہو نظر جس پر تری بازی اسی کے ہاتھ ہے　　یوں تو کہنے کے لئے پہلو میں کس کے دل نہیں
موت سمجھو تو سن عمر گریزاں کا سکوں　　راہ ہستی میں مسافر کی کہیں منزل نہیں
قرب اکثر باعث ناکامیابی ہے قتیلؔ　　پاس دریا کے ہے لیکن تر لب ساحل نہیں

یہ اہل حسن کی محفل ہے اس کا کیا کہنا　　بجائے شمع، یہاں دل جلائے جاتے ہیں
پکار کر یہی کہتی ہے ہر شکست حباب　　یہاں جو سر ہیں اٹھاتے مٹائے جاتے ہیں

بساط دہر پہ چلتے ہیں جو اکڑ کے قتیلؔ   پس فنا وہ لحد میں دبائے جاتے ہیں

عشق میں دنوں ہی بیتاب ہیں جل جانے کو   شمع بھی موم ہوئی دیکھ کے پروانے کو
کیا عجب ہو دل صد چاک سرفراز قتیلؔ!   زلف محبوب میں ملتی ہے جگہ شانے کو

(۶۴)

آپ کی وفات ۲۷ر جولائی ۱۹۸۵ء کو ہوئی۔ اور خانقاہ شاہ ٹولی دانا پور پٹنہ میں مدفون ہوئے۔

(۲۱)

مولانا سید شاہ محمد ایوب ابدالی نیرؔ اسلام پوری

سید شاہ محمد ایوب ابدالی نام، نیرؔ تخلص تھا۔ جناب سید شاہ سید علی کاملؔ اسلام پوری کے فرزند تھے۔ اور حضرت سید شاہ فرزند علی صوفیؔ منیری کے پوتے تھے۔ قصبہ اسلام پور ضلع پٹنہ مسکن تھا، ۲۰ر محرم الحرام ۱۳۲۴ھ یوم ولادت ہے۔ نیرؔ اسلام پوری کے چار رسالہ ہیں۔ ایک عقاید کے بیان میں یہ رسالہ ۵۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا تصوف کے بیان میں اس کا نام الاحسان ہے، یہ بھی ۵۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ تیسرا رسالہ ذکر اور شغل کے بیان میں۔ اور چوتھا رسالہ اپنے والد سید شاہ سید علی کامل اسلام پوری کے حالات پر مشتمل ہے۔ نیرؔ کو تحصیل علوم عربیہ کے دوران ہی میں شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت عرفان اسلام پوری سے شعر گوئی میں تلمذ تھا۔ صفائی، سلاست بیان اور روزمرہ کے محاوروں کی طرف طبیعت کا میلان زیادہ تھا۔ ۳ر رجب ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۷ء اسلام پور میں انتقال کیا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

خجل چال سے تیری کبک دری ہے   ترے حسن کو دیکھ حیراں پری ہے
قیامت کا پتلا وہ رشک پری ہے   کہ ہر چال میں اس کی آفت بھری ہے
بلا ہے کرشمہ، ادائیں قیامت   ستم غمزہ، آفت کی عشوہ گری ہے
گئے اس کی محفل میں جب ہم، تو ہم پر   وہیں کچھ نہ کچھ اس نے تہمت دھری ہے
زمانے کو بھی یوں بدلتے نہ دیکھا   نظر جس طرح تیری ظالم پھری ہے

وہ جس دل کو تا کیں نہ ہو کیوں وہ بسمل
غضب اِن کی آنکھوں میں جادو گری ہے
چلے، لیتے ہی دل، نہ بیٹھے ذرا تم
یہی مہرباں! شیوہ دلبری ہے
یہ دیتا نہیں چین کیوں عاشقوں کو
یہ کیا گردش چرخ نیلوفری ہے
جو پوچھا کہ یہ عشق کیا ہے؟ تو بولے
کسی نے کہا ہنس کے میٹھی چھری ہے
مجھے اپنے دلبر سے مطلب ہے نیرؔ!
غرض کس کو کیا حور کیسی پری ہے

بس وہی زیست کا مزا جانے
درد کو اپنے جو دوا جانے
حیف میں تجھ کو باوفا سمجھوں!
اور تو مجھ کو بیوفا جانے
طلب دل پہ ناز سے بولے
میں نہیں جانتا خدا جانے
کون مرتا ہے، کون جیتا ہے
کیا غرض آپ کی بلا جانے
وائے غفلت کہ ہو نکمّا اور
خود کو انسان کام کا جانے
اس سے کیونکر وفا کی ہو امید
بے وفائی کو جو وفا جانے
سب سے اچھا ہے بس وہی نیرؔ
آپ کو سب سے جو برا جانے

محبت میں جی سے گذر جائے گی
مری جان بھی نام کر جائے گی
رُکے تم مرے قتل سے یہ بتاؤ
یہ میری بلا کس کے سر جائے گی
انہیں بھی یہ تڑپائے گی ایک دن
یونہی آہ کیا بے اثر جائے گی؟
کمی جور میں ہو، یہ مانا مگر
تری خوبھی اے فتنہ گر جائے گی؟
نہ نکلے گی نیرؔ کوئی آرزو
یونہی عمر ساری گزر جائے گی

(۶۵)

(۲۲)
مولانا بدیع الزماں قمر نعمانی سہسرامی

بدیع الزماں نام، قمر تخلص۔ قمر نعمانی سہسرامی سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام مولانا حکیم ابو

نعمان لعل زماں قمر نعمانی تھا۔آپ کی ولادت ماہ صفر ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء ہے۔ابتدائی تعلیم مدرسہ خیر یہ نظامیہ سہسرام میں ہوئی۔جس کے بانی مولانا فرخند علی فرحت سہسرامی تھے۔جو مولانا عبد الکافی الہ آبادی کے شاگرد تھے۔پھر مولانا عبدالکافی کے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں داخل ہوئے،اور فارغ التحصیل ہوئے۔

طالب علمی کے زمانہ میں ہی شعروشاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔علامہ شفقؔ عماد پوری گیاوی سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔بعد میں علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کے بعض اشعار سے متاثر ہوکر ان کے شاگرد ہوگئے۔سیمابؔ اکبرآبادی کے اہم شاگردوں میں سے تھے۔جن کو انہوں نے اپنی زندگی میں دوسرے کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت دے دی تھی۔انہوں نے اردو شاعری کی خاموش خدمت کی۔کوکن کے بہت سے شعراء کے شعری ذوق کی تربیت کی۔اس علاقہ میں اردو زبان اور شاعری کا جو معیار نظر آتا ہے۔اس میں مولانا قمر نعمانی کا بڑا حصہ ہے۔اخیر عمر میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہوگئے اور ۳۰ رمئی ۱۹۶۷ء میں وفات پائی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

جو کام بزم وفا میں نہ داستاں سے چلا ۔۔۔ وہ ایک درد میں ڈوبی ہوئی فغاں سے چلا
تھی جس کی ضو سے مری زندگی میں تابانی ۔۔۔ ستارے کو مٹا کے وہ آج آسماں سے چلا
تجھے وفا و ہوس میں بھی امتیاز نہیں ۔۔۔ یہ حال ہے تو میں اب تیرے آستاں سے چلا
کسی کو ریشہ دوانی کا کیا کروں شکوہ ۔۔۔ مرا نصیب ہی خود مل کر آسماں سے چلا
ہوئی نہ ذوق کو میرے ضرورت رہبر ۔۔۔ الگ تھلگ رہ الفت میں کارواں سے چلا
سمجھ لیا تھا جسے تونے ہیچ و ناکارہ ۔۔۔ وہ کامیاب تری بزم امتحاں سے چلا
کہاں یہ ہستی ویران کہاں وہ عالم کیف ۔۔۔ یہ دیکھ تیرے اشارے پہ میں کہاں سے چلا
مضائقہ نہ ہو کوئی تو دیکھ لو آکر ۔۔۔ کہ ایک پیکر صدق وصفا جہاں سے چلا
کہیں پکار نہ اٹھے یہ خلق تنگ آکر ۔۔۔ کہ نظم گلشن ہستی نہ باغباں سے چلا
قمرؔ وہ تیر کی صورت اتر گیا دل میں ۔۔۔ ہوا کے دوش پہ تنکا جو آشیاں سے چلا

تمہاری یاد سے دم بھر بھی میں غافل نہیں رہتا　　کبھی اک سانس بھی جاتی نہیں ہے رائگاں میری

اٹھا رکھا ہے اس نے فیصلہ دنیا کا عقبیٰ پر　　ہمارا مدعا یہ تھا جو ہوتا یہاں ہوتا
قمؔر ان کو نہیں احساس تک میری وفاؤں کا　　خوشی پر جن کی قرباں کردی میں نے ہر خوشی اپنی

نہیں آسان کچھ مجھکو مٹانا بزم ہستی سے　　رہے گا رہتی دنیا تک یہاں نام ونشاں میرا

قدم راہ وفا میں ڈگمگا جائیں یہ ناممکن　　ہوا ہے بارہا اس راستے میں امتحاں میرا

قمؔر! مجھکو تو اس کی زندگی پر رشک آتا ہے　　ہجوم غم میں بھی جس کو نہ آتا ہو حزیں ہونا

(٦٦)

(۲۳)

مولانا عبید الرحمن عاقل رحمانی

عبید الرحمٰن نام، عاقلؔ تخلص۔ قلمی نام عاقل رحمانی۔ مولوی محمد ابراہیم کے صاحبزادے۔ مولد و مسکن موضع پیغمبر پور ضلع دربھنگہ سال ولادت ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء ہے۔ ابتدائی تعلیم والدین کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ پھر مدرسہ احمد یہ سلفیہ لہیر یا سرائے میں داخل ہوئے۔ جہاں سے انہوں نے سند فراغت حاصل کی۔ مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے دار الحدیث رحمانیہ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا احمد اللہ شیخ الحدیث اور مولانا سکندر علی ہزاروی سے تعلیم کی تکمیل کی۔ تقریباً ۱۶/۱۷ سال تک دار السلام عمر آباد (مدراس) میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ پھر مدرسہ احمد یہ سلفیہ لہیر یا سرائے دربھنگہ میں مدرس اول کے ممتاز عہدے پر سرفراز رہ کر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

عاقلؔ کا مذاق شعر و سخن بہت ستھرا تھا۔ مشکل سے مشکل قوافی اور ادق سے ادق ردیف میں غزلیں کہہ دینا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر حضرت مولانا یہاں بھی کامیاب وکامران دکھائی دیئے۔ انہیں حضرت محویؔ صدیقی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ دربھنگہ کے اساتذہ میں ان کا

شمار ہوتا تھا۔کلام میں طرز خاص کے علم بردار تھے۔طبیعت میں بے نیازی بدرجہ اتم موجود تھی۔اس لئے کلام کا معتد بہ حصہ ضائع ہوگیا۔پھر بھی جو کچھ ہے غنیمت ہے۔مشاعروں میں کم ہی شریک ہوتے تھے۔لیکن خصوصی نشستوں میں شرکت ضرور ہوتی تھی۔

مختصر سی علالت کے بعد ۱۳ رمضان ۱۴۰۲ھ/ ۵ جولائی ۱۹۸۲ء کو انتقال فرمایا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ذرا سی بات پردا ور سن، پھر میری رسوائی
نوائے راز کیوں آئی زباں پر اس گلستاں میں
جنون عشق کی یہ کارفرمائی مبارک ہو
کہ چاک دل نظر آنے لگا چاک گریباں میں
یہ عالم ہے ترے خمخانہ عرفاں کی تنگی کا
کہ عاقلؔ ایک ہی اب محرم اسرار ہے ساقی

خون کے آنسو نہیں تو اے غم فصل بہار دامن رنگیں ہی میرا گلستاں ہوجائے گا
اور کچھ دن ہے اگر دل کی یہی افسردگی گوشۂ قید قفس ہی آشیاں ہوجائے گا
عشق کی ناکامیاں ہی زندگی کا راز ہیں
کون کہتا ہے غم دل رائیگاں ہوجائے گا

سکون دل پہ مرنے والے کوئی اور ہی ہوں گی
یہ اپنے دل کی بے تابی ہی مجھ کو ساز گار آئی
نشاط حسن رنگیں کا چمن اک کھل گیا عاقلؔ
وہ کیا آئے میرے وحشت کدے میں اک بہار آئی

فریب جلوہ گلہائے رنگیں اف معاذاللہ
چھپی پھرتی ہے ان پردوں میں برق آشیاں ہم سے (۶۷)

(۲۴)

مولانا محمد نور الہدیٰ نورؔ اصلاحی

محمد نور الہدیٰ نام۔نورؔ تخلص۔تاریخی نام مظفر علی جس سے سال ولادت ۱۳۳۰ھ نکلتا ہے اس طرح سنہ عیسوی ۱۹۱۱ء ہوتا ہے۔حضرت مولانا محمد قمر الدین قمر اعظمی کے بڑے صاحبزادے تھے۔مولد و آبائی وطن ہمئی پور،ضلع اعظم گڑھ ہے۔ان کے دادا شیخ منصب علی ہمئی پور کے ممتاز لوگوں میں تھے۔

مولانا نور الہدیٰ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہمئی پور ہی میں حاصل کی۔مولوی محمد یوسف سے اردو اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔۱۹۱۹ء میں ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔تو ان کے والد حضرت مولانا قمر انہیں دربھنگہ لے آئے۔دار العلوم مشرقیہ حمیدیہ،قلعہ گھاٹ میں داخل ہوئے۔ حضرت مولانا محمد اسحاق خان جالویؒ سے قصد الصیغہ اور آمد نامہ پڑھا۔انہوں نے وہیں کچھ اسباق حضرت مولانا طٰہٰ الٰہی فکری سے بھی پڑھے۔جوان دنوں اسی مدرسہ میں تھے۔مولانا نے ابتدائی تعلیم یہیں تعلیم حاصل کی۔پھر مدرسہ مصباح العلوم چوک الہٰ آباد میں داخل کئے گئے۔وہاں حضرت مولانا محمد شریفؒ شاگرد شید حضرت مولانا برکات احمدؒ ٹونکی سے درس لیتے رہے۔۱۹۲۹ء میں مدرسہ ستہ الاصلاح سرائے میر بھیج دیئے گئے۔وہیں سے ۱۹۳۳ء میں انہوں نے سند فراغت حاصل کی۔اپنے اساتذہ کے ایماء پر انہوں نے مدرسہ مذکور کی ملازمت ۱۹۳۴ء میں قبول فرمائی۔اور ۱۹۴۸ء تک وہیں درس و تدریس میں مشغول رہے۔۱۹۴۸ء ہی میں حضرت مولانا نورؔ اصلاحی دربھنگہ تشریف لے آئے اور جامع مسجد،کٹکی بازار،دربھنگہ سے متعلق ہوئے۔تقریباً ۱۷ر سال مسجد کے خطیب اور پیش امام رہے۔تقریباً ۱۹۶۸ء میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہوکر اپنے مکان محلہ اردو بازار،دربھنگہ میں رہنے لگے۔۱۳ر ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ/ ۲۷ر جولائی ۱۹۷۲ء کو انتقال فرمایا۔

نورؔ اصلاحی ابتداء ہی سے ادبی ذوق رکھتے تھے۔شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی۔گھر کا ماحول بھی علمی تھا۔آپ کے والد بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ماموں مولوی رشید صدیقی جونپوری،بلند پایہ ادیب اور صحافی تھے۔بمبئی سے ادبستان نکالتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ نورؔ اصلاحی پر بھی گھر کے ماحول کا پورا اثر تھا۔وہ مختلف حادثات سے دوچار ہوتے رہے۔اس لئے ان کے اشعار میں آپ بیتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی اپنی بات نہیں کہی بلکہ ہر قاری کے دل کی

بات ہے۔ (۶۸)

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

غم کو خوشی کے جام میں ڈھالے ہوئے تو ہیں — پیدا اندھیری شب سے اجالے ہوئے تو ہیں
جیسے بھی ہوں یہ ہاتھ مرے لیکن آپ کی — دستار خواجگی کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
وحشت کی خاک ہوش پہ ڈالے ہوئے تو ہیں — دیوانگی کا نام اچھالے ہوئے تو ہیں

مرے دل میں غم کی صباحتیں ترے دل میں یاس کی ظلمتیں
مری شام غم کی سحر تو ہے، تری شام کی تو سحر نہیں
وہی شاہراہ جہان دل ،وہی حبس کا غم غم معتبر
وہی شاہ راہ جہان دل، ترے غم کی راہ گذر نہیں
یہ ہجوم جلوۂ مہوشاں، یہ تجلیاں پے عاشقاں
وہ ہیں آج بام غرور پر جنہیں خود بھی تاب نظر نہیں
تجھے فکر نکہت و رنگ گل، مجھے رنج سارے چمن کا ہے
مجھے تیرے غم کی خبر تو ہے، تجھے میرے غم کی خبر نہیں

عروج پاتی ہے خاک برہنہ پائی بھی — کہے تو کون زمانے کے کج کلاہوں سے
کھلے ہو پھول کی مانند لیکن اے غنچو! — یہ سر بھی چڑھتا ہے، گرتا بھی ہے نگاہوں سے
گئی تھی بہر تماشا نگاہ محرومی — نوید زیست پھری لے کے قتل گاہوں سے
زباں دعاؤں سے، دل منحرف ہے آہوں سے — فغاں چلی ہے مری خامشی کی راہوں سے
اک آہ اور بھی ہے خسروی کے متوالو! — ابھرتی ہے جو تعیش کی خواب گاہوں سے
یہ ظلمتوں سے اجالوں کی مانگتے ہیں بھیک
خدا بچائے تجھے نور کم نگاہوں سے

روئے نگار عقل بھی اب آب آب ہے — صد شکر میری سعئ جنوں کامیاب ہے

اک یادان کی، اک دل خانہ خراب ہے — پہلو میں آفتاب کے اک آفتاب ہے
خودان کو اپنے جور پہ اب پیچ وتاب ہے — شاید دل حزیں کی دعا مستجاب ہے
جو نقش آب آج ہے، پتھر کی ہے لکیر — پتھر کی جو لکیر ہے، وہ خط برآب ہے
کیوں حسن انتخاب کو الزام دیجئے — کیوں کہئے میرا ذوق نظر کامیاب ہے

وہ نورؔ علم وفن ہو کہ ہو شمع فکر وہوش
کوئی بھی ان میں نورؔ ہدیٰ کا جواب ہے

اٹھالو نورؔ تقدیس وفا کا بڑھ کے پیمانہ — کہ ہر اشک چکیدہ آج ہے تسبیح کا دانہ
نظر اٹھے تو ہم دیتے ہیں نقد دل کا نذرانہ — مگر محفل میں رہتے ہیں باندازِ گدایانہ
تمنا تھی کہ محفل میں چراغ ایسا بھی اک جلتا — کہ جس پر جان دے کر زندگی پاتا ہو پروانہ
بھلا یہ حلقۂ اہل صفا میں خاک کیوں اڑتی — اگر ہوتا ترا زاہد مذاق زہد، رندانہ
یہی ہے فرق ترک واختیار میکشی زاہد — کسی کا دل سیہ خانہ، کسی کا آئینہ خانہ
یہ اپنے شور وحشت کا مداوا آپ کرلیں گے — پکارے بھی تو ان کے وحشیوں کو کوئی ویرانہ

چلو اب نورؔ صحرا چھوڑ و آبادی کا منھ دیکھیں
کہ یاں دیوانہ ہی دیوانے کو کہتا ہے دیوانہ

شاہد ان ستم ایجاد آئے — عاشقی تیرے کرم یاد آئے
رند در خرقۂ زہاد آئے — بزم میں شیخ بہت یاد آئے
مئے کی ہر بوند دھواں بن کے اڑی — رند جب بالب فریاد آئے
تشنہ لب آج کی پرویزی ہے — کوئی باتیشہ فرہاد آئے
شیخ پہنچے جو خبر لینے کو — رند چیخے کہ وہ 'استاد آئے
دیدنی بے کسیٔ جور تھی آج — نورؔ تم ان کو بہت یاد آئے

نورؔ! یہ تیری نوائے کہنہ
دیکھ وہ آج کے نقاد آئے

بس ایک وعدۂ فردا کا ہے یقیں ناصح! وگرنہ اب کسی وعدۂ کا اعتبار نہیں
عنایت کرم بے حساب کیا کہنا یہاں بھی اپنے گناہوں کا اب شمار نہیں
رہ طلب میں تو کانٹے ہزار ہیں لیکن چھبے جو پائے طلب میں وہ خار نہیں

وہ نورؔ زہر سہی جام میں تو ڈھل جائے امید وبیم کا عالم تو سر سے ٹل جائے
تجھے یہ غم کہ مسافر ہیں راہ کے تھوڑے مجھے یہ ڈر، نہ کہیں راستہ بدل جائے
مٹے بھی کشمکش ترک واختیار اے دل! یہ آستیں کا تری سانپ تو نکل جائے

حسن کے چرچے بہت، الفت کے افسانے بہت غم کا میخانہ سلامت دل کے پیمانے بہت
ناصحو! دل میں محبت کے دیئے روشن تو ہوں خود ہی جل مرنے کو پیدا ہوں گے پروانے بہت

بساط حسن الٹ جائے پل میں اے ہمدم! ترا ہی جوش جنوں کارگر نہیں ہوتا
ان آنسوؤں پہ مجھے نورؔ رحم آتا ہے
کہ جن میں قطرہ خون جگر نہیں ہوتا

کرم کو جانے ہے، اپنی خطا کو جانے ہے فقیہو! نورؔ بھی اپنے خدا کو جانے ہے
کوئی خیال تو وجہ سکوں ہے آخر شب کوئی تو حال دل مبتلا کو جانے ہے
اٹھایا جام تو کچھ اور محتسب سمجھا وہ کب مری نگر ہہ پارسا کو جانے ہے
عبث ہے یارو چراغوں کے گرد کوئی حصار کہ نورؔ آج کی چلتی ہوا کو جانے ہے
ہوئے ہے کب مجھے عرض سوال کی جرأت وہ بے کہے مرے ہر مدعا کو جانے ہے
وہ خود کو بھول کے بیٹھا ہے ورنہ ہم نفسو!
زمانہ آج بھی نور الہدیٰ کو جانے ہے

ہر سوز ترے ساز کا افسانہ کہے ہے — جو شمع کہے ہے وہی پروانہ کہے ہے
تم بھی تو کہو پیر مغاں گذرے ہے کیسی — پیمانہ امروز تو کیا کیا نہ کہے ہے
یہ کیسی ہوا آج بیاباں میں چلی نورؔ
دیوانہ بھی دیوانے کو دیوانہ کہے ہے

سادگی میں وہ اکثر اور بھی نکھرتے ہیں — اور ہم سے دل والے سادگی پہ مرتے ہیں
جب عروج محفل پر، شمع تھر تھراتی ہے — روشنی کے دیوانے اپنا کام کرتے ہیں
عیب کیا، اگر چکھ لیں آج نورؔ صاحب بھی
کارمئے فروشاں اب پاکباز کرتے ہیں

وفا اک نیا حوصلہ پائے ہے — تغافل بڑا کام کر جائے ہے
وہ آئے ہے آکے چلا جائے ہے — کہیں جاکے تب دل پتہ پائے ہے
زمانہ یہ دن آج دکھلائے ہے — مری بے کسی میرے منہ آئے ہے
زمانہ ہوا اس کو سمجھے ہوئے — زمانہ جسے آج سمجھائے ہے
میں خار آنکھ کا تیری نکلا تو کیا — یہ دل میں جو کانٹا رہا جائے ہے
یہ ہے کون سی بزم جان حیا؟ — کہ حسن تصور بھی شرمائے ہے
خدائی کے تیور سے خالی جبیں — کوئی سجدہ جیسے رہا جائے ہے

ہو اکس طرف کی، قدم کس طرف
کوئی نورؔ سا سر پھرا جائے ہے **(۶۹)**

(۲۵)
مولانا سید عبد المجید مضطرؔ مظفر پوری

سید عبد المجید نام، مضطرؔ تخلص۔ مولد و مسکن محلہ چندوارہ، مظفر پور۔ ان کی پیدائش اپنے آبائی

مکان مظفر پور میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فارسی و عربی کی تعلیم بھی مکان ہی پر اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔حفظ کلام پاک کیا۔پھر بنارس تشریف لے گئے۔اور حافظ جمن صاحب کی خدمت میں رہ کر حفظ کلام پاک میں پختگی حاصل کی۔اس کے بعد ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ میں داخل ہوئے۔فن تجوید و قرأت کی مشق کی۔معقول و منقول کی درسی کتابیں تمام کیں ۔حصول سند و دستار بندی کے بعد مظفر پور لوٹ آئے۔مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں دینی خدمت انجام دینے لگے۔ساتھ ساتھ خاندانی سلسلہ رشد و ہدایت بھی قائم رکھا۔دوبار حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے۔ایک مرتبہ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء میں اور دوسری بار ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں مشرف ہوئے۔

حضرت مضطرؔ نے دو تین دنوں کی قلیل علالت کے بعد ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۷ء میں انتقال فرمایا۔

جناب مضطر نے جب، آنکھ کھولی تو گھر میں شعر و سخن کا ماحول پایا۔ابتداء میں اپنے بھائی حضرت احقرؔ مظفر پوری سے اصلاح لیتے رہے پھر قیام لکھنؤ کے دوران علامہ آرزوؔ لکھنوی کی طرف رجوع فرمایا اور ایک عرصہ تک انہیں سے مشوروں لیتے رہے۔ابتدا میں برترؔ تخلص کرتے تھے۔بعد کو مضطرؔ اختیار کیا۔رنگ قدیم سے والہانہ محبت تھی۔اس رنگ میں سیدھے سادے اشعار کہنا اور وہ بھی بھرپور انداز سے کہنا کچھ جناب مضطرؔ ہی کا کام تھا۔انہوں نے اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔لیکن غزل کو اپنے لئے مخصوص کیا۔بقول مولانا عبدالسلام ندوی ان کے کلام میں ''غزل کے تمام اصول و قواعد زبان و محاورہ اور شاعرانہ مناسبتوں کی پابندی پائی جاتی ہے''۔درحقیقت روزمرہ کی زبان میں سلیس انداز بیان کے ساتھ طرز ادا کا جو لوچ حضرت مضطرؔ کے کلام میں ہے، وہ ان کے ہم عصر اکابر شعراء میں سے بہت کم ہی کو نصیب ہے۔

دیوان مضطرؔ موسوم بہ 'ریاضی فردوس' ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ان کی حیات ہی میں معارف پریس اعظم گڈھ سے باہتمام حضرت مولانا مسعود عالم ندوی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔جس میں تعارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اور مقدمہ مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے۔اور تقریظوں میں ایک جناب سید ریاض حسن خاں خیالؔ مظفر پوری اور دوسری حضرت علامہ ریاض علی وحشتؔ کولکاتوی کی ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

دل کے بہلانے کے فرقت میں اٹھائی جو کتاب وائے تقدیر کہ وہ درد کا دیواں نکلا

جان کر شیشۂ دل ہم نے اٹھا یا تو مگر کسی بدعہد کا ٹوٹا ہوا پیماں نکلا

پوچھتے ہو رنگ و بو کا کیف دیوانے سے کیا غنچۂ و گل کی مہک آئے گی ویرانے سے کیا

دل کے داغوں پہ ہے مدارحیات انہی پھولوں سے ہے بہار حیات
مرنے والوں کی بھی کمی ہے کچھ کھیلئے شوق سے شکار حیات

ابھی ہے خون بسمل دست قاتل پر حنا ہو کر کہاں جائے گا قید حسن سے آخر رہا ہو کر

تیرا سوال دونوں جہاں کا سوال ہے یعنی خدائی مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

طعنے شب فراق میں دیتی ہے بے کسی اے موت آکے رات کٹی انتظار میں

صرف دیوانہ ہی کہہ کر رہ گئے اور کچھ اے مہرباں ارشاد ہو
رات دن آتے تھے تم میرے یہاں بات یہ کل کی ہے شاید یاد ہو
آپ کو مجھ سے محبت ہے بجا کیا کہا پھر تو ذرا ارشاد ہو
آبلے پاؤں کے جنگل میں ہوئے سینہ سپر
راہ کانٹوں نے جو روکی ترے دیوانے کی

کیا کہوں کیوں دل پہ آفت آگئی خود بدولت کی بدولت آگئی
دے دیا دل جس کو چاہا دے دیا آگئی جس پر طبیعت آگئی
آپ اور جور وجفا بالکل غلط لب پہ بھولے سے شکایت آگئی

قہر ہے مضطرؔ سے ان کا پوچھنا
سچ کہو کس پر طبیعت آگئی

جب یہ دیوانی جوانی جائے گی — شیخ کی ہر بات مانی جائے گی
عرش تک پہنچے گی آہ نارسا — دور تک اپنی کہانی جائے گی
دل بھر آئے گا سنیں گے جب وہ آہ — یہ ہوا برسا کے پانی جائے گی

طواف خانہ کعبہ کوئی کمال نہیں
بڑا کمال ہے دل میں کسی کے گھر کرنا

میری طرح سے ان کے گریباں بھی چاک ہیں
پھولوں کو بھی بہار نے دیوانہ کر دیا

رہ وفا کے مسافر کریں میری تقلید دلیل راہ ہوں میں گرد کارواں کی طرح

ترے اسیر کرم کو ستم سمجھتے ہیں قفس میں بند ہیں پھر بھی ہیں شاد ما صیاد

انہیں کی زندگی اچھی انہیں کی موت بھی اچھی جو تم پر جان دیتے ہیں جو تم پر مرنے والے ہیں

اک مہر عاشقی ہے اک مہر بندگی ہے
اک داغ ہے جگر میں اک داغ ہے جبیں پر

یہی دو چار ہمدم ہیں مرے راہ محبت میں جگر میں داغ ہیں آنکھوں میں آنسو لب پہ نالے ہیں

کنارہ کش ہے مرا دل بھی مجھ سے الفت میں
شریک کوئی کسی کا نہیں مصیبت میں
غرض یہ ہے کہ نہ ہو کوئی طالب دیدار   کلیم وطور کے قصے سنائے جاتے ہیں

عدو کے پاؤں پر سر رکھ دیا   گرایا ہے زمیں پر آسماں سے

حسن کے دم سے ہے دنیائے محبت آباد   شمع کہتے ہیں جسے جان ہے پروانے کی

ایسی قسمت کہاں کہ جام آتا   بوئے مئے بھی ادھر نہیں آتی

فصل بہار آئی ہے پھر آس بان سے   توبہ پھر آج ٹوٹنے والی ہے شان سے

مئے ہے کہ نگاہ مست ساقی   آنکھیں ہیں کہ وہ شراب خانے

کتاب زندگی پر چاہئے گہری نظر مضطرؔ
کہ ہر نقطہ سبق آموز ارباب بصیرت ہے

کسی کے وعدہ فردامیں مسیحائی   بہت بڑا سہارا ہے زندگی کے لئے

رکھنا سنبھل سنبھل کے رہ عشق میں قدم   یہ اور ہی گل ہے ذرا دیکھ بھال کے
واعظ نے جس کو دوزخ وجنت سمجھ لیا   جلوئے ہیں یہ کسی کے جلال وجمال کے

کہیں رسوائے عالم کر نہ دیں حسرت بھری آنکھیں
یہ خاموشی مری ہنگامہ محفل نہ بن جائے

سناتا ہوں اسی کو داستان درددل مضطرؔ
طبیعت جس کی کچھ درد آشنا معلوم ہوتی ہے

اپنا پتہ ملا تو پھر اپنا پتہ کہاں
اب آشنا کہاں کوئی ناآشنا کہاں

غلط ہو جاتے ہیں سب رنج وغم ایسا بھی ہوتا ہے
کبھی اس بت کا انداز کرم ایسا بھی ہوتا ہے

اٹھ گیا قیس اٹھ گئی لیلیٰ پردہ اب تک اٹھا نہ محمل کا

وہ آپ اپنی نظر میں سمائے جاتے ہیں سنورتے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں
(۷۰)

(۲۶)
مولانا سید محمد شمس الحق شمسؔ ویشالوی

سید محمد شمس الحق نام شمسؔ تخلص، والد کا نام سید محمد ابراہیم، پیدائش ۱۹۱۶ء آبائی گاؤں چک اولیاء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے برادر مکرم مولانا منظور الحق سے حاصل کی۔ اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ پھر مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی میں داخل کئے گئے۔ وہاں قدوری تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم کیا۔

آپ کو شعروشاعری کا ذوق شروع ہی سے تھا۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ابتدائی دور کی نظمیں، غزلیں اور

نعتیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ لیکن بعد کے نعتوں کو جمع کر دیا گیا ہے جو ''یاد حرم'' کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا کی شاعری میں اسلامی افکار و خیالات کی پوری ترجمانی ملتی ہے۔ ساتھ ہی ذوق وشوق کی فراوانی اور جذبات کی طہارت و پاکیزگی بھی ہے۔ ''یاد حرم'' کے اخیر میں ''فغان دل''، ''بہ یادگار بابری مسجد'' کے نام سے ایک عمدہ نظم ہے جو دلی کیفیات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس وقت کی حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ پوری نظم ملاحظہ کیجئے۔ جس میں بابری مسجد کی تعزیت، تعمیر نو کی دعا، ظالموں کے انجام کے طرف اشارہ، حالات کی عکاسی اور شاعر کی دل کی آواز ہے۔

قیامت سے ہوئی پہلے قیامت بابری مسجد　　شہادت پا چکی تیری عمارت بابری مسجد
نہ ہوں مغرور اعداء اپنی طاقت اور کثرت پر　　کہ ہے حامی ہمارا دست قدرت بابری مسجد
کہیں طاعون پھیلا اور کہیں پر زلزلہ آیا　　خدا کی، ظالموں پر ہے یہ لعنت بابری مسجد
بحمد اللہ ہوئے اکتیں سیوک آنکھ کے اندھے　　بہت کچھ اور بھی آئے گی آفت بابری مسجد
تری تعمیر نو کی بھیک مانگو تیرے اعداء سے　　نہیں کرتی گوارہ اپنی غیرت بابری مسجد
یقینا ایک دن خون شہادت رنگ لائے گا　　کریں گے تیرے حلقے میں امامت بابری مسجد
وہ ناکارہ حکومت کی ابھلا مسجد بنائے گی　　نہ جس سے ہو سکی تیری حفاظت بابری مسجد
وہ دن بھی آئے گا بیشک تری تعمیر نو ہوگی　　بڑھے گی اور تیری شان وشوکت بابری مسجد
کریں آباد پھر آئندہ نسلیں خانہ حق کو　　کیے جاتا ہوں میں اتنی وصیت بابری مسجد

غزل کے آہنگ میں چند اشعار پیش ہیں ؎

گو ضبط سے ہم نے کام لیا پر اپنا اثر دکھلائی ہی گئی
اک آہ جو پہونچی تا بفلک، وہ خون شفق رلوا ہی گئی

ملتی ہے تڑپنے میں لذت، اس روح سکوں نامحرم کو
اس برق تجلی کے صدقے تڑپی جو کہیں تڑپا ہی گئی

اصلاح کی کیا امید اس سے، خود جس کی ہو فطرت ہی میں کجی
زلف ان کی اگرچہ سلجھا کی، پرکار جہاں الجھا ہی گئی

جو آپ نے مجھ کو غم بخشا وہ میں نے لیا سینہ سے لگا
وارفتہ مزاجی یہ میری کام آپ کے آخر آ ہی گئی

تہذیب نوی کا حشر یہی ہے جھوڑ کے نور فطرت کو
بجلی کی ترقی ہوتے ہوئے دنیا میں سیاہی چھاہی گئی

سرشار مئے توحید تھے جب عظمت نے تمہارے پاؤں لئے
جب جادۂ دین سے کترائے تو دنیا بھی کتراہی گئی

ممنون تکلم ہوکر میں تشہیر محبت کیا کرتا
بس ان کی نظر نے سن ہی لیا کچھ میری نظر فرماہی گئی

احساس غم بیدار ہوا، اور اشک ندامت رک نہ سکا
اس چشم حسین کو کیا کہئے جو پی نہ سکی چھلکاہی گئی

وہ کالی گھٹا، سرمست فضا، پرکیف ہوا، ساقی کی ادا
ایسے میں جو دور جام چلا زاہد کی نظر للچاہی گئی

کیا شعروسخن سے مجھ کو غرض اے شمسؔ میں اس کو چھوڑ چکا
طلبہ کا مگر اصرار ہوا کچھ بات زباں پر آہی گئی

(۷۱)

۲۵ رنومبر ۲۰۰۷ء کو آپ کی وفات ہوئی۔

(۲۷)

مولانا سید شاہ مراد اللہ اثرؔ منیری

سید شاہ مراد اللہ نام، اثرؔ تخلص۔ ۱۳ رمحرم ۱۳۳۶ھ کو منیر شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ملا ثانی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العماء لکھنئو کے درجہ عالم میں داخل ہوئے۔ کئی سال تک وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے ۱۹۴۲ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں آخری درجہ ممتاز المحدثین کے امتحان میں کامیاب ہوئے، اس کے بعد منیر شریف واپس آ گئے۔ اور ۱۹۵۰ء سے مقامی ہائر سکنڈری اسکول میں ہیڈ مولوی کی جگہ پر خدمت انجام دیتے رہے۔

ابتدا میں آپ کے گھر کا ماحول ایسا رہا جس سے آپ کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف

ہوا۔ اور پھر شاہ محمد امیر بن سید محمد باقر عظیم آبادی نے آپ کی رہبری کی۔ تخلص مرادؔ اور اثرؔ کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دوران قیام میں مولوی حکیم سید احمد وارثی سیتاپوری کو آپ نے کئی غزلیں اور قطعات دکھائے۔ پھر حکیم ابو العلاء ناطقؔ لکھنوی سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ اور انہیں کلام دکھانے لگے۔ اپنے وطن واپس آنے کے بعد اپنے خسر شاہ محمد الیاس یاسؔ بہاری سے بھی اصلاح لی۔ مختلف رسالوں میں آپ کے کلام چھپتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں بزرگان منیر شریف کے حالات ''آثار منیر'' کے نام سے چھپوائے۔

۱۹۶۰ء میں آپ نے مذکرہ شعرائے منیر شریف مرتب کیا ہے۔ یہ فارسی اور اردو کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

آپ کا انتقال ۶ رمئی ۱۹۹۴ء کو ہوا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

درد دل ، اشک کی روانی ہے ۔۔۔ اب یہ سامان زندگانی ہے
زندگی ہے حباب کی صورت ۔۔۔ آپ سمجھے ہیں جاودانی ہے
ایسی ہستی کا اعتبار ہے کیا ۔۔۔ جس کا ہر نقش نقش فانی ہے
چین ملتا نہیں کسی صورت ۔۔۔ کچھ عجب طور زندگانی ہے
آج توبہ کی خیر ہو یارب ۔۔۔ بادہ شیشے میں ارغوانی ہے
درد دل کیوں نہ ہو عزیز اثرؔ ۔۔۔ یہ کسی دوست کی نشانی ہے

یاد ان کی ہے دل ناکام میں ۔۔۔ ہے یہی صہبا ہمارے جام میں
زلف جاناں میں ہے جب سے دل اسیر ۔۔۔ کٹ رہی ہے زندگی آرام میں
ماسوا سے ہم نے آنکھیں پھر لیں ۔۔۔ تھی کشش ایسی کسی کے نام میں
ڈھونڈھتے ہو آہ کیا دل کو اثرؔ ۔۔۔ وہ تو جا بیٹھا کسی کے دام میں

خواجگی ان کی بندگی اپنی ۔۔۔ حاصل زیست بن گئی اپنی
ان کے قدموں پہ جان دی اپنی ۔۔۔ خوب کام آئی زندگی اپنی

اب تو سر اور کسی کی چوکھٹ ہے ہائے کیا ہوگئی خودی اپنی
اے اثرؔ! بحر غم میں افتادہ اس کو دیکھ اور بے رخی اپنی

کل جس سے حسن ظن تھا وہی بدگماں ہے اب اس پر یہ لطف ہے کہ وہی رازداں ہے اب
یہ رعب حسن ہے کہ مجال بیاں نہیں کہنے کو یوں تو میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
جو امتحاں وفا کا تھا وہ ہم تو دے چکے تیری جفا کا دوست مگر امتحاں ہے اب
بلبل وہی، چمن وہی اور گل بھی ہے وہی برگشتہ پھر بھی کیوں نگہ باغباں ہے اب
سہہ لیگا تلخئ غم دوراں کو بھی اثرؔ تیرا کرم شریک اگر آسماں ہے اب

(۷۲)

(۲۸)

مولانا عبدالعلیم آسیؔ دربھنگوی

عبدالعلیم صدیقی نام۔ آسیؔ تخلص، مولوی علیم الدین صدیقی مختار سمستی پور ثم دربھنگوی کے خلف اصغر۔ آبائی وطن موضع بلبھدر پور ضلع سمستی پور مسکن محلہ پرانی منصفی شہر دربھنگہ۔ دربھنگہ میں ان کے والد نے اچھی خاصی زمین حاصل کی تھی۔ اسی لئے وہ یہیں مقیم ہوگئے تھے۔ اور یہیں ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں حضرت آسی صدیقی کی ولادت ہوئی تھی۔ تقریباً تین ماہ کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ غمزدہ ماں نے بیٹے کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لی۔

عربی تعلیم کے حصول کے لئے آسیؔ دارالعلوم مشرقیہ حمیدیہ' قلعہ گھاٹ' دربھنگہ میں داخل کئے گئے۔ دوران تعلیم ہمیشہ درجہ میں اول آتے رہے۔ ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں عالم کی سند لے کر موصوف پٹنہ تشریف لے گئے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۳۳ء میں فاضل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ور پورے بہار واڑیسہ میں اول آکر طلائی تمغہ پایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مسلم ہائی اسکول لہیر یاسرائے دربھنگہ میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چوں کہ ممدوح شروع ہی سے انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ اس لئے سیاست میں نمایاں ہونے لگے۔ اور اسی لئے ملازمت سے ۱۹۴۲ء میں سبکدوش ہوگئے۔

حضرت آسی کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں دربھنگہ سے ہمالہ جیسا مقتدر ماہنامہ شائع کیا، جس کے صرف تین شمارے منظر عام پر آسکے۔ جناب حسنین سید بی۔اے۔(جامعی) بھی اس کی مجلس ادارت میں برابر کے شریک تھے۔ ذوق صحافت انہیں کلکتہ لے گیا۔ وہاں یہ روزنامہ الحق کی مجلس ادارت سے منسلک ہوگئے۔ پھر شری ایم۔این۔رائے کے اردو اخبار جنتا کی زمام ادارت بھی سنبھال کر انہوں نے صحافیوں کی صف میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

حضرت آسی نے اپنی طویل علالت کے بعد ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء میں انتقال فرمایا۔ اپنے محلہ کی قبرستان میں دفن ہوئے۔

جناب آسی کو بچپن ہی سے شعر وسخن سے گہری دلچسپی رہی تھی۔ دوران تعلیم ہی ان کی تخلیقات مقتدر رسائل وجرائد کی زینت بن چکے تھے۔ یہ کہنہ مشق استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں مولانا قمر اعظمی سے مشورۂ سخن لیا۔ ان کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اردو وفارسی دونوں ہی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور کبھی کبھی عربی میں بھی۔ نظمیں بھی کہتے اور غزلیں بھی۔ قصیدے بھی، رباعیات وقطعات بھی۔ ڈاکٹر حسن امام درد نے ان کے نثری اور شعری تخلیقات کو منشورات آسی اور منظومات آسی کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

نیاز دیر وطواف حرم نہیں کرتے ۔۔۔ جو غیر کرتے ہیں افسوس ہم نہیں کرتے
وہ بارگاہ حکومت ہو یا در محبوب ۔۔۔ کہیں بھی ہم سر تسلیم خم نہیں کرتے
ہماری زلف کو سلجھائے کیسے دیوانے ۔۔۔ وہ کیا زمانے کی الجھن کا غم نہیں کرتے
سنا رہے ہیں زمانے کو حال دار ورسن ۔۔۔ ثنائے زلف ورخ یار ہم نہیں کرتے
قبائے غیر میں ہم کر رہے ہیں اب بھی رفو ۔۔۔ اور اپنے چاک گریباں کا غم نہیں کرتے
مصیبتوں میں بھی عادت ہے مسکرانے کی ۔۔۔ ہزاروں غم ہوں مگر فکر غم نہیں کرتے

گرفتہ دل ہوئے احباب ہم سے اے آسی
کہ شعر میں قد وگیسو رقم نہیں کرتے

ٹھکانہ مل گیا دار ورسن سے ہم کو منزل کا ۔۔۔ وفور شوق میں ورنہ خدا جانے کہاں جاتے

بڑی مشکل سے سنگ آستاں سے بچ کے ہم نکلے　　جبین شوق سے سجدوں کو ڈھلوانے کہاں جاتے

عارض میں جو چمک ہے کہاں آفتاب میں　　سرخی جو لب میں ہے کہاں ہے گلاب میں

پیچ وتاب دہر سے فرصت نہیں　　آپ کی زلفوں کو ہم سلجھائیں کیا

زمیں سے آسماں تک آسماں سے لامکاں تک ہے　　ذرا پرواز مشت خاک تو دیکھو کہاں تک ہے
یہ احساس تعلق مجھ کو مٹنے بھی نہیں دیتا　　کہ تیری داستاں کا ربط میری داستاں تک ہے
نوید رستگاری پہ عبث مسرور ہوتی ہے　　ابھی صددام اے بلبل قفس سے آشیاں تک ہے
بیابان محبت کی نوازش پوچھنا کیا ہے　　امید وبیم کی حالت فقط سود وزیاں تک ہے
کہاں سے آئے گی دنیا ہماری ہمتیں ہمدم!　　محبت میں قدم اپنا فقط کون ومکاں تک ہے
زمانہ چاہئے تکمیل ذوق ولذت غم کو　　ابھی دنیائے دل محدود ذکراین وآں تک ہے
ترانہ چاہئے آسی کہ روح عشق چونک اٹھے
خروش لالہ غم کیا جو سوز جسم وجاں تک ہے

تصورات کے پردے کو ہم اٹھا نہ سکے　　حدود عقل وگماں میں کبھی وہ آنہ سکے
مقام دارورسن سے گذر گئے جانباز　　حریم حسن لیکن سراغ پانہ سکے
فراز کون ومکاں اور تنگنائے غزل　　ہم اپنا رنگ تغزل کبھی دکھا نہ سکے

ایک طویل نظم بھی ملاحظہ ہو ؎

تحفئہ سال نو

اے خدائے حسن! اے پرودگار آرزو!　　اے جہان ناز وتمکیں، کردگار رنگ وبو!
تونے آسی کو بنا ڈالا سراپا اضطراب　　تیرا عاشق اور موج زندگی کا پیچ وتاب؟
جس نے اے محبوب! دنیا کو دیا درس کمال　　تیرے غم میں وہ ہوا جاتا ہے کیوں جی سے نڈھال؟
تو ہی کہہ انصاف سے کب ہے روا اے دل گداز!　　آرزو کی نرم ونازک پنکھڑی اور برق ناز؟

کیوں ہوا جاتا ہے اب بے رنگ و بو میرا شباب؟ آرزوئیں کیوں دل ناکام میں ہیں محو خواب؟
ہر گھڑی اب کیوں ستاتا ہے غم ہندوستاں؟ کیوں طلب گار سکوں ہے آج اپنا کارواں؟
حیف اپنی عمر ہوتی جاتی ہے یوں ہی تمام! کر سکی مجھ کو نہ سال نو کی آمد شاد کام
آرزوئیں ہو رہی ہیں میرے دل میں پائمال یوں گذرتے جا رہے ہیں بے ترنم ماہ سال
اے شعاع مہر نو! ہاں میرے سینے کو نہ چھید! اس دل ناکام کو اب کر نہ غم سے ناامید!

سال نو میرے لئے ہے رنج وحسرت کا پیام!
کون دے سکتا ہے اس دل کو مسرت کا پیام!

لیکن ان مایوسیوں میں چشمۂ مہر و کرم! صرف سن سکتا ہے تو قلب حزیں کا زیر و بم
حسن کے معبود! تجھ کو روئے زیبا کی قسم! اے خدائے رنگ و بو! حسن دل آرا کی قسم!
جلد اب بیدار ہو تو بستر آرام سے!'' ہو گیا ہوں میں پریشاں گردش ایام سے
غم نہیں مجھ کو بدلتے ہیں اگر یہ صبح و شام اپنے ہی ہاتھوں میں اک دن ہوگا فطرت کا نظام

ناز ہے مجھ کو کہ ہے زندہ مری '' سعی جمیل ''
کامرانی کی ہے اپنے پاس یہ روشن دلیل

عزم سے اپنے کریں گے حاصل عیش جاوداں زیر فرماں خود بخود ہو جائیں گے کون و مکاں
ہم پہنچ جائیں گے اس دنیا کے ہنگاموں سے دور پا سکے گی پھر نہ ہم کو سرحد سود و زیاں
غم نہیں گر برق کی مانند کٹتی ہے عمر رفتہ رفتہ اپنی ہستی ہوگی اک دن جاوداں
خاک کے ذروں کو ہم کر دیں گے مہر و ماہتاب قطرۂ شبنم سے پیدا ہوں گے بحر بیکراں
اپنے ہی دل سے اٹھے گا اک نہ اک دن خود سحاب اک اشارے میں زمیں بن جائے گی یہ آسماں
نیست ہم کر دیں گے اک پل میں جہان ہست و بود گرد ہوگی اپنے آگے شاہ راہ کہکشاں
ہم گذر جائیں گے قید وقت و آن و دہر سے ہوگا اپنے ہاتھ میں نقش و نگار کن فکاں
ہم ہی بن جائیں گے آخر روز و شب کے نقش گر ہم کو چشم مہر و مہ سمجھے گی خلاق جہاں
وقت کیا شئے ہے کہ ان اجرام کے خالق ہیں ہم صانع فطرت ہیں ہم' اور کارساز دو جہاں
ہوگی اپنے ہاتھ میں صبح ازل شام ابد قلب نیداں' کے ہمیں بن جائیں گے پھر از داں
توڑ دیں گے اک دن دہر کی رسم و قیود چٹکیاں لے گا نہ پھر دل میں غم ہندوستاں

آرزو یہ ہے کہ ہو دل میں ترے عزم بلند　　ہے یہی میری طرف سے سال نو کا ارمغاں

ساتھ تو ہو تو بدل دیں ہم نظام کائنات
ہوں ہمارے دست قدرت میں ''وجوب وممکنات''

(۷۳)

(۲۹)

مولانا محمد ادریس ذکاؔ گڑھولوی

محمد ادریس نام، ذکاؔ تخلص، حضرت مولانا محمد بشارت کریم کے خلف رشید، پیدائش گڑھول شریف ضلع سیتامڑھی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر حضرت مولانا ریاض احمد چمپارنی سے تعلیم پائی۔ حضرت مولانا ریاض احمد نے ۲؍سال گڑھول میں قیام کرکے ان کے علمی سفر کو آگے بڑھایا۔ پھر مدرسہ عزیہ بہار شریف ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد مولانا جمیل احمد سے درسیات کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد ۳۰؍سال سے زیادہ عرصہ تک مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں درس و افتاء کی خدمت انجام دی۔ بہت دنوں تک صدر مدرس اور ناظم تعلیمات بھی رہے۔

شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ طویل ترین عربی نعتیہ کلام اور تاریخ گوئی کے اشعار کا ایک بیاض ضائع ہو گیا۔ دوسرا محفوظ ہے۔ یہ ان کے پاکیزہ ذوق کی علامت ہے۔ ان کے کچھ کلام کو ''کلام ذکا'' کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔

آپ کی وفات ۱۳؍جنوری ۱۹۹۳ء کو ہوئی اور گڑھول شریف میں مدفون ہوئے۔

زندگی کے دو رخ

اک دن وہ تھا خوشی کے ہر لب پہ تھے ترانے
ہر سمت بج رہے تھے شادی کے شادیانے

جوہی چمیلی بیلہ چمپا مہک رہی تھی
بلبل بھی شاخ گل پر خوش چہک رہی تھی

بجلی کے قمقمے جو ہر سو چمک رہے تھے
اس روشنی میں ہیرے موتی دمک رہے تھے

گلشن میں غنچہ وگل کھل کھل کے ہنس رہے تھے
ہر گلبدن کے کپڑے پھولوں میں بس رہے تھے

باد صبا سے شاخیں پھولوں کی جھومتی تھیں
اک دوسرے سے ملتیں اور منہ بھی چومتی تھیں

جھڑتے تھے پھول منہ سے سب کے ہنسی خوشی کے
منظر نشاط پرور سامان دلکشی کے

ہر لب پہ مسکراہٹ ہر لب پہ اک تبسم
ہر لب پہ ایک نغمہ ہر لب پہ اک ترنم

پوچھو نہ کارکن کی اے دوست عرق ریزی
گاہے گلاب پاشی اور گاہے عطر بیزی

اس دلفریب منظر اور اس حسیں فضا میں
تاروں کی روشنی میں اور چاند کی ضیا میں

اک آرزو کی دنیا دل میں چھپائے اپنے
سسرال جارہی ہے دلہن پیا سے ملنے

اس نوعروس کو اب کیونکر یتیم کہئے
ماں کی اکیلی بیٹی دریتیم کہئے

جاتی ہے گھر بسانے یہ کائنات گھر کی
ہوگی چراغ خانہ جو نور تھی نظر کی

پیر فلک کو لیکن دیکھا یہ کیسے جاتا
اک گردش اس نے کھائی اور انقلاب آیا

چوتھی کے بعد میکے واپس جو آئی دلہن
تھا اختلاف پیدا تھی دل میں سخت دھڑکن

بیمار جو وہ آئی ہونے لگیں دعائیں
آنے لگے اطباء چلنے لگیں دوائیں

تدبیر ہورہی تھی تقدیر سو چکی تھی
دارو ہو یا دعا ہو تاثیر کھو چکی تھی

اب دوسرا سماں ہے اب دوسری گھڑی ہے
احباب رورہے ہیں اور موت چپ کھڑی ہے

حالت بگڑ چکی ہے بالیں پہ ماں کھڑی ہے
احباب رور ہے ہیں اور موت چپ کھڑی ہے

بیٹی نے ماں کو دیکھا حسرت بھری نظر سے
اک آہ دل سے نکلی اک ہوک اٹھی جگر سے

کچھ بولنا جو چاہا، بولی نہ منہ سے نکلی
اشکوں نے ترجمانی کی دل کی بے کلی کی

پھر ایک ہچکی آئی پیغام موت لائی
اب تن سے روح کی تھی یہ دائمی جدائی

بدبخت ماں وہیں پر بے ہوش سی کھڑی ہے
سکتے کی کیفیت ہے خاموش سی کھڑی ہے

آہ وبکا سے گھر میں کہرام مچ رہا ہے
روتا ہوا ہی دوڑا جس نے جہاں سنا ہے

مجمع یہ پھر وہی ہے دیوار و در وہی ہے
تھا چار دن جو پہلے اب بھی یہ گھر وہی ہے

لیکن نہ وہ سماں ہے گھر میں نہ وہ خوشی
بدلا ہوا ہے منظر صورت بدل چکی ہے

چہروں پہ مردنی ہے حسرت برس رہی ہے
رنج والم کی دنیا اب گھر میں بس رہی ہے

آہ وبکا سے ہر سو اک شور سا بپا ہے
کوئی سسک رہا ہے اور کوئی رورہا ہے

میت پہ ماں کھڑی ہے کہتی ہے بیخودی میں
بھولی تھی میں کفن ہی سامان رخصتی میں

المختصر سراسر عبرت کی یہ جگہ ہے
کل تھا جو گھر خوشی کا وہ آج غمکدہ ہے

دنیا ہے چاردن کی اور لطف زندگی بھی
منزل جو دائمی ہے منزل ہے آخرت کی

دوشہر

گاؤں کی ساکت فضا سے جی مرا گھبرا گیا
چل پڑا سیدھا مظفرپور کا رستہ لیا

چند منٹوں میں ہوئی غائب سکوں پرور فضا
شہر اور ہنگامہ ہستی کا منظر آگیا

اتفاقاً جا پڑا میں حسن کے بازار میں
خوشنما کلیوں میں اور پھولوں میں لالہ زار میں

آہ! وہ بازار بکتی ہیں جہاں پر عصمتیں
چندسکوں پر نچھاور ہورہی ہیں عفتیں

عشوہ و ناز و ادائیں حسن کی رنگینیاں
خود نمائی دلفریبی دلکشی رعنائیاں

سوز آتے ہیں جہاں نغمات بن کر ساز میں
قہقہوں میں کرب پنہاں ہے حسیں انداز میں

قمقموں کی روشنی میں ظلمتیں چھائی ہوئی
قہقہوں میں دل کے اندر چوٹ سی کھائی ہوئی

پھر وہاں سے چل پڑا میں یہ تماشہ دیکھ کر
یہ حسیں دلکش نظارہ روح فرسا دیکھ کر

چلتے چلتے آگیا میں ایک دینی درس گاہ
جس فضا میں آتی ہے پیہم صدائے لاالہ

اف وہاں بھی کالعدم وہ گوہر نایاب تھا
ہاں پئے تقریر تو تقدیس کا ہر باب تھا؟

بس غنیمت ہے کہ تھا نام خدا وردِ زباں
اور صورت سے مسلمانوں کی صورت تھی عیاں

پھر وہاں سے میں چلا پہونچا سریا گنج میں
مخزن لعل وجواہر میں سراپا گنج میں

زندگی بنتی ہے بن بن کر نکھرتی ہے یہاں
لینے والوں کے لئے دولت بکھرتی ہے یہاں

بس رہے ہیں لیلی دولت کے سودائی یہاں
بج رہی ہے صرف دولت ہی کی شہنائی یہاں

ہے یہا ہنگامہ ہستی شباب اوج پر
خودفریبی نے سکوں پایا حباب موج پر

پھر وہاں سے میں کچہری آ گیا بارہ بجے
چشم عبرت اور دل شاعر بھی میرے ساتھ تھے

یہ کچہری کا صحن یا حشر کا میدان ہے
نفسی نفسی ہی کے عالم میں ہر اک انسان ہے

ٹولیاں ہیں جمگھٹے ہیں مختلف طبقات کے
تجزیئے مشکل سے ہوں گے ان کے احساسات کے

کچھ تھے اپنی الجھنوں میں بے طرح الجھے ہوئے
جن کو مستقبل نظر آئے نہیں سلجھے ہوئے

یہ ستم دیدہ فسردہ دل شکستہ غم نصیب
داد خواہ ومفلس ومظلوم بے چارے غریب

ایک ٹولی کرسیوں پر جلوہ گر آئی نظر
زندگی ہوتی ہے جن کی رشوتوں ہی پر بسر

بے سہاروں کے سہارے پر ہے جن کی زندگی
مفت کی دولت سے جن کے رخ پہ ہے تابندگی

اک جماعت تھی وہیں قانون داں کی جلوہ گر
حق کو ناحق کر دکھاتے ہیں جو فن کے زور پر

ہاں بساط زیست پر فرزیں کے مہرے ہیں یہی
دشمنوں کی چال سے رکھتے ہیں پوری آگہی

اک جماعت حاکمانہ شان میں سرشار تھی
سرفراز و سرور و مست مئے پندار تھی

ہر ادا میں کبر و نخوت کا نیا انداز تھا
کج کلاہی انکے سر پر طرہ ممتاز تھا

میں وہاں سے بھی چلا اور چل کے کالج آگیا
علم کی دنیا میں گویا خود کو میں نے کھو دیا

ہر طرف تھے علم و حکمت کے نرالے نظریئے
فلسفہ تاریخ اور سائنس ہی کے مسئلے

پڑھنے والے نوجوانوں میں بلا کا جوش ہے
گویا بزم مئے ہے اور ہر ایک بادہ نوش ہے

اپنے مستقبل درخشاں ان کو آتے ہیں نظر
اک سنہری خواب میں رہتے ہیں گویا سربسر

ان کی اب ساری امنگیں ایک حد پر رک گئیں
گردنیں قسمت کے آگے تھک کے آخر جھک گئیں

پھر چلا چل کر رکا میں آ کے بس اسٹینڈ پر
میری لاری میں بہت سے ہو گئے تھے ہمسفر

الغرض لاری کھلی کھل کر چلی چلتی رہی
چلتے چلتے دو ہی میلوں پر مگر آکر رکی!!!

رک گئی تو رک گئی انجن ہوا ایسا خراب
اک قدم بھی آگے بڑھنے سے دیا گویا جواب

میں ہوا کھانے کو نکلا سامنے میدان میں
غور سے دیکھا تو تھا میں ایک گورستان میں

میں نے دیکھا تھا ابھی تو ایک شہر آرزو
ہائے یہ شہر خموشاں اور اس کی گفتگو

اس طرف لطف ومسرت ولولے ہیں جوش ہے
اس طرف ہے یاس وحسرت اورلب خاموش ہے

اس طرف باد بہاری گلشن ہستی میں ہے
اس طرف جورخزاں مجبور کی بستی میں ہے

اس طرف رفتار ہے گفتارہے کردار ہے
اس طرف اپنے عمل سے روح خود بیزارہے

اس طرف نازوادائیں حسن کی رعنائیاں
اس طرف ہرہر ادا پر سوطرح بیزاریاں

اس طرف ہیں آرزوہیں مال ودولت کی ہزار
اس طرف توبے کسی میں ہے کفن بھی تار تار

اس طرف رشوت ستانی اور کذب وافتراء
اس طرف درپیش ہے دارالجزایوم الجزاء

اس طرف ہیں نوجوانوں میں امنگیں بھی نئی
اس طرف تومل چکی ہے خاک میں شان کئی

اس طرف تقویٰ رہینِ جبّہ ودستارہے
اس طرف ظلمت میں دل کی روشنی درکارہے

الغرض یہ شہر پوراجنت نظارہ ہے
چشم عبرت کے لئے اک دعوت نظارہ ہے

تاثرات ذکاؔ

کیسے لگے یہ دل مرا ایسے دیار میں
بوئے وفا ملے نہ جہاں کوئے یار میں
فتنے سکوں پذیر جہاں ہوں نفس نفس
آسودہ ہو حیات جہاں انتشار میں
باد نسیم بھی یہاں باد سموم ہے
ہے لطف زندگی ہی یہاں خلفشار میں
پر کیف اک کشش بھی ہے ارض شریف میں
خوابیدہ ایک قطب زماں ہے مزار میں
تابندہ جس کی خاک کے ذرے ہیں آج بھی
رخشندہ اک ستارہ وہ تھا اس بہار میں
صد حیف پھر بھی دل نہیں لگتا ہے اب یہاں
چرکے لگے ہیں اتنے دل بے قرار میں
''کہہ دو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں''
وہ شیخ وقت قطب زماں باہزار صبر
رنجیدہ و ملول رہے اس دیار میں
ترک وطن کی بات ہی آئینہ دار ہے
کتنا ملال تھا دل والا تبار میں
خود سید الرسُل نے تسلی دی آپ کو
پایا جو حزن وغم دل صد لالہ زار میں
بایں ہمہ نباہ یوں کرتا ہے دمبدم
ابرم کہ تلخ گیرم وشیریں برے دہم
افسانہ الم میں ذکاؔ یہ تاثرات
یہ بھی شمار ہوں گے تری یادگار میں

جلسہ دستار بندی کے موقع پر تاثرات

دعاؤں میں اپنی اثر دیکھتے ہیں　　کہ میراوہ زخم جگر دیکھتے ہیں
خوشا آج وہ بھی ادھر دیکھتے ہیں　　نگاہ کرم ہم ادھر دیکھتے ہیں
مرے محترم میرا گھر دیکھتے ہیں　　شکستہ یہ دیوار و در دیکھتے ہیں
ستہتر برس کی ہے بنیاد اس کی　　اسی وقت سے یہ شجر دیکھتے ہیں
ہزاروں نے پائی فراغت یہاں سے　　شجر یہ بڑا باشمرو دیکھتے ہیں
مری خستہ حالی تو ظاہر ہے لیکن　　صدف ہی میں اکثر گہر دیکھتے ہیں
اگرچہ ہیں سو اس میں نادار لڑکے　　مگر ہوسٹل مختصر دیکھتے ہیں
مدرس کی تعداد اس وقت دس ہے　　مدرسے کو جو اپنا گھر دیکھتے ہیں

کچھ اہل کرم کی نگاہ کرم ہو
ذکاؔ ہم یہ شام و سحر دیکھتے ہیں

فضا بھی مست محفل بھی مست ساغر بھی　　کسی نے آج کیا خم کے خم پلائے ہیں
چمن میں نرگس حیراں بھی محو حیرت ہے　　کہ کس نے آج یہاں ایسے کھلائے ہیں
یہ فرش خاک وہ جان بہار وجان بہار　　زمیں پہ چاند ستارے اتر کے آئے ہیں
خوشی میں ہم تو کئی دن سے گن رہے تھے دن　　شا نصیب خدا نے یہ دن دکھائے ہیں
کلی جو تھی مرے دل کی وہ کھل کے پھول بنی　　یہ کیسے جان بہاراں نے گل کھلائے ہیں
خوشی میں گیت مسرت کے گائے ہیں احباب　　ہمارے دیش کے مکھ منتری جو آئے ہیں
نہ کیو ہوں وجہ مسرت وزیر تعلیمات　　کہ علم و فضل کے موتی الٹانے آئے ہیں
حقیر میری زباں اور ہستیاں اعلیٰ　　سپاس نامہ کہاں آرزو ہی لائے ہیں
یہ مدرسہ جو ہے محتاج خاص نظر کرم　　اسی کی سمت اشارے ہیں اور کنائے ہیں
نہیں ہے اس میں کتب خانہ کوئی اچھا سا　　نہ ہوسٹل ہے کہ لڑکے رہیں جو آئے ہیں
ہم اپنی عرض تمنا تو کر چکے ہیں ذکاؔ　　بس ایک بات یہ آخر میں کہنے آئے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھے ہیں (۷۴)

(۳۰)
مولانا وحید احمد قیصؔر ندوی

وحید احمد نام، قیصؔر تخلص۔ ان کے والد کا نام سید رشید احمد تھا۔ پیدائش ۱۴؍ جنوری ۱۹۱۷ء کو ایک قدیم قصبہ آبگلہ ضلع گیا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گیا، بہار شریف اور پٹنہ میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ۱۶؍ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ڈھاکہ میڈیکل کالج میں رحلت کر گئے۔

قیصر ندوی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں پختگی تھی۔ اور ان کے کلام سے کہنہ مشق شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

قیصؔر ندوی کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

بھولنے والے کو شاید مری یاد آئی ہے — رات کس درجہ طبیعت مری گھبرائی ہے
تھر تھراتی ہوئی امید کی ہلکی سی کرن — پھر تری بزم سے بے نیل مرام آئی ہے
گل تو گل ہیں کوئی پتہ بھی نہ کھڑکا یارو — یوں دے بے پاؤں گلستاں میں بہار آئی ہے
اب مرا نام بھی آتا ہے ترے نام کے ساتھ — نہیں معلوم یہ شہرت ہے کہ رسوائی ہے
آپ گاہک ہوں تو پھر میری وفا کی قیمت — صرف جذبات محبت کی پذیرائی ہے
آئینہ لے کے ذرا دیکھو تو صورت اپنی — کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ چوٹ کہیں کھائی ہے
وہ کہاں آئے تھے گل گشت چمن کو قیصؔر — باتوں باتوں میں صبا ان کو لگا لائی ہے

دل کا غمخوار کہاں دیدہ پر غم کے سوا — کون آتا ہے ادھر قافلہ غم کے سوا
تیر و نشتر بھی یہاں دشنہ و خنجر بھی یہاں — زخم دل کے لئے ہر چیز ہے مرہم کے سوا
زندگانی کے حقائق سے نہ بھاگ اے ناداں! — ہاتھ آئے گا نہ کچھ سلسلہ غم کے سوا
ان کے وعدے پہ جئے جاگ کے کاٹیں تاراتیں — کچھ بھی حاصل نہ ہوا گریہ پیہم کے سوا
کوئی شئے بار گہ حسن میں مقبول نہیں — تپش دل کے سوا، دیدہ پر غم کے سوا
شکوہ دہر کا وہی لوگ کیا کرتے ہیں — جن کو آتا نہیں کچھ گریہ پیہم کے سوا

جس نے تاریخ ہی دنیا کی بدل دی قیصؔر
کون ہو سکتا ہے اس رحمت عالم کے سوا (۷۵)

(۳۱)
مولانا محمد عبدالمقیت شمسؔ نیموی

محمد عبدالمقیت نام، شمسؔ تخلص، تاریخی نام ''حفیظ الرحمن'' خلف مولانا محمد عبدالشکور جوش نیموی مولد مقام نیمی ضلع پٹنہ، ابتدائی تعلیم اپنے والد اور اپنے دادا مولانا حکیم نذیر احسن سے حاصل کی۔ دادا کے انتقال کے بعد مزید تحصیل علم کے لئے ۱۹۲۶ء میں قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ چلے آئے۔ اور مولانا محمد یوسف پنجابی صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ بہار شریف سے علوم وفنون کی تحصیل کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۹۲۹ء میں تکمیل علم کے لئے دہلی چلے آئے۔ اور مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علمائے ہند وصدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی سے علم حدیث کی تعلیم سے فراغت پا کر ۱۹۳۱ء میں اپنے وطن واپس آ گئے۔ جناب شمس نیموی کو علوم وفنون کی نشر واشاعت اور نسخ ونستعلیق حروف کی فنی وطباعتی اصلاح وترقی سے خاص فطری ذوق تھا۔ اسی غرض سے فراغت کے بعد اپنے وطن میں آ کر پٹنہ میں ''جدید پریس'' کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ جس میں لیتھو اور عربی نسخ ٹائپ کی طباعت کا انتظام تھا۔ موصوف نے پریس کے لئے نسخ ٹائپ خاص طور سے مصر سے منگوایا تھا۔ پھر نسخ ٹائپ خود تیار کرنا شروع کیا۔

شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے کلام کا ایک ذخیرہ گذشتہ عظیم فرقہ وارانہ فسادات میں ضائع ہو گیا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

حسن وجمال بولے ہم دل کو ڈھونڈھتے ہیں ۔۔۔ اہل سفر ہیں جتنے، منزل کو ڈھونڈھتے ہیں
انجام کو سمجھ کر ہر کام کیجئے گا ۔۔۔ عاقل، فہیم، دانا، حاصل کو ڈھونڈھتے ہیں
زخم جگر یہ بولا، اس کا پتہ میں دوں گا ۔۔۔ مقتول حشر میں کیوں قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں
اچھوں کو چاہتے ہیں اچھے ہیں جتنے انساں ۔۔۔ عاقل ہیں جتنے وہ سب عاقل کو ڈھونڈھتے ہیں
دل کو نہیں دکھاؤ سب سے برا ہے ظالم ۔۔۔ مظلوم آہ کر کے عادل کو ڈھونڈھتے ہیں
اف شوخیاں کسی کی، دل پرزے پرزے کر کے ۔۔۔ انجام بن کے بولے، بسمل کو ڈھونڈھتے ہیں
جو اہل فن ہیں کچھ آسان چاہتے ہیں ۔۔۔ اہل کمال لیکن مشکل کو ڈھونڈھتے ہیں
اے شمسؔ! عمر بولی عالم ہے بحر فانی ۔۔۔ تیراک تھک کے اس میں ساحل کو ڈھونڈھتے ہیں

(۳۲)

مولانا سید محمد قمر الدین کیفؔ سہسرامی

سید محمد قمر الدین نام، کیفؔ تخلص، قصبہ سہسرام ضلع آرہ موجودہ ضلع رہتاس میں ۹/ مارچ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام سید واجد حسین ہے۔کیفؔ نے مدرسہ کبیریہ سہسرام میں تعلیم پائی۔اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل پاس کیا۔سید شاہ غلام مخدوم مستؔ کی صحبت میں عرصہ تک رہنے کی وجہ سے سخن گوئی کا شوق پیدا ہوا۔اور انہیں سے کلام پر اصلاح لینے لگے، جب شعر گوئی کی ظاہری خامیاں دور ہوگئیں تو جناب مستؔ سہسرامی کے مشورہ سے حضرت نوحؔ ناروی اور حضرت سیمابؔ اکبر آبادی سے غزلوں اور نظموں پر اصلاح لینے لگے۔اور جب کلام میں پختگی آگئی تو اصلاح لینا بند کر دیا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

یہ خطرہ بھی نہ ٹھہرا خطرۂ باطل تو کیا ہوگا　　کہ ٹھکرا دی کسی نے کائنات دل تو کیا ہوگا
بنا لوں میں تمہیں کو رونق محفل تو کیا ہوگا　　مگر یہ بھی ہوئی اک سعی لا حاصل تو کیا ہوگا
نقوش ابھرے ہوئے ہیں اس قدر تخریب ماضی کے　　انہی پر پڑ گئی بنیاد مستقبل تو کیا ہوگا
خدا غارت کرے عہد جوانی کا یہ اندیشہ　　کہ تم سے بھی نہ ہوگی حل مری مشکل تو کیا ہوگا
نشان راہ پا کر اس قدر مسرور ہوں لیکن　　ہجوم شوق میں گم ہوگئی منزل تو کیا ہوگا

جب ساز محبت کے نغمے نظروں میں رقصاں ہوتے ہیں　　تاروں میں جگ مگ کرتے ہیں پھولوں میں خنداں ہوتے ہیں
آئینہ تو پھر آئینہ ہے سائے پر پیار آ جاتا ہے　　ہر چیز حسین بن جاتی ہے بیدار جب ارماں ہوتے ہیں
عشرت کے رنگیں جلووں سے جب آنکھیں روشن ہوتی ہیں　　سورج بھی درخشاں ہوتا ہے ذرے بھی درخشاں ہوتے ہیں

آنکھ میں اشک، لب پہ آہ نہیں　　خون دل کا کوئی گواہ نہیں
ہر نظر دل کو چھو نہیں سکتی　　ہر نظر آپ کی نگاہ نہیں

جتنی تقریب محبت کامراں ہوتی گئی　　زندگی بے چینیوں کی رازداں ہوتی گئی

ناز سے درس وفا لیتا رہا میرا نیاز آرزو بیگانہ سود وزیاں ہوتی گئی

رہین سازنہیں سوز دل کے افسانے رہین رازغم زندگی ہیں دیوانے
رہ حیات میں جب آگیا مقام وفا مرے قریب نہ اپنے رہے نہ بیگانے
الجھ کے تیرے تصور سے رہ گیا ہے شعور میں جب مسائل ہستی چلا ہوں سلجھانے

(۷۷)

(۳۴)
مولانا شاہ فرید الحق فرید عظیم آبادی

شاہ فرید الحق نام،فرید تخلص۔والد ماجد کا نام شاہ صبیح الحق عمادی۔یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ مطابق ۲؍نومبر ۱۹۲۹ء کو خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پھر اپنے خالو مولانا سید شاہ ابوسلیمان محمد عبدالمنان گیاوی سے حاصل کی۔متوسطات تک کی تعلیم مولانا ظفرالدین رضوی بہاری سے حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں بریلی گئے اور مدرسہ منظر اسلام سوداگران میں داخل ہوئے اور یہاں سے ۱۹۵۴ء میں فراغت حاصل کی۔۲۱؍جنوری ۱۹۵۸ء کو محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول پٹنہ سیٹی میں بحیثیت ہیڈ مولوی آپ کا تقرر عمل میں آیا۔والد کے انتقال کے بعد ۱۹۷۵ء میں خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشیں بنائے گئے۔رشد و ہدایت کے کام میں منسلک ہونے کی وجہ سے قبل از وقت اسکول سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

بچپن ہی سے آپ کو شاعری کا شوق تھا،سترہ سال کی عمر میں ایک غزل کہی اور ڈاکٹر مبارک حسین مبارک تلمیذ داغ دہلوی سے اصلاح لی۔تقریباً بیس ۲۰؍غزلوں پر ان سے اصلاحیں لیں۔پھر حضرت حمید عظیم آبادی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔جملہ اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔آپ کی غزلیں،نظمیں،مثنویات،رباعیات اور قطعات محفوظ ہیں۔

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

رہے سلامت یہ مستی غم زباں پہ میری گلا نہیں ہے
تڑپ تڑپ کر گذاریں راتیں کسی کو لیکن پتا نہیں ہے

شفق کی سرخی بتارہی ہے فسانہ درد دل کا عنواں
مگر وہ کیا سمجھے رنگ حرماں یہاں جوناز آشنانہیں ہے
چمک رہاہے وہ داغ اب تک جو دل پہ روزازل پڑا تھا
خدا کا مجھ پر ہے لطف واحساں کہ نقش الفت مٹانہیں ہے
غرض کے بندے ہیں اہل دنیا فریدؔ ان سے بچے رہو تم
سمجھ لو کاغذ کا پھول ان کو کسی میں بوئے وفا نہیں ہے

پردہ پوشی معاصی رازداں بنتی گئی شان رحمت دستگیر بیکساں بنتی گئی
اس طرف مٹتا گیا محمل نشینی کا خیال اس طرف ہمت بھی گردکارواں بنتی گئی
سوزغم کی برق پاشی نے کیا بے خانماں شاخ جو جلتی گئی وہ آشیاں بنتی گئی
جس قدر بڑھتا گیا دردمحبت اے فریدؔ میرے دل کی ہر خلش نوک سناں بنتی گئی

کون کہتا ہے کہ شمشیر سے میں ڈرتاہوں ہاں مگر گردش تقدیر سے میں ڈرتاہوں
ہونہ درپردہ نمک پاش جراحت یہ بھی مسکراتی ہوئی تصویر سے میں ڈرتاہوں
طبع نازک پہ نہ ہوجائے کہیں بار فریدؔ لفظ ارمان کی تفسیر سے میں ڈرتاہوں

پہنچے لیلیٰ کی نظر جس پہ وہ دیوانہ بنے بیٹھے جس دشت میں مجنوں وہی ویرانہ بنے
بت پرستی ہی وہ کیا جس میں یہ اعجاز نہ ہو جس جگہ سجدہ کروں ایک صنم خانہ بنے
جب نہ تھی رسم وفاایک کشش تھی باہم کرکے ہم رسم وفا آپ سے بیگانہ بنے
دامن جرم میں اشکوں کو چھپاتا ہوں فریدؔ تاکہ بخشش کے لئے ان کے بہانا نہ بنے

قطعہ

برباد غم پہ ان کو نہ آیا ترس کبھی وہ اپنی زلف نازسنوارے چلے گئے
لیکن وفا شناس طبیعت کی مرحبا جوش جنوں میں ان کو پکارے چلے گئے

(۷۸)

(۳۴)

مولانا محمد ارتضاء الدین حاذقؔ سہسرامی

محمد ارتضاء الدین نام، حاذقؔ تخلص، ابن مولانا ضیاء الدین محلہ نورن گنج قصبہ سہسرام ضلع آرہ میں ۲۱؍ جمادی الآخر ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۴؍ نومبر ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ ''مظفر حسین'' اور محمد ''اظہار الحسن'' دونوں تاریخی نام ہیں، جناب حاذق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اپنے والد اور بھائی سے تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام سے عالم کا امتحان پاس کیا۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد نندلال ہائی اسکول چرکنڈہ ضلع دھنباد (بہار) میں ہڈ مولوی کی حیثیت سے تقرری ہوگئی۔ ۱۹۵۹ء میں اسکول مستعفی ہو گئے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہو گئے۔ اور اس جماعت کی مختلف درسگاہوں میں معلم یا صدر مدرس رہے۔ شعروشاعری کا شوق مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام کے عہد طالب علمی سے شروع ہوا۔ مولوی غلام مخدوم مستؔ سہسرامی سے اصلاح سخن لی۔ ان کی وفات کے بعد چند غزلوں پر جناب قمرؔ گیاوی سہسرامی سے اصلاح لی۔

۲۰۱۲ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

شگفتہ بولیوں میں جو بھی چاہو بولتے جاؤ　　مگر ہر بول کو کہنے سے پہلے تولتے جاؤ
زباں ایسی شگفتہ ہو کہ سننے میں مزہ آئے　　ادائے حسن معنی کے بھی کچھ رس گھولتے جاؤ
خیالوں میں ہو رفعت اور مضمونوں میں ندرت ہو　　حقیقت پر نظر ہو فن کے موتی رولتے جاؤ
نظر میں اپنی منزل کے سوا اک یہ بھی منزل ہو　　جو راہیں ہو گئیں مسدود ان کو کھولتے جاؤ

نہ اپنی شام ہی ہے اور نہ یاں اپنی سحر ہے　　یہاں جینا مرا دشوار تر ہے
چمن کی ہر روش نامعتبر ہے　　بہار زندگانی مختصر ہے
بندھا رخت سفران کا تو بولے　　پہنچنا چاند تک آسان تر ہے
تم ہی اک عاقل ودانا نہیں ہو　　جہاں دیدہ ہماری بھی نظر ہے
جو طالب تھے سکوں کے کہہ رہے ہیں　　زمیں پر اب سکوں دشوار تر ہے

کلی کا پھول بننا،سو کھ جانا بہارِ چند روزہ کی خبر ہے
مرا یہ گوہرِ اشکِ محبت کسی سے دل لگانے کا ثمر ہے
اسی سے چشم پوشی کے ہیں طالب جو کرتا ہر خطا سے درگزر ہے
بہت کچھ کھوکے ہم اتنا ہی سمجھے زمانہ کی روش نامعتبر ہے
زباں سے بات نکلی دل میں اتری یہ حاذق!شعر گوئی کا ہنر ہے

نشاط افزا شرابِ زندگی کا جام لینا ہے ہمیں ساقی کی آنکھوں سے یہی پیغام لینا ہے
دیا ہے درس جس نے ایک عالم کو محبت کا بہرصورت ہمیں دامن اسی کا تھام لینا ہے
نشاط بزم کی جو ہر خرابی کو مٹا ڈالے جہاں کو امن کی خاطر اسی سے کام لینا ہے
محبت کے پیامی کا یہ معیار محبت ہے خدا کے نام کے ہی ساتھ اس کا نام لینا ہے
جسے خود معرفت اپنی نہیں حاصل ہے اے حاذقؔ محبت میں اسے دامن کسی کا تھام لینا ہے

(۷۹)

(۳۵)
مولانا فضل القدیر اخترؔ رانی ساگری

فضل القدیر نام،اخترؔ تخلص ،۱۹۲۸ء میں قصبہ رانی ساگر ضلع شاہ آباد(آرہ) میں پیدا ہوئے۔یہ قصبہ بہیا اسٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔والد کا نام مولانا حاجی صوفی خلیل احمد قادری مجیبی تھا۔ابتدائی تعلیم وتربیت والد کی نگرانی میں اپنے قصبہ میں ہوئی۔متوسطات عربی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور مدرسہ اسلامیہ بہار شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی۔فقہ کی آخری کتابیں اور سنن کی تدریس مولانا امجد علی مصنف بہار شریعت کی نگرانی میں ہوئی۔مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں درس نظامی کی تکمیل کی۔اور وہیں سے الہٰ آباد یونیورسٹی کے امتحانات مولوی،عالم اور فاضل،نیز منشی،کامل اور میٹرک میں کامیابی کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے ادب وتفسیر کے درسیات کی تکمیل کی۔اور فراغت حاصل کی۔طب کی تعلیم بھی لکھنو میں حکیم دہاج الحق سے حاصل کی۔فکر سخن پاکیزہ رکھتے تھے۔فارسی شاعری میں مولانا حکیم سید محمد شعیب نیرؔ رضوی

پھلواروی کے شاگرد تھے۔ اردو شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو

سرفرو شانہ پئے دید صنم آتے ہیں — تیرے مشتاق کسی دام میں کم آتے ہیں
شہر خوباں کی لطافت سے درزنداں تک — مرحلے عشق کے سب زیر قدم آتے ہیں

جراحت غم دوراں سے دل فگار بھی ہے — بہ فیض گیسوئے مشکیں، خزاں بہار بھی ہے
سرور مئے ہی نہیں باعث کشش زاہد — ہمارے جام میں عکس رخ نگار بھی ہے
ابھی تو پہنچے ہیں ہم اپنے ہی گریباں تک — بہت قریب جنوں سے قبائے نگار بھی ہے

آپ آئین ستم کو بھی وفا کہئے مگر — رسم الفت سے نہیں ایسے بھی اب بیگانہ ہم
کوئی صہبا کو کہے، یا کوئی ساغر کو کہے — چشم ساقی کو کہیں گے روح صد میخانہ ہم

چمن میں، میں نہیں، لیکن شکستہ پر تو ہیں میرے — مٹا سکتی نہیں دنیا کبھی نام ونشاں میرا
وہیں پر میکشوں نے ڈال دی بنیاد میخانہ — گرا ہے چھوٹ کر ہاتھوں سے پیمانہ جہاں میرا
غزل خواں ہو گئے تم بھی سر محفل تعالی اللہ — یقین آیا تمہیں؟ کیا چیز ہے سحر بیاں میرا

جو قدم سوئے دار رکھتے ہیں — ہوش اور اعتبار رکھتے ہیں
آپ کہتے ہیں ان کو دیوانہ — حسن کا وہ وقار رکھتے ہیں

(۸۰)

(۳۶)
مولانا مصطفی رضا شبنم کمالی

مصطفی رضا نام شبنم تخلص، ۲۲؍جولائی ۱۹۳۸ ء میں پوکھریرا ضلع سیتامڑھی میں پیدا ہوئے۔ یہی ان کا وطن بھی ہے۔ تعلیم فاضل حدیث وفاضل فارسی تک ہوئی۔ ۱۹۵۱ء سے شعر کہتے تھے۔ شاعری میں ان کا کوئی استاذ نہیں۔ شبنم کمالی اپنے نعتیہ کلام کی وجہ سے کافی معروف ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

''صنف نعت کے علاوہ شبنم غزل کے اچھے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ان کے دو مجموعہ ''نوائے دل'' اور ''تنویر خیال'' کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو کی کلاسیکی روایات پر ان کی گہری نظر ہے۔لیکن وہ آج کے حالات سے باخبر نہیں۔نتیجہ میں ان کے یہاں کلاسیکی رچاؤ بھی ملتا ہے۔اور کچھ نئے تیور کا طور بھی۔لیکن ان کی نعتیہ شاعری نے ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری کو پس پشت ڈال دیا ہے۔نتیجہ میں بحیثیت غزل گو یا نظم نگار ان پر نظر کم پڑتی ہے۔حالانکہ ان کا کلام ہر لحاظ سے درست اور ان کے ذاتی تجربہ کی عقبی زمین میں ہر طرح سے قابل لحاظ بن گئی ہے۔'' (۸۱)

کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

میں آشنائے منزل مجھے کیا فریب دے گی
وہ چھپی نہ چھپ سکے گی کبھی بھیس کو بدل کے

تری غفلت پسندی کی نہ ہو جب انتہا کوئی
شریک موج دریا گر یہ شبنم نہ ہو جائے

کتاب زیست کے اڑتے ہیں ہر طرف اوراق
بناتے جاتے ہیں دنیا میں اک نئی روداد

فاقہ کے ستائے ہوئی ماں باپ کو دیکھ
بیٹی کو بہ انداز دلہن بیچ رہے ہیں

یہ انقلاب زمانہ کہ صحن گلشن سے
جو اہل خانہ تھے بن کر وہ میہماں گزرے

شبنم کمالی کی وفات ۹/اگست ۲۰۰۴ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ (۸۲)

(۳۷)

مولانا محمد ابو القاسم قاسمی مونگیری

محمد ابو القاسم نام، ادبی حلقوں میں رفعت القاسمی کے نام سے مشہور ہیں، تخلص کبھی قاسمی اور کبھی رفعت دونوں لکھتے ہیں۔والد کا نام مولانا حبیب الرحمن ہے۔۱۹۳۴ء میں شیخپورہ ضلع مونگیر میں پیدا ہوئے۔اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔گلستاں، بوستاں، منطق الطیر، اور

سکندر نامہ نظامی وغیرہ مولانا عبدالغنی رحمانیؒ مئولف تذکرہ رسول سے پڑھیں۔تاریخ اسلامی میں ایم۔اے تھے۔ادب عربی میں الشہادۃ العالیہ کی سند امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ بینک کے امور کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ملازمت کا آغاز الہ آباد بینک کلکتہ سے کیا۔ پاکستان میں چھ سال بینک آف بھاولپور میں مینیجر اور پھر چیف اکاونٹس آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہر کر کراچی چلے آئے۔ یہاں انہوں نے نیشنل کمرشیل بینک قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔اوراس کے چیف اکاوئٹس آفیسر مقرر ہوئے۔ پھر سٹی بینک میں انسپکٹر آف برانچ کے عہدے پر فائز ہوئے۔اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر ایک بینک پرائمری بینک لمیٹیڈ کے نام سے ۱۹۶۳ء میں قائم کیا اور اسکے ڈائریکٹر اور مشیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔اس بینک کے بانی کی حیثیت سے اس کے مرکزی دفتر کا افتتاح پاکستان کے سابق وزیر خارجہ مسٹر ذالفقار علی بھٹو سے کرایا۔افتتاح کے موقع پر خطبہ استقبالیہ اردو زبان میں پیش کیا۔اور وزیر خارجہ سے درخواست کی کہ اس کا جواب بھی قومی زبان میں دیا جائے۔ چنانچہ وزیر موصوف نے جوابی تقریر اردو میں کی۔ یہ دنیا کی بینکاری کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا موقع ہے جسے پورے ملک میں سراہا گیا۔اخباروں نے اس پر شذرات لکھے۔خلاصہ یہ کہ آپ ایک ممتاز بینک کار کی حیثیت سے خوب نام کمایا۔

شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔اور عمدہ شاعری کرتے تھے۔اپنی شاعری کی وجہ سے بینک کے حلقہ میں خوب شہرت رکھتے تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

آنکھوں میں ہم کھٹکتے ہیں کیوں خار کی طرح ایسے تو بوا لہوس نہیں اغیار کی طرح
سن اے نگار شہر غزالاں کہ ہم نے بھی دیکھا ہے تجھکو دولت بیدار کی طرح
اللہ رے وہ ذوق اسیری کی لذّتیں تڑپے ہیں ہم بھی مرغ گرفتار کی طرح
ایک ایک قطرہ کر کے نچوڑا ہے خون دل ڈالی ہے ہم نے دیدہ خونبار کی طرح
ہم تجھ کو یاد کرک پریشاں سے ہو گئے اے دوست تیرے گیسوئے خمدار کی طرح
محسوس یہ ہوا کہ قیامت گذر گئی وہ بھی تمہاری شوخی رفتار کی طرح
ملتا نہیں ہے گردش دوراں کا اب مزاج منہ تک رہے ہیں ہم درودیوار کی طرح

اس زندگی نے ہم سے بالآخر وفا نہ کی — تا زیست لو لگائے رہے بے وفا سے ہم
اک نغمہ الست رہا منتہائے شوق — محو جمال حسن رہے ابتدا سے ہم
کیا جانے کھو گئی ہے کہاں منزل حیات — یاروں! ابھی ابھی تو رُکے تھے ذرا سے ہم
اے شورشِ حیات زمانہ! ذرا ٹھہر — گھبرا گئے ہیں سایہ زلف رسا سے ہم
کیوں آدمی جہاں میں رسوا ہے آج کل — جی چاہتا ہے پوچھیں یہ اپنے خدا سے ہم
تھے محو خواب گردش دوراں سے بے نیاز — چونکے مگر زمانے کی آواز پا سے ہم
کس سے اٹھ سکتا تھا یہ بار گراں بندہ نواز! — ہم اٹھائے پھرتے ہیں ابتک تری دنیا کو ہم
زندگی کو عمر بھر مرمر کے رکھتے ہیں عزیز — زیست سے بیزار ہوتے ہیں تو مرجاتے ہیں ہم

تری تلاش میں اک عمر خاک چھانی ہے — گئے وہاں بھی جہاں تیرا نقش پا نہ ملا
حیات آئی تھی کچھ راز زیست سمجھا نے — اجل کو ہوش میں آنے کا اک بہانہ ملا
کہاں تلک دل کمبخت کی خطا دیکھوں — ملا بھی دل تو مرے اختیار کا نہ ملا

یہ دنیا بھی تو شاید موجہ بحر حوادث ہے — یہاں طوفان ملتے ہیں مگر ساحل نہیں ملتا
خدا جانے کہاں ذوق جنوں لے جائے ہے مجھکو — کہیں کوسوں سراغ جادہ منزل نہیں ملتا
شب تنہائی میں رفعتؔ کو روتے ہم نے دیکھا ہے — وہ اک لمحہ بھی تیری یاد سے غافل نہیں ملتا

ان کو مائل بہ التفات کریں — پھر سے تجدید واقعات کریں
دے اجازت جو ان کی چشم کرم — پھر رقم دل کے حادثات کریں
کو ن ہے جس سے دل کا درد کہیں — کون ہے جس سے دل کی بات کریں
بھول جاؤ پرانی باتوں کو — ازسر نو معاہدات کریں
زندگی کتنی خوبصورت ہے — آؤ کچھ زندگی کی بات کریں
جہد پیہم ہے زندگی کا نظام — ہم بھی کچھ کوشش حیات کریں
حسن ہی حسن کائنات میں ہے — آؤ تسخیر کائنات کریں

قاسمیؔ آج دل کی دنیا کو ہم بھی ندرِ غم حیات کریں

(۸۳)

(۳۸)
مولانا عبدالحئ بیتابؔ صدیقی مظفر پوری

محمد عبدالحئ صدیقی نام، بیتابؔ تخلص، ضلع مظفر پور موجودہ ضلع شیوہر کے ایک گاؤں دوسری ٹولہ قاضی میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں پائی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کی سند حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی میں اردو صحافت سے دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں رام موہن رائے سیمینری اسکول سے منسلک ہو گئے۔ اور اسی اسکول میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگے۔ بقیہ اوقات بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بہار میں اردو تحریک سے دلچسپی لیتے رہے۔ زمانہ طالب علمی میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے طلبہ کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اردو تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ غلام سرور کے ساتھ تحریک اردو میں خوب حصہ لیا۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۶۵ء میں ایک ماہ کے لئے جیل بھی گئے۔

مظفر پور میں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں آپ کو شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مولانا عبدالمجید مضطرؔ مظفر پوری اور مولانا رحمت اللہ احقرؔ سے اصلاح سخن لیا۔ ان کی شاعری میں سلاست، برجستگی اور پختگی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

فصل خزاں سے لٹ گیا گلشن، اجڑا ہے میخانہ بھی
خیر ہو یارب ٹوٹ نہ جائے دل کا میرے پیمانہ بھی

سن کے صدائے قلقل مینا شور ہوا وہ رندوں میں
چونک اٹھے پھر اہل محفل گونج اٹھا میخانہ بھی

آب کے بدلے چرخ سے ساقی آگ کہ بادہ کچھ بھی برسے
مجھکو کیا جب توڑ کے بیٹھے شیشہ بھی پیمانہ بھی

موسم گل میں مئے سے نفرت واعظ کی یہ باتیں ہیں
ایسے وقت میں توبہ مجھ سے ،جام بھی ہے پیمانہ بھی
عشق و محبت کا یہ فسانہ درس عبرت دیتاہے
شمع بھی روکر ٹھنڈی ہوئی اور خاک ہوا پروانہ بھی
پی کے شراب جام الفت سب ہیں غافل اے بیتابؔ
جو رندہے اس میخانہ کا ہشیار بھی ہے دیوانہ بھی

گرداب میں جس کی کشتی ہوساحل کی تمنا کیا کرتا
ہوآگ لگی جس خرمن میں حاصل کی تمنا کیا کرتا
روداد محبت کیا کہتے اور عرض تمنا کیا کرتے
وہ جان محبت برہم ہے،محفل کی تمنا کیا کرتا
وہ ربط نہیں،وہ ضبط نہیں،وہ بات نہیں وہ رات نہیں
پروانہ صفت جب دل نہ رہا محفل کی تمنا کیاکرتے
ہاں چشم حقیقت حضرت دل کودشت طلب میں حاصل تھی
لیلیٰ تھی نہاں ہرذرہ میں محمل کی تمنا کیاکرتا

(۸۴)

(۳۹)
مولانا عبدالشکور آہؔ مظفر پوری

عبدالشکور نام،آہؔ تخلص،مولد و مسکن شہر مظفر پور تھا۔آپ کے والد مولانا نصیرالدین نصرؔ ایک جید عالم دین اور اچھے شاعر تھے۔وہ ضلع اسکول مظفر پور میں ہیڈ مولوی تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم شہر مظفر پور میں ہوئی۔متوسطات کی تکمیل کے لئے کانپور گئے اور حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کے درس میں داخل ہوئے۔اور تمام علوم بالخصوص علوم عقلیہ میں درک حاصل کیا۔دورحدیث کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے حدیث کا

درس لیا۔ فراغت کے بعد جامع العلوم مظفر پور میں برسوں درس دیا۔ پھر آپ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاد کی حیثیت سے بلائے گئے۔ اور وہاں عرصہ تک سینیر استاد کی حیثیت سے درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن مظفر پور تشریف لے گئے۔ تو جامع العلوم مظفر پور کے ذمہ داروں کی درخواست پر کچھ عرصہ تک جامع العلوم میں درس دیا۔ آپ کی وفات ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء میں مظفر پور میں ہوئی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا عبدالشکور شاعری کا پختہ ذوق رکھتے تھے۔ اور آہ تخلص کرتے تھے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں سلاست، روانی اور برجستگی ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

خزاں پہنچی بہار گلستاں میں : ہوئی بے چین بلبل آشیاں میں
تری منت مسیحا میں نہ کرتا : دوائے دل اگر ملتی دکاں میں
رہینِ منت صیاد ہیں ہم : قفس رکھا ہمارا گلستاں میں
جو کھائیں گا لیاں شیریں لبوں کی : لپٹ کر رہ گئے شکوے زباں میں
پپیہوں نے بڑھائی میری وحشت : جنوں افزا اثر تھا ''پی کہاں'' میں
غریب و غمزدہ ناکام شیدا : نہیں مجھ سا زمین وآسماں میں
جہاں ہمدم نہ ہو کوئی کسی کا : رہیں اے آہ کیوں ایسے مکاں میں

رقیب روسیہ کو ساتھ لے کر جب نکلتے ہیں — دل زخمی پہ کیا کیا حسرتوں کے تیر چلتے ہیں
کسی کی بے وفائی میں بھی اک شان وفا دیکھی — جنازے پر نہ آئے تو کف افسوس ملتے ہیں
ہمارے دیدہ دل کی حقیقت دیکھتے جاؤ — کہیں چشمے ابلتے ہیں کہیں شعلے نکلتے ہیں
بتائیں ہجر ہم کیوں کر دکھائیں درد ہم کیونکر — ہمارے گھر وہ آتے ہیں تو کل نقشے بدلتے ہیں
محبت ہم سمجھتے ہیں تری طرز عداوت کو — جگہ دیتے ہیں پہلو میں جو تیرے تیر چلتے ہیں

شب فرقت نہ پوچھو آہ چشم زار کا عالم
تن بسمل میں دو چشمے ہیں جو ہر دم ابلتے ہیں

رکھتا ہوں آگ عشق کی دل میں چھپی ہوئی حاجت نہیں ہے شمع کی میرے مزار پر
آئے جو بے نقاب کیا اک نیا ستم بجلی گرا گئے وہ دل بے قرار پر
رسوا نہ ہوتے عشق میں اے آہ ہم کبھی
قابو نہیں مگر دل بے اختیار پر (۸۵)

(۴۰)
مولانا قاری سید قسیم الحق قسیم گیاوی

سید قسیم الحق نام، قسیم تخلص، تاریخی نام ''سید محمد اقبال غنی'' شہر گیا میں ۱۹۴۲ء پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام حکیم سید نسیم الحق تھا۔ یہیں پروان چڑھے، آپ کے نانا جان شہر گیا کے مایہ ناز عالم مولانا خیر الدین تھے۔ جن کے زیر سایہ آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر میں حفظ قرآن مکمل ہو گیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم اپنے بڑے ماموں مولانا قاری محمد فخر الدین فخر گیاوی مہتمم مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ گیا کی سرپرستی میں حاصل کی۔ پھر دار العلوم دیو بند پہنچے اور قرأت، تجوید اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔

سید قسیم شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اور اچھی شاعری کرتے تھے۔ رسالہ سہیل گیا میں بزم سخن بھاگلپور کے انعامی مشاعرہ کا مشرعہ چھپا۔ اس پر طبع آزمائی کی۔ غزل مکمل کرنے کے بعد بسمل سنسہاروی کی خدمت میں بھیجی۔ انہوں نے اصلاح کے ساتھ ہمت افزائی کی۔ اس طرح بسمل سنسہاروی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد قمر مرادآبادی کے شاگرد ہوئے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کچھ کام نہ آئیگا یہ انداز شہانہ جینا ہے تو آمل کے جئیں شانہ بشانہ
کیوں اپنے غم دل کو کہوں اور کسی سے کیا کم ہیں بیاں کے لئے غم ہائے زمانہ
مالی جو چمن کا ہے وہ کچھ سوچ رہا ہے لب پر ہے مرے عظمت گلشن ترانہ
جنت تو نہیں بن سکی اے عقل، یہ دنیا ہاں کھول دیا تو نے جہنم کا دہانہ
روداد مری سن کے وہ کہتے ہیں یہ ہنس کر ہاں پھر کہو اک بار یہ رنگین فسانہ
کرتا ہوں رفیق اپنا فغان سحری کو جب ساتھ مرا چھوڑتی ہے آہ شبانہ

بے گور وکفن لاش سرراہ گذر ہے — کہتے ہیں کہ یہ میت اخلاق بشر ہے
مانا کہ کٹھن زیست کی راہوں کا سفر ہے — کیا کیجئے جینے کا بھی ارمان مگر ہے
آمادہ پیکار ترا دل تو ہو پہلے — پھر دیکھ ترے سامنے شب ہے کہ سحر ہے
پلے تو بنا خود کو جواں طبع وجواں دل — پھر کہاں کہ کیا حسن ہے کیا حسن نظر ہے
ہاں اے غم دوراں تجھے اپنا لیا میں نے — دل میں غم جاناں ہے تو مہمان جگر ہے
مائل بہ سکوں خود کو میں اب دیکھ رہا ہوں — یہ اپنی نظر ہے کہ قسیمؔ ان کی نظر ہے

اے اجل تیرے لیئے ہیں دیدہ ودل فرش راہ — قدرداں ہوں میں ترا تجھ سے ہے بیزاری کہاں
بحر غم میں ڈوب کر دُرِّ مسرت لاہئے — راحت دل کی جہاں میں ورنہ ارزانی کہاں
سر جھکے سجدہ میں جب دل کو بھی جھکنا چاہئے — ورنہ ہر سجدہ کی پیش حق پذیرائی کہاں
منبع راحت ہو جس کا گوشہ گوشہ اے قسیمؔ — اک مدینہ کے سوا ایسی کوئی بستی کہاں؟

عشرت کے زمانے بھی آئے ادبار بھی ہم پر آئے ہیں
راحت میں ہوئے مغرور نہ کچھ تکلیف سے ہم گھبرائے ہیں
رکھتے ہیں یقیں اس بات پہ ہم یہ ایک حقیقت ہے ہمدم!
جو غم سے نہ گھبرائے سمجھو اقبال کے اس پر سائے ہیں
مسلم ہیں خدا کے فضل سے ہم سچ کہنا ہے اپنا کام قسیمؔ!
حق بات کے کہنے میں ہرگز جھجکے ہیں نہ شرمائے ہیں

اے کاش کہ پروائے دوعالم نہیں کرتے — کچھ بھی تری الفت کے سوا ہم نہیں کرتے
سجدہ ہے روا ایک ہی محبوب کے در پر — ہم اپنی جبیں اور کہیں خم نہیں کرتے
عاقل ہیں وہ آئندہ پہ ہیں جن کی نگاہیں — اور عہد گذشتہ کا جو ماتم نہیں کرتے
پہنچیں گے سر منزل مقصود وہ کیوں کر — جو بہر طلب کوشش پیہم نہیں کرتے

نہ زیر کر سکے گی اس کو گمرہی و سرکشی　　جو ہو گیا رموز آشنائے لطف بندگی
وہی ہے منزل آشنا جو تیرے در پہ جھک گیا　　جو تجھ سے بے خبر رہا اسے ملی ہے گمرہی
نہ حرص ہو نہ جبر ہو نہ اتباع رسم ہو　　جو ہو تو عشق دل میں ہو یہی ہے اصل بندگی

(۸۶)

(۴۱)

مولانا سید مظاہر عالم رونقؔ سہسرامی

سید مظاہر عالم نام، رونقؔ تخلص والد ماجد کا نام سید ظفر عالم ہے۔ ۱۳؍جنوری ۱۹۴۶ء کو سہسرام میں پیدا ہوئے۔ ابتداء سے مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ فاضل فارسی امتحان ۱۹۶۸ء میں پاس کیا۔ عالم پاس کرنے کے بعد چناری ہائی اسکول میں معاون مدرس کی جگہ پر بحال ہو گئے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے رکھتے تھے۔ سخن فہمی کا اچھا سلیقہ تھا۔ آپ کی شعری صلاحیت اور قوت فکر اتنی بلند تھی کہ مشاعرے کے آغاز سے کچھ پہلے بھی مدعو کرنے پر برجستہ کلام موزوں کر کے مشاعرے میں سناتے ہیں۔ ابتداء میں اپنے کلام پر جناب حشرؔ سہسرامی سے اصلاح لی۔ ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

شیشہ دل میں جھلکتی ہے یوں تصویر تری　　گویا تو دل سے جدا ہونے کے قابل ہی نہیں
ادھ کھلی آنکھ ہے یا مئے سے چھلکتا پیالہ　　یا کوئی بحر ہے جس کا کوئی ساحل ہی نہیں

گل بھی ہیں چاک دامن غنچے بھی ہیں فسردہ　　آنسو بہا رہے ہیں سب میری داستاں پر
وہ گل نہیں تو کچھ بھی رونق نہیں چمن میں　　چھائی ہوئی اداسی ہے سارے گلستاں پر

خشک ہوتے ہیں آنکھ میں آنسو　　جس سے جینا محال ہوتا ہے
ڈوب جاتا ہے شرم سے مہتاب　　رشک بھی اک وبال ہوتا ہے
بزم اغیار میں نہیں رونقؔ　　کیوں کسی کا خیال ہوتا ہے

حسن آیا بھی تو نقاب کے ساتھ　　عشق جاگا بھی تو حجاب کے ساتھ
ہم توڑتے رہے رواجوں سے　　غم نے لوٹا ہمیں شباب کے ساتھ
(۸۷)

(۴۲)

مولانا سید محمد ابراہیم نجمؔ ندوی

سید محمد ابراہیم ندوی نام۔ نجمؔ تخلص۔ مولوی سید محمد قاسم کے صاحبزادے۔ دادیہال حسن پورہ نزد پھلواری شریف پٹنہ اور ننہال موضع کسمر ضلع سارن میں تھی۔ ان کے والد وہیں سسرال میں آباد ہو گئے تھے۔ مولد کسمر ضلع سارن۔ قیام محلہ اولہن پور، چھپرہ سال ولادت معلوم نہیں۔ ابتدائی تعلیم تمام کرنے کے بعد عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے سند فراغ پائی۔ اس لئے اپنے نام کے ساتھ ندویؔ لکھتے ہیں۔ کچھ دنوں اولہن پور (چھپرہ) کے مڈل اسکول کے مدرس بھی رہے۔ سپرینڈنٹ اسلامک اسٹڈیز کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں انتقال فرمایا۔

نجمؔ ندوی کو شعر و سخن سے بڑی گہری مناسبت تھی۔ اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شادؔ اسکول سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ کلام میں پختگی بدرجہ اتم ملتی ہے۔ بعض اشعار تو بہت صاف، پاکیزہ اور لطیف ہیں۔ یہ نظمیں بھی کہتے تھے اور غزلیں بھی۔ نثر بھی سادہ اور سلیس لکھتے تھے۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

بہار آتے ہی حملے ہو رہے ہیں جیب وہ داماں پر
کسی کا بس نہیں چلتا جنون فتنہ ساماہ پر
نظر آئی بہار خانہ دیوار گلستاں پر
تحیر صبح سے ہے رات کے خواب پریشاں پر
دکھائے معجزئے آخر مرے ذوق اسیری نے
مری تصویر لٹکائی گئی دیوار زنداں پر

فرشتے بھی نہ جرات کر سکے جس کے تحمل کی
خدا کی شان وہ یاد دو عالم ایک انساں پر
سکوت شب میں خون دل نگاہوں سے گل افشاں ہے
گلستاں کھل رہا ہے دامن شبہائے ہجراں پر
مسخر کر لیا حسن و محبت نے دو عالم کو
برابر ہے اثر اس کا دل گبرو مسلماں پر
دم آخر کنارہ کر لیا اس بے وفا نے بھی
مجھے تاعمر کیا کیا ناز تھا عمر گریزاں پر
زمانے میں بہت ہیں نبض فطرت دیکھنے والے
مگر دست تسلی کون رکھے زخم پنہاں پر
غم ساقی میں نغموں سے بھی اب تو دم الجھتا ہے
کہ ہے مضراب کی ہر ضرب اک نشتر دل وجاں پر
نگاہ گرم ابھی تک ہے وہی چرخ ستمگر کی
تڑپتی ہیں ابھی تک بجلیاں گورغریباں پر
مذاق شاعری ہے گردش گردوں سے بیگانہ
خدا کا فضل ہے اے نجمؔ مرغان خوش الحان پر

ہے رفیق راہ الفت جذبہ کامل مجھے
ننگ ہے، اس میں تلاش رہبر منزل مجھے
جستجوئے منزل مقصود بے معنی سہی
بدو فطرت سے ہے بس ذوق سعی حاصل مجھے
اک دل درد آشنا پہلو سے کیا جاتا رہا
چار دن کی زندگی بھی ہوگئی مشکل مجھے
بحر ہستی سے مری کشتی کنارے آ لگی
لے اڑی موج حوادث تا لب ساحل مجھے
ہو نہ ہو در پردہ ہیں کچھ اور ہی تیاریاں
آپ اور بھیجیں نوید شرکت محفل مجھے
رہبر راہ عدم کو خضر کی حاجت نہیں
درد الفت مل گیا ہے رہبر کامل مجھے
آنکھ کی حسرت تو نکلی دل کا ارماں رہ گیا
لطف نظارہ تصور سے ہوا حاصل مجھے

قبر پر بھی رات دن اہل زیارت کی ہے بھیڑ — یاں بھی کیا سونے نہ دے گی شورش محفل مجھے
خود فراموشی ہے پہلی منزل معراج عشق — بیخودی سمجھا گئی عقدۂ مشکل مجھے
اپنی آنکھوں میں بسا ہے حسن لیلیٰ رات دن — پردۂ تارنظر ہے پردۂ محمل مجھے
کچھ دل گم گشتہ کے ماتم سے فرصت بھی ملے — خاک پیدا ہو خیال عشرت محفل مجھے

نجمؔ اک تو شاعرانہ خود ہی تھا اپنا مزاج
اور پھر استاد بھی اک مل گیا کامل مجھے

(۸۸)

(۴۳)

سید شاہ غلام مخدوم مستؔ سہسرامی

سید شاہ غلام مخدوم نام، مستؔ تخلص، قصبہ سہسرام ضلع بھوجپور محلہ کرن سرائے مسکن تھا۔ والد ماجد سید شاہ عبدالرحیم مسرؔ در اس قصبہ کے مشہور رئیس تھے۔ جناب مستؔ نے علوم ظاہری کی تعلیم جناب مولوی شوکت علی خاں مرحوم سے حاصل کی اور علوم باطنی کی تعلیم اپنے جد امجد شاہ محمد عبدالکریم سے پائی جن کی وفات کے بعد آپ سجادہ نشیں ہوئے۔ آپ فارسی اور اردو میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی طبیعت شاعری کے لئے موزوں واقع ہوئی تھی۔ اور والد بزرگوار کے فیض صحبت نے لذت سخن کی چاشنی چکھائی۔ اور خود جناب مستؔ کے زور طبیعت نے ان کے کلام کو دوبالا کر دیا تھا، ابتدا میں صوفیؔ تخلص کرتے تھے۔ پھر مستؔ تخلص اختیار کرلیا۔ اپنے معاصرین شعراء میں امتیاز وعزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ نہایت منکسر مزاج اور صوفی منش واقع ہوئے تھے۔ آپ کا کلام صاف اور شوخ ہوتا تھا۔ مدرسہ کبیریہ خانقاہ سہسرام میں فارسی کے مدرس رہ چکے تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

ادھر میں رویا ادھر ہنس پڑے وہ محفل میں — پہنچ گئی یہ خبر آنسوؤں کے تار کے ساتھ
کھلیں چمن میں ہزارے اگر بہار کے ساتھ — ہزار جان سے ہو جاؤں میں ہزار کے ساتھ
وجود روح میں ہوتا ہے نامہ وپیغام — عدم کی ڈاک لگی ہے نفس کے تار کے ساتھ
گلہ ہے گل کا جو شمع جمال کہنے سے — چمن میں خوش رہو پھولو پھلو بہار کے ساتھ

یہ کس خورشید روکی رونمائی کو نکلتا ہے
کہ سورج روزمرہ نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے
زمیں کیا آسماں پر بھی حسین رکھتے نہیں پاؤں
غرور حسن سے اوپر ہی اوپر ماہ چلتا ہے

خطا یہ ہے کہ ہم نے ماہ نو پر آنکھ ڈالی ہے
سزا یہ ہے کمر سے تیغ قاتل نے نکالی ہے
مثل مشہور ہے دل کو ہے دل سے راہ دنیا میں
پریشانی مری اس زلف کی آشفتہ حالی ہے
ہمیشہ ظالموں سے ہے فروغ اس دار دنیا کو
ستم کرتا ہے گل پر، آبروگلشن کی مالی ہے

(۸۹)

جناب مستؔ نے ۲۹ رمئی ۱۹۵۵ء میں بوقت شام انتقال کیا۔

(۴۴)

مولانا جسیم القادری اماتؔی آروی

جسیم القادری نام، اماتؔی تخلص، شہر آرہ کے محلہ دودھ کٹورہ میں ۳ر جولائی ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ مولانا اماتؔی اپنے والد محترم حافظ احمد جمیل صاحب کی تربیت و نگہداشت میں دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور طلب علم میں ملک کے مشاہیر علماء کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ امتیازی طور پر ٹرپیل عالم اور ڈبل فاضل ہوئے۔ آپ نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اکتساب علم کیا، اسی لئے وہ ندوی لکھتے تھے۔ تحصیل علوم کے بعد ۱۹۶۰ء میں اپنے وطن آرہ آئے اور آتے ہی مدرسہ حنفیہ آرہ سے بحیثیت ایک کامیاب مدرس کے منسلک ہوگئے۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ حضرت اسیمؔ خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ تخلص حضرت شاہ امان اللہ صاحب قادری صاحب سجادہ مجیبی پھلواری شریف کی نسبت ارادت سے اماتؔی کرتے تھے۔ لکھنؤ کی محفلوں میں رنگ سخن نے شوخی و پختگی حاصل کی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

وہ غلط فہمی میں ڈال آئے محبت کے پھول
ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہے مدفن میرا

مثرۂ تابناک پر صیقل خون دل چڑھا
خنجر آبدار کو اور بھی آب دار کر

ہماری ابتدائے عشق بھی ہے عشق کی معراج یہ سرخی ہے مگر اک داستاں معلوم ہوتی ہے
جنوں نے تو ہمارا ساتھ چھوڑا تھا مگر افسوس خرد بھی آج ہم سے سرگراں معلوم ہوتی ہے

نہ جانے کیوں سنی جب اس نے میری رُوئدادِ غم چمک اٹھا تھا اک ننھا سا تارہ نوکِ مژگاں پر

کٹ گئی کیا ہماری رات نہیں؟ تم نہیں آئے کوئی بات نہیں
ان سے رعنائی خیال بھی تھی اب وہ رنگیں تصورات نہیں
تم نہ آؤ تو روز بھی شب ہے تم جو آؤ تو رات رات نہیں
یا غم دہر یا غم جاناں غم سے دل کو کبھی نجات نہیں
(۹۰)

(۴۵)

مولانا شاہ قمر الدین حیدر قمرؔ آروی

شاہ قمر الدین حیدر نام، قمرؔ تخلص۔ مولد و مسکن آرہ، حضرت صفیرؔ بلگرامی کے شاگرد تھے۔ آرہ کے نامور حکیم ہونے کے علاوہ مشہور شاعر بھی تھے۔ کلام میں مشاقی ہے، کلام با مزہ و دلنشیں ہوتا ہے،

شاداں فاروقی تحریر کرتے ہیں:

''سید لقمان حیدر وکیل آرہ دبانی آرہ ٹاؤن اسکول کے چند مکانات تھے، جن میں وہ خود اپنے عزیزوں کے ساتھ رہتے تھے۔ انہیں مکانات میں ایک مکان حسین منزل تھا۔ سید قمرؔ الدین حیدر قمرؔ آروی حسین منزل میں رہتے تھے۔ اور مہر و بدر و حشر آروی سے یارانہ تھا۔'' (۹۱)

قمرؔ آروی کی مثنوی طبع ہوئی۔ اس کی تاریخ طباعت کا یہ فقرہ ہے ''دلکشا مثنوی قمرؔ'' اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۳۱۱ھ تک زندہ تھے۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ راقم کو نہیں معلوم ہو سکی۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

غزل قمرؔ آروی مطبوعہ ''پیام یار'' لکھنؤ ۱۳۰۴ھ مصرعہ طرح۔

''ہمارے عشق سے نام آپ کا بلند ہوا''

وہ درد درد ہے، دل جس سے دردمند ہوا وہ دل ہے دل، جسے اک سنگدل پسند ہوا

چلی ہے بعد مرے شمنوں پہ تیغ ادا شہید ناز توپہلے نیاز مندہوا
قمر وہ آئے بھی وصل کی شب تو کیا آئے کہ صبح داغ جگر اور بھی دوچند ہوا

غزل قمر آروی مطبوعہ گلدستہ بزم آرا۔شعبان ۱۲۹۸ھ

دل فرقت زدہ پر غم کی چھائی سربسر بدلی نگہ جس وقت تیری اے بت بیداد گر بدلی
ہمارے اشک کو تشبیہ دیتی گر نہ موتی سے دکھاتی قطرہ،نیساں سے کیا آپ گہر بدلی
ہوا ثابت اسی سے کشتۂ زلف پریشاں ہوں ہمیشہ آ کے روتی ہے جو میری قبر پر بدلی
سیہ بختی ،ہے اکثر دور ہوتی خوش نصیبوں سے ہوئی ہے آ کے روئے مہ پہ دیکھو جلوہ گر بدلی
پریشاں کر رکھا زلف سیہ نے تیری کس کس کو اڑی پھرتی ہے دیکھا اے ماہوش بے بال دیر بدلی
کسی کی زلف پیچاں کا ہے شاید عکس گردوں پر بھلی معلوم ہوتی ہے نظر میں اے قمر بدلی

از تاریخ شعرائے بہار مئولفہ راز بلخی عظیم آبادی ؎

جس کو سب گردش چشمان بتاں کہتے ہیں میں نے دیکھا تو مری گردش قسمت نکلی
تونے تو مانگا تھا دل،جان بھی دیدی میں نے حوصلہ سے ترے بڑھ کر مری ہمت نکلی

ازفروغ بزم مئولفہ بابوجگیشر پرشاد خلش گیاوی ؎

تیرے قدم کے فیض سے اے نونہال حسن باغ وفا میں کوئی نیا گل کھلا نہ ہو
مداح اک خدائی ہے بے دیکھے،اے صنم! تعریف بس وہی ہے کہ جو غائبا نہ ہو

یاد جاناں میں ستائے گی امید موہوم مضطرب یہ دل محروم تمنا ہوگا
خلش نشتر غم بس ہے رگ جاں کیلئے خون دل اپنا علاج تپ سوداہوگا
تری تصویر بنے گا ترا دیوانہ عشق حیرتی جس سے ہر اک محوتماشا ہوگا
لاکھ ماتوس ستم ہے دل غم دوست تو کیا اشک دشمن نہ کسی طرح گوارا ہوگا
ترے رخسارۂ رنگیں کی جھلک سے اے شوخ دیدۂ شوق گل نرگس شہلا ہوگا
ہجر میں یاد جو ہوگی کسی مہوش کی قمر جلوۂ حسن چراغ شب یلدا ہوگا

(۹۲)

(۴۶)
مولانا شاہ مسعود الحسن مسعودؔ سہسرامی

شاہ مسعود الحسن نام، مسعودؔ تخلص، شاہ محمود الحسنؒ کے فرزند اور جانشیں ۔ قصبہ سہسرام ضلع بھوجپور کے رہنے والے تھے۔آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حضرت شاہ محمود الحسن سے حاصل کی جو آپ کے پیرومرشد بھی تھے۔آپ سہسرام کے صوفیائے کرام کی نگاہوں میں عزت سے دیکھے جاتے تھے۔آپ کا حلقہ رادت وسیع تھا۔زیادہ وقت رشد وہدایت میں گزرتا تھا۔ شریعت کے پابند تھے۔سیاسی جلسوں اور شعروسخن کی عام مجلسوں میں کم شریک ہوتے تھے۔ شعروادب کا ذوق اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا تھا۔آپ کے کلام میں سادگی و پرکاری ہے۔ کیف وتاثیر سے معمور ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

مقام بیخودی کو بھی فریب دل سمجھتے ہیں — کہ اس کے اور آگے اپنی ہم منزل سمجھتے ہیں
ازل سے ہے نگاہوں میں ہماری جلوۂ مقصد — یہ ناداں کیوں ہمیں گم کردہ منزل سمجھتے ہیں
نظر آتا ہے جو آنکھوں کو وہ اپنا تصور ہے — غضب ہے لوگ اس کو انکشاف دل سمجھتے ہیں
وہ کیا نکلیں گے گرداب محبت کے تلاطم سے — جو بحر عشق کی ہر موج کو ساحل سمجھتے ہیں
عتاب آلودہ آنکھوں میں جھلک ہوتی ہے رحمت کی — کسی کی تلخ باتوں کو دوائے دل سمجھتے ہیں
تن خاکی میں پوشیدہ ہے لیلیٰ ازل مجنوں! — لباس مدوح کو ہم پردہ محمل سمجھتے ہیں
ہزاروں صورتوں میں جو اسے پہچان لیتا ہے — اسے مسعودؔ ہم تو عارف کامل سمجھتے ہیں

جس روپ میں آئے یاد انکی اس رنگ کا میرا دل کردے — ہر روز نئی لیلیٰ کیلئے اے شوق نیا محمل کردے
گرداب کے پھندوں سے چھوٹے، موجوں کی کمندوں سے چھوٹے — ایسا نہ ہو شومی بخت زبوں غرتاب لب ساحل کردے
دل باختہ ہوں دل سوختہ ہوں الفت کا سبق آموختہ ہوں — جو بھی ہوا سیر عقل وخرد خالی وہ مری محفل کردے
بحر غم دل بے تھاہ ملا ہے گرد مرے گرداب بلا — ساحل سے بہت ہوں دور پڑا آسان کوئی مشکل کردے
مسعودؔ کدھر ہے دھیان ترا کچھ ہوش میں، بیہوش نہ ہو — سن لے جو کہیں وہ بات تری جینا بھی ترا مشکل کردے

صورت موسیٰ گرے غش کھا کے مستانے ہوئے ہاتھ میں اپنے چراغ طور پیمانے ہوئے
ضعف سے اب اٹھ نہیں سکتا ہے یہ بار گراں اے فرشتو! رحم، شل دونوں مرے شانے ہوئے
ساتھ ذکر یار کے گرتے ہیں، آنسو آنکھ سے اشک کے قطرے مرے تصبیح کے دانے ہوئے
سارے عالم سے ہیں مستغنی ترے محو جمال آشنا تجھ سے ہوئے تو سب سے بیگانے ہوئے

مرے بالائے سرِدُود فغاں ہے زمانہ جانتا ہے آسماں ہے
گذر اس گھر میں غیروں کا کہاں ہے خیال دوست دل کا پاسباں ہے
یہ دیکھو بارغم ہم نے اٹھایا قوی ترکیا ہی جان نا تواں ہے
خودی اپنی حجاب چشم دل تھی کہاں اب کوئی پردہ درمیاں ہے

کھلے اسرار تب مجھ پر جنون فتنہ ساماں کے اڑیں جب پرزے پرزے ہو کے جیب وآستیں برسوں
بڑی دشواریوں سے گو ہر مطلوب ہاتھ آیا رہے بحر طلب میں غرق ہو کر تہہ نشیں برسوں
ریا کا ایک سجدہ زاہد خود بیں قیامت ہے لرزتا ہے ملک' فریاد کرتی ہے زمیں برسوں
چمک اٹھی جو مثل نیر تاباں تعجب کیا جھکی ہے دوست کے نقش قدم پر یہ جبیں برسوں
مقدر میں تھی اشک بے اثر کے آہ رسوائی گرا میری نظر سے آج رہ کر دل نشیں برسوں

(۹۳)

دور مابعد جدید
یا
دور حاضر

دور مابعد جدید
یا
دور حاضر

باب اول کے دور مابعد جدید میں اس دور کے بارے میں کچھ ضروری باتوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔اس سلسلہ میں پروفیسر وہاب اشرفی کی تحریر پیش کی گئی تھی،اس کو میں دوبارہ نقل کر رہا ہوں۔وہاب اشرفی تحریر کرتے ہیں:

''تمام قدیم ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی نسل خصوصاً جو ۱۹۸۰ء کے بعد یا اس کے آس پاس سامنے آئی ہے۔اس کے یہاں ایک طرف اردو کی مثبت روایتیں سامنے تھیں۔تو دوسری طرف ترقی پسندی اور جدیدیت کے زوال کا منظر نامہ بھی تھا۔نتیجے میں نئے لکھنے والوں نے زندگی کی حوصلہ مند قوتوں کو نئے افکار کی روشنی میں آزادانہ طور پر برتنے کی سعی شروع کی۔اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نسل مابعد جدیدیت کے تصورات سے کچھ زیادہ قریب ہے۔''

اس دور میں علماء کی شاعری کو میں گذشتہ ادوار کے انداز پر ہی پاتا ہوں۔ایسا نہیں کہ اس دور کے علماء نے جدید ادبی رجحانات کا خیال نہیں رکھا یا اس سے وہ بے خبر رہے۔بلکہ انہوں نے جدید تقاضوں کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں اپنی شاعری میں جگہ دی۔جس کی وجہ سے افکار اور فن دونوں کے دونوں آگے کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔چنانچہ جہاں انہوں نے اردو زبان کے حسن کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔وہیں افکار کی بلندی اور اعلیٰ اقدار کی حفاظت،تہذیب وثقافت کی پاسداری بھی کی۔اس طرح انہوں نے اردو شاعری کی روایت کو مرعوب ہونے کی روایت سے الگ کیا۔اور اردو شاعری کو باوزن اور باوقار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

اس دور میں ۱۹۸۰ء کے پہلے کے باحیات شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔اور ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعراء کو بھی۔دونوں کے اشعار کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔تا کہ موازنہ کرنے میں آپ کو سہولت ہو۔اس دور کے چند شعراء کے تذکرے اور نمونہ کلام پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

مولانا سید نظام الدین قائم گیاوی

سید نظام الدین نام، قائم تخلص، والد کا نام مولانا سید حسین۔ تاریخ ولادت ۳۱/ مارچ ۱۹۲۷ء۔ جائے ولادت گھوڑی گھاٹ، ضلع گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخل کئے گئے۔ متوسطات اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ اور ۱۹۲۴ء میں وہاں داخل ہوئے۔ وہیں سے ۱۹۴۶ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ ریاض العلوم چمپارن میں صدر مدرس کی حیثیت سے بحال کیے گئے۔ وہاں تقریباً پندرہ سال تک خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء میں مدرسہ رشید العلوم چترا میں بحیثیت صدر مدرس تدریسی خدمات انجام دیئے۔ ۱۹۶۵ء سے امارت شرعیہ میں ناظم کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے بعد۔ ۱۹۵۸ء میں امیر شریعت منتخب کئے گئے۔ پھر ۱۹۵۱ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سیکریٹری منتخب کیے گئے۔

قائم گیاوی زمانہ طالب علم ہی سے شعروشاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔ قائم گیاوی کی شاعری کے سلسلہ میں مولانا سید محمد رابع حسنی تحریر کرتے ہیں:

’’مولانا کو اپنے خاندانی مزاج، خصوصی طبیعت اور ذوق کے لحاظ سے اپنے احساسات کو شعری اسلوب میں بھی پیش کرنے کا اچھا ذوق حاصل ہے، وہ شاعری کے پیشہ ورانہ انداز سے دور رہتے ہوئے محض اپنے خصوصی تاثر اور ذوقی تقاضے سے شعر کہنے لگے۔ انہوں نے نہ مشاعروں میں حصہ لیا اور نہ دیوان بنانے کی کوشش کی، لیکن محدود مقدار میں ان کے پاس اپنے اشعار کا ایک مجموعہ ہو گیا۔‘‘ (۹۴)

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز تحریر کرتے ہیں:

’’اگر وہ امیر شریعت و سکریٹری پرسنل لا بورڈ نہ ہوتے تو شاعر ضرور ہوتے۔ دینی، قومی، ملی مسائل میں اپنے کو قید کئے نہ ہوتے تو مشاعروں کی زینت ہوتے۔ صاحب دیوان ہوتے۔ مشاعروں کی صدارت کرتے ہوتے۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ مولانا نظام الدین صاحب کی شکل میں ہمیں بہت بڑی چیز ملی، دین کی حفاظت ملی، ایمان کی حفاظت ملی، معاشرے کی حفاظت ملی، لیکن ہم

نے جو کھویا ہے وہ بھی کم نہیں ہے۔ شعر و ادب کا ایک اچھا رہنما ہم نے ہاتھ سے دے دیا۔‘‘
(۹۵)

کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

جب موسم گل میں جوش جنوں بڑھتا ہے تیرے دیوانوں کا
صدر شک چمن بن جاتا ہے پل بھر میں سماں ویرانوں کا
بے تاب تھی یوں تو محفل میں ہر ایک نگاہ جلوہ طلب
جب شمع جلی تو مت پوچھو کیا حال ہوا پروانوں کا
کچھ بادہ کشوں پر نظر کرم کچھ بادہ کشوں پر مشق ستم
اے ساقی محفل ہوش میں آ، یہ طور نہیں مے خانوں کا
میزان عمل میں دونوں ہیں پر کون وہاں کام آتا ہے
یہ بانگ اذاں فرزانوں کی یا نعرۂ ہو دیوانوں کا
کچھ لالہ و گل کی رنگت میں کچھ خاک نشیمن کی تہہ میں
جو کچھ بھی ہے باقی گلشن میں عنواں ہے میرے افسانوں کا
اس بحر حوادث میں قائمؔ پہونچے گا وہی اب ساحل تک
جو موج بلا کا خوگر ہو رخ پھیر سکے طوفانوں کا

میں ان کی یاد کو وجہ سکون دل سمجھتا ہوں — یہی دولت ہے جس کو عمر کا حاصل سمجھتا ہوں
فغاں کا اک سبب تو ضبط کی کوتاہیاں بھی ہیں — مگر اس میں بھی کچھ تیرا کرم شامل سمجھتا ہوں
وہ مجھ پر مہرباں ہوں یا نگاہیں پھیر لیں مجھ سے — میں ان کی ہر ادا کو دید کے قابل سمجھتا ہوں
سنبھل اے چشم نم وہ آ رہے ہیں پرسش غم کو — تیرے دو آنسوؤں میں آبروئے دل سمجھتا ہوں

نہ ہوتی شمع محفل میں تو پروانے کہاں جاتے
نہ ہوتا سنگ در تیرا تو دیوانے کہاں جاتے

میرے نغموں نے ان کے حسن کو شہرت عطا کی ہے
نہ ہوتے ہم تو کہئے آپ پچا نے کہاں جاتے
نہ رہتے ان کے قدموں میں نہ بستے انکی آنکھوں میں
تو پھر پوچھو انہیں سے ان کے دیوانے کہاں جاتے
پکڑ کے ہاتھ واعظ کے سرے خانہ لے آئے
مے ومینا کی لذت ان کو سمجھانے کہاں جاتے
میرے جوش جنوں نے وقت پر کی رہبری ورنہ
نہ جانے عقل کے مارے یہ فرزانے کہاں جاتے
یہ رستہ بھولنا بھی خوب تھاوہ میرے گھر پہنچے
اندھیری رات تھی تنہا خدا جانے کہاں جاتے

خرد کی بات کرو یا جنوں کی بات کرو
کسی طرح مرے دل کے سکوں کی بات کرو
وہ جس سے مردہ امیدوں میں جان آجائے
مسیح وقت ہوتم ایسے فسوں کی بات کرو
فسانہ حسن کی رعنائیوں کا سن تو چکے
مریض عشق سے سوز دروں کی بات کرو
یہ ذکر عقبیٰ تو منبر کی شان ہے واعظ
زمیں پہ آؤ تو دنیائے دوں کی بات کرو
(۹۶)

(۲)
مولانا محفوظ الرحمن شاہینؔ جمالی

محفوظ الرحمن نام، شاہین تخلص، استاد مولانا جمال خستہ کی نسبت سے جمالی لکھتے

ہیں۔والد کا نام مولانا عبدالمجید۔آبائی وطن کھروہی ڈھاکہ،ضلع چمپارن ۔اور سال ولادت ۱۹۴۷ء ہے۔ابتدائی تعلیم مولانا جمال احمدؒ خستہ سے حاصل کی۔فارسی کی اعلیٰ کتابیں انہیں سے پڑھیں۔پھر دارالعلوم دیوبند گئے۔اور ۱۹۶۹ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔مفتی اعظم مولانا محمود حسن گنگوہی سے فتاویٰ نویسی کی مشق کی۔شاہینؔ جمالی بہت سے کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔''اردو تراجم قرآنی کا تقابلی مطالعہ'' پر تحقیقی مقالہ بھی تحریر کر چکے ہیں۔مختلف رسائل میں ان کی ادبی، اصلاحی اور تحقیقی نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔درجنوں مدارس اور قومی تنظیموں کے سرپرست ہیں۔میرٹھ کے تاریخی مدرسہ امدادالاسلام میں چالیس برسوں سے شیخ الحدیث اور پرنسپل کے عہدہ پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔بچپن ہی سے شعروشاعری کرتے ہیں۔فارسی اوراردودونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

ان کا کلام نہایت ہی معیاری ہے۔اساتذۂ فن کے مقابلے کے ہیں۔ان کے کلام میں اعلیٰ قدروں کی پاسداری بھی ہے۔ساتھ ہی بلند فکروفن کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

یاس اوراحساس

ہے دل میں پھیلی ہوئی تیری یاد کی خوشبو　　زمانہ بیت گیا گو جدا ہوئے تجھ کو
مجھے یہ لگتاہے گلدان لیکے ہاتھوں میں　　ابھی ابھی مرے کمرے سے کوئی نکلا ہو

وہ شام قرب وہ وادی کا دلنشیں منظر　　میں زندگی میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا
کہا تھا دیکھ کے جب چاند کی طرف تونے　　تو اس کو دیکھ تو سکتا ہے پانہیں سکتا

یقیں نہ آیا تری بات پر مجھے اس وقت　　کہ ماہتاب مجسم سے میں تھا ہم آغوش
فروغ حسن سے معمور تھی فضادل کی　　نگاہ شوق میں تھا تیراجلوۂ خاموش

مگر یہ راز کھلا مجھ پہ ایک سال کے بعد　　خیال خام تھا،سودا تھا تجھ کو پالینا

نکھر گئی ہے صداقت ترے مقولے کی　　تجھے میں دیکھ ہی سکتا ہوں پا نہیں سکتا

میں پھر بھی خوش ہوں کہ اتنی تو تاب ہے مجھ میں　　کبھی کبھی تجھے دیکھوں نگاہ حسرت سے
یہ آسرا بھی مری زندگی کو کیا کم ہے
میں آشنا ہوں عطائے غم محبت سے

غـــزل

شب اداس کسی آس میں ڈھلی تو ہے　　وفا کی بات تری بزم میں چلی تو ہے
میں آدمی ہوں مگر آج کے فرشتوں سے　　خدا گواہ مری زندگی بھلی تو ہے
تمام لوگ مقدس جسے سمجھتے ہیں　　ہمارے شہر میں شیطان اک ولی تو ہے
چراغ خانہ مفلس تھا شام ہی سے خموش　　کسی کی آنکھ مگر صبح تک جلی تو ہے
گلوں کے لب پہ تبسم کا نام تک بھی نہیں　　ہوا بہار کی کہنے کو یوں چلی تو ہے
کسی کے قتل کے چھینٹوں کی بو چھپے گی کہیں　　بدن پہ آپ نے خوشبو بہت ملی تو ہے
سفر میں پاؤں کے چھالوں پہ اب نہ جائے دل　　وہ دیکھ سامنے محبوب کی گلی تو ہے
وہ بے وفا ہی سہی غیر تو نہیں شاہیںؔ
کہ اس کی یاد میرے قلب میں پلی تو ہے

غـــزل

میر تقی میرؔ کی روح سے معذرت کے ساتھ

نہ غم میں غم نہ خوشی میں خوشی لگے ہے مجھے　　یہ کس ڈگر پہ کھڑی زندگی لگے ہے مجھے
ترا ہی آوے ہے جب لب پہ نام آوے ہے　　مریض عشق کا وقت آخری لگے ہے مجھے
حریم دل میں کوئی آچھپا ہے ماہ تمام　　اندھیرے گھر میں پڑی چاندنی لگے ہے مجھے
ستم تو مجھ پہ کرو ہو کرم رقیبوں پہ　　یہی تو بات تمہاری بری لگے ہے مجھے
چمن میں فصل بہاراں کی دھوم ہے لیکن　　اداس اداس ابھی ہر کلی لگے ہے مجھے
کسی کے نام پہ دھڑکے ہے دل کیوں اے شاہیںؔ
کسی کے نام سے ربط خفی لگے ہے مجھے

ید بیضا

اف گھٹا ٹوپ اندھیروں میں یہ ڈوبی ہوئی رات — جگنو، کوئی تارا کوئی مہتاب نہیں
جیسے ناگن ہوں یہ لمحات سکوت شب کے — آسماں جیسے ہو اک بیوہ ابھاگن کی جبیں

جلوۂ نور یقیں ظلمت اوہام میں گم — خوگر ظلم وستم داعئ حق وانصاف؟
صبح کاذب پہ لبادہ سحر صادق کا — العجب پیر خرابات کو دعوائے عفاف؟

خوف و دہشت کا ہے عفریت مسلط سب پر — لوگ کہتے ہیں اندھیرے کو اندھیرا نہ کبھی
جیسے اب صبح کا چہرہ نہ کوئی دیکھے گا — ہوگا اس رات کی قسمت میں سویرا نہ کبھی

پھر بھی میں گردش حالات سے مایوس نہیں — ہے یقیں مجھ کو یہ ٹوٹے گا طلسم شب تار
ان اندھیروں سے اجالوں کی کرن پھوٹے گی — ذرے ذرے میں نظر آئے گی تنویر بہار

جھوٹ اک برف کی سل ہے یہ پگھل جائے گی — ظلم چڑھتا ہوا دریا ہے اتر جائے گا
حق و انصاف کا جب نور سحر پھیلے گا — خود وجود شب تاریک بکھر جائے گا

کتنے چہروں کے تقدس سے نقاب اترے گا — کتنے کھل جائیں گے معصوم فرشتوں کے گناہ
روز روشن میں حقیقت یہ نکھر جائے گی — قاتل شہر تھا، سمجھے تھے جسے شہر پناہ

چند تنکے جو بگولوں کی بدولت اڑ کر — رفعت چرخ پہ لہراتے ہیں اتراتے ہیں
یہ بلندی ہے بس اک پل کا تماشا اے دوست — رخ ہوا کا جو بدل جائے تو گر جاتے ہیں

وقت فرعون ہو مغرور و جفا کار بھی ہو — کس طرح ضرب عصا سے بھلا بچ پائے گا

جب بھی باطل کے اندھیروں کا تسلط ہوگا
کوئی موسیٰ ید بیضا لئے آجائے گا **(۹۷)**

(۳)
مولانا ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی چمپارنی

محمد صدرالحسن نام، مدنیؔ تخلص، والد کا نام محمد سلیمان۔ ۱۵؍فروری ۱۹۵۷ء میں بہار کے ایک مردم خیز گاؤں فاطمہ چک ضلع شیوہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ عربیہ ڈومری میں داخل کئے گئے۔ اور ۱۹۷۱ء تک وہیں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۷۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۸۰ء میں فراغت حاصل کی۔ اور وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا۔ اور چار سال تک وہاں رہ کر کلیۃ الشریعہ کے اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ اور قضاء کا کورس بھی مکمل کیا۔ مدینہ میں تعلیم کے بعد ہندوستان آئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے عربی زبان وادب میں ایم۔اے کیا۔ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

مولانا صدرالحسن ندوی بہت سے ملکوں کا سفر بھی کر چکے ہیں، بہت سے کانفرنس میں شرکت کر چکے ہیں اور بہت سے اداروں کے رکن اور عہدہ دار بھی ہیں۔

مولانا صدرالحسن ندوی خالص علمی اور تحقیقی مزاج کے باوجود شعری ذوق بھی رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں مہارت زبان، شوکت الفاظ، بلند پروازی، نازک خیالی، مرصع صنعت گری اور زبان وبیان کی سحر طرازی سب کچھ ہے، جو ایک اچھے شاعر کی خصوصیات تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کا شعری ذوق بہت اعلیٰ ہے۔ اور ان کا لہجہ بھی منفرد ہے۔ بچپن ہی سے شعروشاعری سے دلچسپی رہی۔ انہوں نے حمد، نعت، غزل اور نظم غرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مولانا مدنیؔ کا دیوان ''دیوان مدنیؔ'' کے نام سے مرتب ہو چکا ہے، جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ **(۹۸)**

نمونہ کلام پیش ہے ؎

متاع راز ہستی کون جانے کس طرح جانے
جنوں جب شب کو سوئے ہے تو فرزانہ جگا دے ہے

وصال یار کی خاطر ستم سہتا رہا برسوں
یہی کچھ اپنی دولت ہے جو بے گانہ بنادے ہے
نہ پوچھو کب بہار آئی خردمندوں کی محفل میں
خزاں جب یاں سے روٹھے ہے تو دیوانہ صدادے ہے
جفا جب اس کی طینت ہے تو آخر شکوہ کیا معنیٰ
وفائیں اپنی قسمت ہیں وہی مژگاں بہادے ہے
میری معصومیت فاش پردہ کردیا اسنے
نہ سرزد جس سے لغزش ہواسی کو وہ سزادے ہے **(۹۹)**

راحتیں آسائشیں رسوائیاں ہیں یہی آفاق کی شہنائیاں
ہم بڑھے منزل کی جانب اور پھر زور سے چلنے لگیں پروائیاں
قسمتیں جب پھوٹ پڑتی ہیں کبھی کام کچھ آتی نہیں دانائیاں
حسرت دل جان لیتی ہے مدام تنگ تھیں آلام کی پہنائیاں
فکر وفن مدنیؔ جہان اضطراب عیش غم تری کرم فرمائیاں

(۱۰۰)

جناب دل کی خاطر ہم ہمیشہ شاد رہتے ہیں مگر شاید ہی برسوں میں کوئی ان کا جواب آیا
تمازت ان کے چہرہ سے ٹپکتی ہے ہمیشہ یوں کہ جیسے شہر دل میں جھانک کر کوئی عذاب آیا
ہمیشہ تشنہ لب پھرتا رہا موجوں میں دریا کی عجب قسمت تھی حصہ میں وہی آخر سراب آیا
بدل کر بھیس مدنیؔ کوچہ جاناں میں آیا جب کہا مجنوں نے پھر آخر وہی خانہ خراب آیا

کتاب زندگی

کوئے خرد کا راز داں حال خرد پہ نوحہ خواں
فرط جنوں میں چار سو کہتا تھا اپنی داستاں
اک روز شاہ راہ پر مجھ سے ملا وہ ناگہاں

کہنے لگا کہ ایک شب کشتی تھی نور کی رواں
اس پر سوار ایک شخص شاید تھا میر کارواں
فکر و نظر کے دوش پر آیا وہ سوئے بادباں
نظر نواز خوش گلو رواں دواں رواں دواں
عزم جواں کا حال سن دے رہا تھا وہ اذاں
غم سے نڈھال جسم میں سرتا بہ پا فقط فغاں
غم کی کلی تھی کھل گئی کھل کر ہوئی وہ گلستاں
کھل گیا جو راز تھا کچھ بھی نہیں رہا نہاں
دل کے زخم ہو گئے آنسوؤں میں پھر رواں
ہجر کے وصال پر زندگی کا تھا گماں
راہ وفا کی لذتیں مو بہ مو رواں رواں
میں نے کہا بہ چشم نم طول نہ دے یہ داستاں
راز حیات فاش کر اس کو بنا نہ چیستاں
تیرے قیام کی نمود تیرے سجود کا فغاں
کلک قضا کے اشک سے کیونکر بنی وہ کہکشاں
اس نے کہا قیام یہ رقصاں ہوں ترے درمیاں
اس نے کہا سجود یہ نوحہ گری پہ شاد ماں
اس نے کہا کہ زخم دل پاس وفا کا پاسباں
اس نے کہا یہ نکتہ سن جھوٹی نہیں یہ داستاں
تیرا تو میں قتیل ہوں تو ہی رہا کشاں کشاں
آخر ہوا وہ راز فاش دیر وحرم کے درمیاں
سن کر یہ سب حکایتیں حیراں ہوئے سخنوراں
غربت کدہ کی لاش پر برق ستم تھی مہرباں

ان کا گمان بھی یقیں اپنا یقین بھی گما
میں نے کہا لٹا کے سب آیا ہوں تیرے درمیاں
سن کر ہوا وہ شرمسار آہ و بکا تھی ضوفشاں
آہ وبکا سے جاں بہ لب کہنے لگا اماں اماں
قلب ونظر بہم ہوئے دیدنی تھا وہ سماں
مژگاں کے تیر چبھ گئے کیونکر کہوں کہاں کہاں
بات پھر ٹھہر گئی چشم و دہن کے درمیاں
وہ خود ہی آگئی قریب بوئے وفا تھی پرفشاں
اشک اور رشک سے لذت وصل تھی عیاں
دُرد قرار پیتے ہی مل گئی عمر جاوداں
باد صبا تو آئی کب بن کے چمن کی بوستاں
چپکے سے کہدوں تجھ سے میں کل ملا تھا کون واں
وہ تھی کتاب زندگی لکھوں وہاں پڑھوں یہاں
جب تک نہ یہ کتاب ہو ہر بہار ہے خزاں
لیکن خرد کی بزم میں کہتے ہیں اس کو چیستاں
مدتی ہوس کے دور میں عام نہ کر یہ داستاں

(۱۰۲)

''سیکس ایجوکیشن'' کے پس منظر میں ایک آزاد نظم ملاحظہ ہو ؎

تمہارے شہر خوباں میں
خم وساغر چھلکتے ہیں
کبھی یادیں بھی آخر شب
لٹاتی نکہتیں گزریں
تخیل نے سرشک کتخدا کو

پر پرواز دے کر بھی اڑایا
شفق گرداب میں
موج قبا کی
دبے پاؤں بہ صد آداب اتری
تلاش علم وفن میں
گلکدہ تک
بڑھے تیزی سے فرقت کے یہ مارے
جو نسخہ ہاتھ آیا ''دلبری'' کا
اسی کو درد کا درمان سمجھا
وہی اَ خگر بنی وجہ تسلی
کبھی اس پہ بٹھائے پہرے دل کے
کبھی خوں سے کبھی اشکوں سے سینچا
بھلا دی قدر و قیمت علم وفن کی
ہلاہل زہر کو یوں قند سمجھا
لگی کشتی کنارے فکر وفن کی
درناسفتہ کی قسمت جو پھوٹی
فراز ناز کے یخ بستہ لب کی
کمند آرزو یک لخت ٹوٹی
اسی لمحہ اٹھی مدھم سی آواز
جگر کو پار لیکن کر گئی وہ
بہت کچھ ہم سے تم سے کہہ گئی وہ
تمہارے کب تلک
ہر جا ہمیں سے

ہمارے شہرِ خوباں میں
خم و ساغر بھی چھلکیں گے (۱۰۳)

مزید متفرق اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

محبت کی زمیں ویران ہے مدت سے انساں کی
وہ دریا ہے مگر اپنی روانی بھول بیٹھا ہے

ہمارے زخم دل کو ہے ضرورت ایک مسیحا کی
سمجھ لے وہ زہے قسمت تو شاید بات بن جائے

تلاطم، بحر ہستی، ناوک بے داد اور کشتی
متاع دل کی ہو قیمت تو شاید بات بن جائے

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے
(۱۰۴)

(۴)
مولانا محمد ہارون قمر ریاضی قمؔر چمپارنی

محمد ہارون نام، قلمی نام قمر ریاضی، قمؔر تخلص۔ (ریاضی مادر علمی مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی سے منسوب ہے)۔ والد کا نام صداقت حسین شاہ مرحوم پیدائش ۲/۱کتوبر ۱۹۴۸ء۔ مقام پیدائش موضع کٹھری، تھانہ ساٹھی اور ضلع مغربی چمپارن ہے۔ ابتدائی تعلیم کافیہ تک مدرسہ ریاض العلوم میں حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک دارالعلوم دیوبند میں اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۶ء تک دارالعلوم عربک کالج میرٹھ شہر میں حاصل کی۔ اور یہیں سے ۱۹۶۶ء میں فراغت حاصل کی۔

۱۹۶۸ء سے بڑی مسجد چنپٹیا ضلع مغربی چمپارن میں امام و خطیب کی حیثیت سے خدمت انجام دے

رہے ہیں۔مشاعروں میں شرکت اور جلسوں کی نظامت کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

قمؔر ریاضی ۱۹۶۵ء سے شعروشاعری کرتے ہیں۔انہوں نے علامہ ظفؔر جنکپوری،جمیل میرٹھی اور ساجن بہاری سے مشورہ سخن لیا۔ان کے نعتیہ کلام کا گلدستہ ''جمال طیبہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔جب کہ ضیائے قمر زیر ترتیب ہے۔

قمؔر ریاضی کی شاعری میں سلاست اور برجستگی ہے، ساتھ ہی مشرقی ادب کا گہرا مطالعہ بھی رکھتے ہیں،ان کی شاعری میں جس کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

غزلیات

ہم آج زمانے کو پیغام وفا دینگے ہر جبر تشدد کی دیوار گرادینگے
ظالم کی عزائم کو مٹی میں ملا دینگے ہم قیصروکسریٰ کے ایوان ہلا دینگے
باطل کو مٹائیں گے ہم سر بکف ہوکر سوتی ہوئی دنیا کو غفلت سے جگا دینگے
جو عہد سیاست میں چنگیز وہلاکو ہیں ان وحشی درندوں کو دنیا سے مٹا دینگے
قاتل بھی وہی نکلے جو خضرومسیحا ہیں ان اہل تشدد کو بھرپور سزا دینگے
ہم نے ہی لہو دے کر گلشن کو سنوارا ہے اس پر بھی ستمگر کیا اب ہم کو سزا دینگے
خود مصلحتاً ہم نے سی لی ہے زباں اپنی اے ظالمو! ہم کیا ہیں ہم تم کو بتا دینگے
نفرت کی جو چنگاری ہر دل میں سلگتی ہے بن جائے نہ وہ شعلہ ہم اس کو بجھا دینگے
اک جشن بہاراں پھر گلشن میں قمؔر ہوگا ہر دل میں محبت کی ہم شمع جلا دینگے

ہو ذوق یقیں پیدا ملت کے جوانوں میں توحید نظر آئے باطل کے گھرانوں میں
وہ سوز جگر پیدا ہو شعلہ بیانوں میں جو آگ لگا ڈالے یخ بستہ چٹانوں میں
تقدیر ہر سرمایہ ہر مرد مسلماں کا دولت یہ نہیں ملتی جیوتش کی دکانوں میں
اغیار کے دل جس کو سن سن کے دہل جائیں وہ سوز خدا یاد دے پھر آج اذانوں میں
اے ظالمو! ہم کیا ہیں یہ وقت بتائے گا مستور ابھی ہیں ہم خاموش فسانوں میں

اس شوخ ستمگر کو اک روز سنانا ہے — اپنا بھی فسانہ ہے دنیا کے فسانوں میں
اونچی ہے ملائک سے پرواز قمرؔ اپنی — معراج خودی حاصل ہوتی ہے اڑانوں میں

ستا ستا کے نزاکت بڑھائے جاتے ہیں — وہ میرے دل کو میرا دل بنائے جاتے ہیں
شب فراق جو آنسو بہائے جاتے ہیں — وہ کائنات محبت بتائے جاتے ہیں
نہ جانے کب کٹے گی یہ عشق کی منزل — قدم قدم پہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
وہ ایک میں ہوں کہ دست طلب بڑھاتا ہوں — وہ ایک آپ ہیں دامن بچائے جاتے ہیں
ستم شعار کو اس کی خبر نہیں شاید — کہ حوصلے بھی محبت میں پائے جاتے ہیں
کبھی تو کان کھلیں گے فسانہ غم سے — سنیں سنیں نہ سنیں ہم سنائے جاتے ہیں
مجھے نصیب ہے نسبت تمہارے جلوؤں کی — قمرؔ میں حسن کے انداز پائے جاتے ہیں

کون جلوہ نماں ہوگیا — دل کو روشن دیا ہوگیا
بے وفا باوفا ہوگیا — سونچتا ہوں یہ کیا ہوگیا
ان کا جب سامنا ہوگیا — زخم دل کا ہرا ہوگیا
ان کے کوچے میں ہم کیا گئے — ایک محشر بپا ہوگیا
جان ودل جس پہ صدقے کئے — وہ ستمگر خفا ہوگیا
میری میت پہ وہ آگئے — ان کا وعدہ وفا ہوگیا
ٹوٹ کر شیشہ دل میرا — شکر ہے کام کا ہوگیا
سجدۂ بندگی ہے وہی — جو جنوں میں ادا ہوگیا
چھوڑ کر بادہ نوشی قمرؔ — آج سے پارساں ہوگیا

قصہ تمام ہوتو گیا زندگی کے بعد — آئی تو موت مجھ کو مگر بے کسی کے بعد
گلچیں ذرا فضائے چمن کا خیال کر — غنچے چٹک سکیں گے نہ افسردگی کے بعد

یہ وسعت یقین بھی کتنی بلند ہے — دنیا کا غم نہیں ہے مجھے آگہی کے بعد
ظالم میں ہاتھ اٹھا کے تجھے کوستا نہیں — سن لی میری خدا نے اگر عاجزی کے بعد
میں نے بھی اپنے صبر کو حد سے لگا دیا — مئے ہوگئی حرام مجھے تشنگی کے بعد
تیور بدلنے والے ذرا اتنا سوچ لے — زندہ نہ رہ سکوں گا تیری برہمی کے بعد
میں خود بھی اپنے آپ کو پہنچانتا نہیں — کیا حال ہوگیا ہے میرا بے خودی کے بعد
میں نام کا قمرؔ ہوں میری کیا بساط ہے — دیکھے گا کون مجھ کو تیری روشنی کے بعد

(۱۰۵)

(۵)

مولانا وارث حسن وارثؔ ریاضی چمپارنی

وارث حسن نام، قلمی نام وارث ریاضی، وارثؔ تخلص۔ والد کا نام شیخ محمد اسمٰعیل۔ تاریخ ولادت ۲؍اکتوبر ۱۹۴۹ء جائے ولادت سکٹا (دیوراج) مغربی چمپارن ہے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم بسوریا مغربی چمپارن میں حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر ۱۹۶۵ء میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی میں استاد کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ۱۹۷۱ء میں مدرسہ اشاعت العلوم جوگیا مغربی چمپارن میں استاد کی حیثیت سے بحال کئے گئے۔ ۱۹۸۴ء میں بہار یونیورسیٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔

زمانہ تعلیم سے ہی شعر وشاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مولانا سید نظام الدین، مولانا قمر عثمانی دیوبندی، الم مظفرنگری اور ماہرالقادری سے مشورے سخن لے کر اپنی شاعری میں خوداعتمادی پیدا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور علامہ ناوکؔ حمزہ پوری نے بھی ان کی تربیت کی۔

وارثؔ ریاضی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ علامہ ناوکؔ حمزہ پوری تحریر کرتے ہیں:

''شاعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اردو کے شانہ بہ شانہ فارسی پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ چند نامور شعراء جن میں غالبؔ، میر تقی میرؔ، علامہ اقبالؔ، حضرت مولانا ماہرالقادری، الم مظفرنگری، حفیظ جالندھری، فانی بدایونی، جگن ناتھ آزاد، جگر مرادآبادی، ساحر لدھیانوی اور حفیظ

بنارسی وغیرہ شامل ہیں، کے افکار و اسلوب کے زیر سایہ بھی اپنی جولانی طبع اور قوت تخلیق کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور کہنا چاہئے کہ کامیاب مظاہرہ کیا ہے۔

غزل کی صنفی خصوصیات کے شان بہ شانہ شاعر کے جن خیالات نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کی پرُ گوئی بھی ہے۔ تخلیقی وفور کا یہ عالم ہے کہ گویا دریا کا بہاؤ یا کوئی پہاڑی آبشار جو اچھلتا، کودتا بہتا جاتا ہے۔ کبھی تیز گام، کبھی نرم سیر، لیکن رکنے کا نام نہیں لیتا۔ سبحان اللہ! ایسا تخلیقی وفور دیکھ کر میرؔ کی زبان میں داد دینا پڑتی ہے۔

شعر وارثؔ سے سنے کوئی زبانی اس کی
"اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی"

(۱۰۶)

وارث ریاضی کی چند غزلیں پیش ہیں ؎

تبسم کی ادائے دل نشیں سے — بنے ہیں لاکھ افسانے یہیں سے
جہاں سے تم نظر آتے نہیں ہو — تمہیں دیکھا کئے ہیں ہم وہیں سے
نہ جانے کیوں الجھ کر رہ گئے ہم — تری پُر پیچ زلف عنبریں سے
بلندی عشق کی کیا پوچھتے ہو — اثر اس کا فلک تک ہے زمیں سے
شب غم دل دھڑکنے کا وہ عالم — کوئی آواز دے جیسے قریں سے
انہوں نے آستاں کی لاج رکھ لی — جو سجدے ہوگئے میری جبیں سے
نہ تم چھیڑو شب فرقت کی باتیں — جناب وارثؔ اندوہ گیں سے

جہاں جلوہ حسن ہم دیکھتے ہیں — وہاں عشق کو سر بہ خم دیکھتے ہیں
وفور محبت کے عالم میں ہرسو — تمہیں ہم تمہاری قسم دیکھتے ہیں
تری یاد سے خاص نسبت ہے جن کو — خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
ہوا کس قدر خودغرض آج انساں — کہ خوے وفا اس میں کم دیکھتے ہیں
غم زندگی کی حقیقت کو شاید — بصیرت سے ارباب غم دیکھتے ہیں

جدھر وہ ادھر محو رقص تبسم — چمن کی بہاروں کو ہم دیکھتے ہیں
زہے بخت بیدار وارثؔ ریاضی — کہ گھر میں کتاب وقلم دیکھتے ہیں

سماں ہے بہاروں کا ٹھنڈی ہوا ہے — مگر دل سے غم کا دھواں اٹھ رہا ہے
کہاں جائے؟ کس کو پکارے وہ آخر؟ — جسے اک ترے نام کا آسرا ہے
نگاہوں میں رقصاں ہے تیرا تصور — جدھر دیکھتا ہوں، ترا نقش پا ہے
خرد مصلحت کیشیوں میں ہے حیراں — جنوں راہ غم میں اسیر بلا ہے
سکوں دل کو ملتا ہے تیری خوشی میں — کہ تیری رضا میں خدا کی رضا ہے
زمانے کی نظروں سے بھی گر گیا وہ — جو اک بار تیری نظر سے گرا ہے
نہ دل میں چبھن ہے نہ آنکھوں میں آنسو — یہ کیا درد ہجراں ہے؟ کیسی جفا ہے؟
برائی کا بدلہ برائی ہے لیکن — بھلائی میں انسانیت کا بھلا ہے
جسے میں نے سینچا محبت سے وارثؔ — وہ میرے لئے اجنبی بن گیا ہے

(۱۰۷)

نہ لفظوں میں بیاں ہونا، نہ آنکھوں سے عیاں ہونا — کمال عشق ہے اسرار الفت یوں نہاں ہونا
نمود ایسی کہ ہم دوش فراز کہکشاں ہونا — نہاں کچھ اس طرح ہونا کہ بے نام ونشاں ہونا
کریں وہ نالہ غم سے بہار جاوداں پیدا — عبث ہے گوشۂ زنداں میں فکر آشیاں ہونا
کہانی قیسؔ کی درد زباں دنیا میں ہے لیکن — مرے درد محبت کو نہ آیا داستاں ہونا
جہان عشق میں غم کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا — یہاں بے سود ہے اندیشہ سود وزیاں ہونا
مرے چہرے میں پڑھ لیں میری بربادی کا افسانہ — کہ مشکل ہے زباں سے داستان غم بیاں ہونا
تو اے سیلاب غم رہنا سمٹ کر دیدہ ودل میں — عیاں ہونا تو پھر وسعت میں بحر بے کراں ہونا

(۱۰۸)

(۶)
مولانا محمد شفیع الرحمن شفیعؔ

محمد شفیع الرحمن نام، شفیعؔ تخلص، تاریخ پیدائش ۹/ اگست ۱۹۵۲ء آبائی وطن موضع بسہا ضلع مدھوبنی۔ تعلیم فاضل بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ (گولڈ مڈلسٹ) ایم۔اے۔ (انگریزی و فارسی) ، پٹنہ یونیورسٹی۔ ملازمت: (۱) کسٹوڈین، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (۱۹۷۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء (۲) محمڈن اینگلو عربک سینیر سکنڈری اسکول، پٹنہ سیٹی (یکم اپریل ۱۹۸۱ء تا ۳۱ اگست ۲۰۱۲ء) کتابیں: توضیحی فہرست مخطوطات عربی و فارسی، جلد ۳۴، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری (معاون مدیر)، ہفتہ وار جائزہ، بہار ایجوکیشن پروجیکٹ، پٹنہ، مدرسہ ماہی انوارِ مخدوم، بہار شریف کے علاوہ ریڈیو ٹاک، ٹی وی پروگروم اور کئی میگزین، سووینیر، اور گلدستوں کے مدیر۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کرتے ہیں۔ حمد، نعت، غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مستزاد اور نظموں کے کئی مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

متاعِ دہر ہے دھوکا، رہے، رہے، نہ رہے! ہمارے ساتھ یہ دنیا رہے، رہے، نہ رہے!
غزل سرائی تقاضا ہے وقت کا مطرب نسیمِ صبح تمنا رہے، رہے، نہ رہے!
نوائے درد کی خاطر ہے گوشِ دل لازم نظر نہیں تو تماشا رہے، رہے، نہ رہے!
نظر نواز نگاہوں میں کیف کا عالم صراحی، جام، یہ صہبا رہے، رہے، نہ رہے!
جہاں ہے ربط و تفاعل کی انجمن پیارے سبھی سے دور جو تنہا رہے، رہے، نہ رہے!
ابھی ہے گرمِ سخن بزم، دل کی کہ، سن لے کہیں کل آج کے جیسا رہے، رہے، نہ رہے!
شباب، حسن، زر وسیم بے وفا ہوتے غرور ان پہ ہے بے جا، رہے رہے، نہ رہے!
ملو گلے کہ کرے دل سے دل ذرا باتیں کہیں کل اپنا سراپا رہے، رہے، نہ رہے!
تمھارے ساتھ ہے دنیا، یہ وہم ٹوٹے گا شفیعؔ زعم یہ جھوٹا رہے، رہے، نہ رہے

بڑا پیچیدہ و نازک ہے اک اک مرحلہ دل کا
خرد سے کب ہوا ہے حل کوئی بھی مسئلہ دل کا

تہ و بالا متاعِ عیش وعشرت پل میں ہو جائے
قیامت خیز ہے تن کے لیے ہر زلزلہ دل کا

جہاں حکمت، تدابیر اور منصوبے نہ کام آئیں
وہاں اک جست میں فاتح ہوا ہے ولولہ دل کا

نرالی ہیں ادائیں ٹوٹنے، جڑنے، بکھرنے کی
عجب بے صوت ہوتا ہے ہمیشہ غلغلہ دل کا

تماشا دیکھ لے تو اپنے بسمل کا مرے قاتل!
نکلتا کس ادا سے ہے مکمل حوصلہ دل کا

بہت مشکل ہے مد و جزر کا اظہار و تجزیہ
خموشی سے تلاطم خیز ہوتا مشغلہ دل کا

سرِ مقتل نشاط افزا عروجِ زیست کا عالم
بلندی دار کی دیتی ہے سر کو حوصلہ دل کا

زمانے میں ہمیشہ سے سبھی اس کے مخالف ہیں
مگر پروا نہیں کرتا کسی کی، فیصلہ دل کا

سفر پر عزم تھا، اب سامنے آتی نظر منزل
شفیعؔ اس حال میں پھٹنے نہ پائے آبلہ دل کا

(۱۰۹)

(۷)
مولانا حکیم سید افضل حسین قاسمی دربھنگوی

سید افضل حسین نام، افضلؔ تخلص، والد کا نام والد کا نام سید محمد انس۔ تاریخ پیدائش ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء۔ جائے پیدائش موضع قاضی بہاری، تھانہ جالہ، ضلع دربھنگہ ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا۔ اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے قلمی پرچہ افکار کے مدیر ایڈیٹر رہے۔ اور وہیں سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ اردو میں ایم۔ اے میسور یونیورسیٹی سے کیا۔ اور فاضل ادب کی سند اردو بورڈ علی گڑھ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اور فی الحال بنگلور میں پریکٹس کرتے ہیں۔ سماجی، تعلیمی اور رفاہی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ مختلف تنظیموں کے ممبر ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مدعو خصوصی ہیں۔ مختلف اداروں سے ایوارڈ یافتہ بھی ہیں۔

حکیم افضل حسین علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے گھر میں شعر و شاعری کا چرچا ہمیشہ رہا۔ مولانا ابوالخیر رحمانی جید عالم اور استاد شاعر تھے۔ ان کی وجہ سے ان کے گھر میں شعر و شاعری کا ماحول ہمیشہ سے رہا۔ حکیم افضل حسین نے بھی اس سے فائدہ حاصل کیا۔ اور بچپن ہی سے

شعروشاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔ان کے کلام میں ایک اچھے شاعر کی خصوصیت پورے طور پر موجود ہے۔کلام میں فکر بھی ہے اور فن بھی۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

میں کبھی عظمت کردار نہیں دے سکتا	سر تو دے سکتا ہوں دستار نہیں دے سکتا
کاٹ لے بازو مرے توڑ دے دندان مگر	یہ انا کی ہے جو تلوار نہیں دے سکتا
ہار جاؤں میں اگر جنگ، میری قسمت ہے	نور ایمان کا ہتھیار نہیں دے سکتا
میرے سرکار کی توصیف لکھی ہو جسمیں	میں کباڑی کو وہ اخبار نہیں دے سکتا
مال و زر سے مجھے للچانہ، کسی عہدے سے	قوم و ملت کے میں اسرار نہیں دے سکتا
بس محبت مری پہچان، مرا ہے شیوہ	میں کسی دل کو بھی آزار نہیں دے سکتا
میری محراب میں ترشول سجانے والو	سجدہ گاہ شہ ابرار نہیں دے سکتا
ہیں خریدار بہت میری زبان کے لیکن	ندرت شوخئ گفتار نہیں دے سکتا

میں جب بھی کچھ بولوں گا	بات کو پہلے تولوں گا
دل جب دکھ سے بھر جائے	بیٹھ کے جی بھر رولوں گا
نیند کہاں اب آئیگی	قبر میں جا کے سولوں گا
دوست نہیں کوئی اپنا	راز کبھی نا کھولوں گا
داغ گناہوں کے اپنے	توبہ کر کے دھولوں گا
بدنامی تیری خاطر	خوش ہو کر میں ڈھولوں گا
چیز جو اچھی مل جائے	ایک نہیں میں دو لوں گا
دل کی چاہت سے افضل	جو دو گے میں وہ لوں گا

مرے خوابوں کی ہے تعبیر زیادہ	عمل کچھ بھی نہیں تقریر زیادہ
مرے دل پہ لگے ہیں تیر زیادہ	دوا کی بھی کرو تدبیر زیادہ

صدا چوکھٹ پہ تیری سر جھکاؤں — اسی میں ہے مری توقیر زیادہ
نگاہیں بھر کے جب سے ان کو دیکھا — مری آنکھوں میں ہے تنویر زیادہ
بھٹک جاتا ہے سیدھی راہ سے جو — اسے لازم ہے رکھے پیر زیادہ
بھروسہ زندگی کا جب نہیں ہے — تو گھر کیسے کروں تعمیر زیادہ
اشاروں سے مرے لاشیں گری ہیں — چلائی میں نے کب شمشیر زیادہ
نگاہ مردمومن سے اب افضلؔ — بدلتی ہے کہاں تقدیر زیادہ

(۱۱۰)

(۸)
مولانا سہیل احمد قادری سہیلؔ پیغمبر پوری

سہیل احمد قادری نام، سہیلؔ تخلص، ولد حاجی محمد اسرائیل کی ولادت یکم جولائی ۱۹۴۹ء کو آبائی بستی رام پور، ڈاک خانہ بھگوان پور، ضلع سیوان میں ہوئی۔ پرورش و پرداخت نانیہال موضع پیغمبر پور، چھپرہ میں ہوئی، بعدہ آبائی گاؤں کی سکونت ترک کر کے نانیہالی موضع میں بودوباش اختیار کر لی۔

موصوف نے فاضل درس نظامیہ وعالیہ کے ساتھ بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ، پٹنہ سے میٹریکولیشن کی سند حاصل کی۔ پیشہ وارانہ مشغولیت کے تحت بحیثیت مدرس، مدرسہ اسلامیہ محی العلوم، سیوان سے منسلک ہیں اور محلہ اسمٰعیل شہید کالونی میں رہائش گزیں ہیں۔

سہیل پیغمبر پوری نیک خصلت، صاحب شعور، مسلک سنت کے راسخ العقیدہ عالم، مقرر اور خوش طبع وخوش گلو شاعر ہیں۔ اصناف شاعری میں نعت، غزل، نظم پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آغاز میں تلمذ کا شرف اصغر سیوانی سے حاصل تھا۔ ان کی وفات کے بعد قمرؔ سیوانی ان کے استاد ہیں۔ تخلیقات مختلف جرائد میں شائع ہوتی ہیں اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کی اردو سروس سے کلام نشر ہوتا ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

جن چراغوں سے محبت کا اجالا نہ بڑھے — ان چراغوں کو سر شام بجھایا جائے

آنچ آئے نہ کبھی شان قناعت پہ سہیلؔ　　پاؤں چادر کے مطابق ہی بڑھایا جائے

ہم سے بہار گلشن ہستی کا ہے وجود　　ہم سے بچھڑ کے آپ کریں گے گذر کہاں
شاہین سے بھی تیز رہی ہے مری اڑان　　آزاد میرے رکھے گئے بال و پر کہاں

کریں گے وہ مجھے کیسے گوارہ؟　　کھٹکتی ہے جنھیں میری زباں تک
بڑا ابتر زمانہ آگیا ہے　　فریبی ہو گئے پیر مغاں تک

ہائے رے قسمت کس دنیا میں تونے لا کے چھوڑ دیا　　جور و جفا راج جہاں ہے اور وفا کے دعوے ہیں
جس نے چمن کو اپنے لہو سے سینچ کے لالہ زار کیا　　اس لئے سو قسم کی باتیں اور ہزاروں شکوے ہیں
سوئے رہو گے کب تک جاگو! آنکھیں کھولو، دیکھو تو　　آج اجالوں کی بستی میں تاریکی کے ڈیرے میں
کل تک نغمے سننے والو! تاب شنیدن ہو تو سنو　　آج سہیلؔ اہل وفا کے لب پہ فغاں ہیں نالے ہیں

جذبات میرے اشک کے سانچے میں ڈھل گئے　　اچھا ہوا غبار تمنا نکل گئے
جو سایہ دار پیڑ تھے گلزار امن میں　　ان پیڑوں کو فساد کے موسم نگل گئے
کچھ اس ادا سے چھلکے ہیں پیمانے صبر کے　　ہم جیسے تشنہ کاموں کے بھی کام چل گئے
ان لوگوں میں شمار ہمارا نہ کیجئے　　مشکل مین جن کے پختہ ارادے بدل گئے
کی رہنمائی جن کی خرد نے قدم قدم　　وہ وقت کے فریب سے بچ کر نکل گئے
یہ تو سہیلؔ چشم وفا کا کمال تھا　　ہم گرتے گرتے راہ وفا میں سنبھل گئے

(۱۱۱)

(۹)
مولانا سراج الحق سراج نادرؔ چھپروی

سراج الحق نام، سراج نادر قلمی نام، نادرؔ تخلص۔ والد کا اسم گرامی محمد سلیمان۔ چھپرہ شہر

سے ۱۶ ر کیلومیٹر شمال مغرب جانب واقع موضع انول میں ان کی ولادت ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ انجمن پرائمری اسکول، رسڑا ضلع ہگلی (مغربی بنگال) اور جامعہ شمسیہ تیغیہ، بڑہریا، ضلع سیوان سے ابتدائی تعلیم ہوئی۔ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور سے فضیلت اور بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے فاضل اردو کی سند فراغت کے بعد بہار یونیورسیٹی مظفر پور سے ایم۔ اے (اردو) اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔

ہمدرد پبلک اسکول دہلی میں تدریسی خدمات سے وابستہ رہے۔ دسمبر ۲۰۰۶ء سے ایم۔ ڈی ہائی اسکول، کنھولی، بنیاپور، چھپرہ میں اردو کے استاد مقرر ہوئے ہیں۔

سراج نادرؔ نے ۱۹۸۶ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ بہت دنوں تک نادرؔ رضوی کے نام سے ان کی تخلیقات رسالہ آج کل، عہد نو، گلبن، توازن، کوہسار و دیگر رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہیں آل انڈیا ریڈیو، دہلی اور ٹیلی ویژن پر بھی کلام پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے ہم نشینوں میں انہیں امتیازی درجہ حاصل ہے۔ کلام میں جذبے کی صداقت، زبان و بیان میں لطافت اور فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ خیالات میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سراج نادرؔ غزل کے علاوہ نعت پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نعتیہ شاعری میں ان کا طرز کلام جدیدیت سے ہم آہنگ ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

میں اپنے آپ کو اب اس طرح سزا دوں گا　　ملوں گا تم سے نہ اپنا کوئی پتا دوں گا

کوئی منزل نظر نہیں آتی　　کس مسافر کی بد دعا ہوں میں

ہر بلندی سے نوازے گا مجھے بھی لیکن　　اوج پر میرا مقدر نہیں ہونے دے گا
مکاں اور لان کی وسعت کی خاطر　　پڑوسی پھر مرا گھر مانگتا ہے

خود مجھے اب اس کی شخصیت سے دل چسپی نہیں　　اس کے ہونٹوں سے بھی اب حرف دعا غائب ہوا

اب نہ وہ برگد کا سایہ، اب نہ وہ ساحل کی ریت　　اس سے ملنے جلنے کا بھی سلسلہ غائب ہوا
جس پتے پر میں کبھی ملتا تھا اپنے آپ سے　　دوستوں کی بھیڑ میں وہ بھی پتا غائب ہوا

یہ گاؤں، محلہ، یہ نگر کاٹ رہا ہے　　گھر جاؤں تو لگتا ہے کہ گھر کاٹ رہا ہے
جی میں یہی آتا ہے کہ جنگل میں رہا جائے　　اب شہر میں مجھ کو تو بشر کاٹ رہا ہے
رستے سے پلٹ آتی ہیں سب میری دعائیں　　یہ کون دعاؤں کا اثر کاٹ رہا ہے
ہاں وقت کے تیشے سے میری عمر کو نادرؔ　　لگتا ہے کوئی شام وسحر کاٹ رہا ہے

سمندر دھوپ، صحرا دے دیا ہے　　مرے حصے میں کیا کیا دے دیا ہے
کوئی طوفان ہے اب آنے والا　　ہواؤں نے اشارا دے دیا ہے
سبھی منزل ہماری پوچھتے ہیں　　ترے گھر کا حوالا دے دیا ہے
ہوا، پانی وسائل سلب کرکے　　مجھے سوکھا جزیرا دے دیا ہے
ستم گرنے کسی اک اجنبی کا　　مرے ہاتھوں میں چہرا دے دیا ہے
جسے سب دیکھتے ہیں بے دلی سے　　وہی نادرؔ رسالا دے دیا ہے

(۱۱۲)

(۱۰)

مولانا حشمت رضا ساحلؔ

حشمت رضا نام، ساحلؔ تخلص، والد کا نام محمد سعید الدین خاں۔ ساحلؔ ضلع گوپال گنج کے موضع بست پور، تھانہ میر گنج کے رہنے والے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۲؍اگست ۱۹۸۱ء کو ڈمرو، سیونڈیہہ (بوکارو) میں ہوئی۔ مدرسہ حنفیہ غریب نواز، سیونڈیہہ سے فاضل اردو کی سند حاصل کی۔ فی الحال اسی ادارہ کے شعبہ کمپیوٹر میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات روزنامہ راشٹریہ سہارا کے علاوہ دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتی ہیں۔

ساحلؔ شعروشاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے کلام پر طاہر حسین طاہرؔ اور قمرؔ سیوانی سے اصلاح

لیتے ہیں۔ان کے کلام میں پختگی اور برجستگی ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

منصب انسانیت کی لاج رہ جاتی جناب بات بھی کرتا اگر آپس میں کھل کر آدمی

میں سچائی کو جب بھی لکھنا چاہوں ضمیر اپنا ہمیشہ روکتا ہے

ایک انگشت کا ہے مشورہ مل جل کے رہو زور بڑھ جاتا ہے جب چار سے مل جاتے ہیں

یزید وقت، وہی شخص بن کے آئے گا ابھی کے دور میں جو معتبر لگے گا تمہیں

بات کرتے ہوئے محفل میں سلیقہ رکھیے اپنے اسلاف کا کچھ طور طریقہ رکھیے
ساتھ دیتا ہے یہاں کون کسی کا ساحلؔ حوصلہ اپنا ہر اک گام پہ بالا رکھیے

جو شخص نہیں گردش ایام سے واقف واقف ہے نہ خوشیوں سے نہ آلام سے واقف
انجام کو معلوم ہے آغاز کا قصہ آغاز کہاں ہوتا ہے انجام سے واقف

نئی فکر و نظر کے زاویے میں نہ کھو جاؤں ردیف و کافئے میں
یہ کیسی ضد ہے متن و حاشیے میں الٹ جاتی ہے صورت آئینے میں
کبھی ماں باپ کو اُف تک نہ کہنا رہو ہر دم ادب کے دائرے میں
فقیروں کو سمجھنا غیر ممکن چھپا رکھا ہے کیا کیا بوریے میں
ہر اک پہلو سے پہلے سوچ لینا کبھی جلدی نہ کرنا فیصلے میں
کمی اپنی نظر آتی کہاں ہے جھلکتی ہے خرابی دوسرے میں (۱۱۳)

(۱۱)

مولانا انور حسین انورؔ

انور حسین نام، انورؔ تخلص، والد کا نام حاجی محمد ہاشم امین۔ تاریخ ولادت ۳؍اگست ۱۹۷۱ء۔ آبائی وطن موضع گاڑھا، ضلع سیتامڑھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عزیزیہ خزینۃ العلوم پوپری، ضلع سیتامڑھی میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۸۰ء میں مدرسہ اشرف العلوم کنہواں میں داخلہ لیا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم مئو اور ۱۹۸۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۸۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد مختلف اداروں میں درس وتدریس اور ناظم تعلیمات کے حیثیت سے کام کیا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں ابھی جامعہ عربیہ دارالعلوم گاڑھا، ضلع سیتامڑھی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا انور حسین انورؔ زمانہ تعلیم علمی سے شعروشاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار کا مجموعہ ''بعد نسیم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو حمد، نعت، مراثی، نذرانہ عقیدت، نظم اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انورؔ مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کا فن جانتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام اصناف کا مزاج الگ الگ ہے۔ اور صنف کے تقاضے دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن انورؔ ان تمام تقاضوں کا پورے پورے طور پر خیال رکھتے ہیں۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

ہم نوا کوئی نہیں ہے ہم زباں کوئی نہیں — میرا اپنا اس جہاں میں رازداں کوئی نہیں
ہے بسیرا اپنا یارب دھوپ کے سایہ تلے — اس جہان رنگ وبو میں سائباں کوئی نہیں
میں اکیلا جارہا ہوں منزل مقصود تک — ہم سفر کوئی نہیں ہے کارواں کوئی نہیں
کس کو اب جا کر سنائیں درد دل کی داستاں — پہلے کچھ احباب تھے اب تو یہاں کوئی نہیں
اس چمن کے بام ودر سے دل لگا کر کیا کروں — ہر کوئی غمگیں ہے اس میں شادماں کوئی نہیں
ہم نشیں میرا شریک غم نہیں ہے کیا کروں — مجھ سا محروم خلوص دوستاں کوئی نہیں
اپنے دل کی بات انورؔ کس سے جا کر میں کہوں — اس جہاں میں محرم درد نہاں کوئی نہیں

گلشن یہ اب تو اشک بہانے کا وقت ہے اجڑے چمن کو پھر سے سجانے کا وقت ہے
ظلم وستم ہے عام عداوت کا دور ہے ساز وفا خلوص بجانے کا وقت ہے
رہبر جو آج کل ہیں رہزن تھے کل وہی اہل خرد کے سامنے آنے کا وقت ہے
ہر سمت چھا گئیں ہیں دنیا میں ظلمتیں تاریکیوں میں دیپ جلانے کا وقت ہے
ظلم وستم کا بادل چھٹ کر ہو عدل قائم وہ انقلاب انورؔ اب لانے کا وقت ہے

رات دن ہم بھلاتے بہت ہیں یاد پھر بھی وہ آتے بہت ہیں
خوب قسمت ہے ہم نے بھی پائی چوٹ دل پر اب کھاتے بہت ہیں
حال دل ان کو کیسے سناؤں زخم دل پر لگاتے بہت ہیں
آپ خوش خو تو ہیں میرے دلبر بات لیکن بناتے بہت ہیں
آپ کی بات اچھی ہے انورؔ نام پھر کیوں چھپاتے بہت ہیں (۱۱۴)

اس باب میں علماء کی شاعری کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہے کہ بہار کی اردو شاعری میں علماء نے اہم رول ادا کیا۔انہوں نے بہار کی اردو شاعری کی انفرادیت میں مزید اضافہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔غالبؔ دہلوی اور شمشادؔ لکھنوی کے شاگردوں نے اپنے اساتذہ کے رنگ کو بہار کی اردو شاعری میں اپنے رنگ کی آمیزش کر ایک مخلوطہ تیار کر کے اردو شاعری کو نئی شکل میں پیش کیا۔ بہار کے علماء نے کئی شعراء سے معرکہ آرائی بھی کی۔اور اس معرکہ میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔اس طرح علماء نے اردو شاعری کے بہاری رنگ کو اور بھی نکھارا۔اور فکر وفن سے آہنگ کرتے ہوئے اردو شاعری کے مشرقی حسن کو بڑھایا۔اور مغرب کی تقلید میں اردو شاعری کے حسن کو مجروح ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

مراجــــع

(۱) اعیان وطن۔ص۱۶۱

(۲) نزہۃ الخواطر۔ص۔۱۹۱، اعیان وطن ص۔۱۶۱، تذکرہ علمائے بہار، جلد اول، ص ۱۳۷

(۳) مسلم شعرائے بہار جلد سوم، ص ۱۷۵، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۱۵۸، آیت اللہ جوہری حیات اور شاعری، ص ۲۰

(۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد سوم۔ص۔۱۷۵، رسالہ معیار پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء ص۔۶۷، مخطوطہ کتب خانہ خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ، بہار اور اردو شاعری۔ص ۷ حاشیہ

(۵) مقالات قاضی عبدالودود، ص۱۶، بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص۱۷۱، مقالات قاضی عبدالودود، ص۱۶، بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۲۷۶، مقالات قاضی عبدالودود، ص ۱۴۰

(۶) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۶۰ تلخیص

(۷) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۵

(۸) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۴

(۹) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۶۱

(۱۰) تذکرہ علمائے بہار، جلد اول، ص ۲۵۷ تلخیص

(۱۱) سیرت پیر مجیب، ص ۲۹۱ / المجیب خصوصی شمارہ، ص ۹۲

(۱۲) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۶۳

(۱۳) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۸

(۱۴) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۶۲

(۱۵) بہار اور اردو شاعری، ص ۱۸

(۱۶) ماہنامہ صنم پٹنہ بابت ۱۹۵۹ئ صفحہ (۱۰۱) مسلم شعرائے بہار جلد دوم، ص ۱۰۲

(۱۷) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، ص ۱۶۷

(۱۸) تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ص۔۳۹۸، اعیا وطن۔ص۔۲۹۹

(۱۹) ماہنامہ صنم پٹنہ بابت ۱۹۵۹ء

(۲۰) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا۔ص ۲۲۵

(۲۱) بہار میں ردو زبان وادب کا ارتقا۔ص ۲۲۶

(۲۲) رسالہ معاصر پٹنہ بابت ۱۹۴۱ء
(۲۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (اول) ص ۱۹۴
(۲۴) تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول۔ ص۔ ۳۳
(۲۵) المجیب خصوصی شمارہ ۲۰۱۳۔ ص ۳۰، مسلم شعرائے بہار جلد اول، ص ۳۷
(۲۶) تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول۔ ص۔ ۳۰
(۲۷) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد پنجم) ص ۲۰۶
(۲۸) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد پنجم۔ ص ۱۲۸
(۲۹) مسلم شعرائے بہار جلد چہارم۔ ص ۱۴۷
(۳۰) تذکرہ بزم شمال۔ ص ۹۳
(۳۱) المجیب خصوصی شمارہ۔ ۲۰۱۳۔ ص ۴۴، تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد پنجم، ص ۱۴۳
(۳۲) تذکرہ بزم شمال ص ۱۴۸/۱۵۷)
(۳۳) الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور، ص ۸۱۱، مسلم شعرائے بہار جلد اول، ص ۱۸۳
(۳۴) مسلم شعرائے بہار جلد اول۔ ص ۱۲۰/۱۱۶
(۳۵) تذکرہ علمائے بہار، جلد اول، ص ۶۶)
(۳۶) مسلم شعرائے بہار جلد اول ص ۱۳۶
(۳۷) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۳۰۰
(۳۸) اعیان وطن۔ ص ۲۷۷، نزہۃ الخواتر، جلد ۷۔ ص ۱۳۳۱، سہ ماہی المجیب خصوصی شمارہ ۲۰۱۳ پھلواری شریف، ص۔ ۵۰، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد پنجم۔ ص ۶۴
(۳۹) تذکرہ بزم شمال ص ۲۳۹/۲۴۳، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۷۷
(۴۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۳۷
(۴۱) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد چہارم، ص ۱۷۷
(۴۲) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (سوم) ص ۱۹۴
(۴۳) رفیق علمائے بہار نمبر، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (پنجم) ص ۱۳۷
(۴۴) تاریخ ادب اردو جلد اول، ص۔ ۴۳۹)
(۴۵) بہار میں اردو شاعری کا ارتقا، ص۔ ۴۰۱)

(۴۶) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص۔ ۴۳۹)
(۴۷) بہار اور اردو شاعری، ص۔ ۱۲۷)
(۴۸) بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری۔ ص۔ ۱۹۴
(۴۹) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۴۷
(۵۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۴۷، اردو ادب کی تاریخ میں نالندہ ضلع کی خدمات، ص ۱۳۱
(۵۱) تذکرہ بزم شمال، ص ۴۳۲
(۵۲) بزم شمال ص ۱۰۷، سخن شعراء۔ ص ۳۹۶، تاریخ شعرائے بہار۔ ص ۱۴۵، ریاض ترہت۔ ص ۵۳، آئینہ ترہت۔ ص ۱۰۲
(۵۳) بزم شمال ص ۳۱۴/۳۱۲
(۵۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۳۷
(۵۵) سہ ماہی المجیب خصوصی شمارہ ۲۰۱۳، ص ۱۰۱
(۵۶) تذکرہ مسلم شعرائے بہار، جلد اول، ص ۲۰۳
(۵۷) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص ۱۴۶۱
(۵۸) قوس حمزہ پوری احوال وآثار، ص ۳۷)
(۵۹) قرینۂ غزل، ص ۲۳
(۶۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۳۵، حیات دوام، ص ۱۵۴
(۶۱) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد پنجم) ص ۲۱۸
(۶۲) بنگال میں اردو۔ ص ۱۳۱
(۶۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار، جلد چہارم، ص ۱۳
(۶۴) تذکرہ علمائے بہار۔ ص ۳۵۳، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد چہارم، ص ۹، بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری۔ ۳۹۷
(۶۵) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد پنجم) ص ۱۱۱
(۶۶) تاریخ اطبائے بہار۔ جلد دوم۔ ص ۲۷، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (ششم) ص ۲۸۳
(۶۷) تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول، ص ۱۸۹، بزم شمال ص ۵۲۰/۵۲۲

(۶۸) تذکرہ بزم شمال۔ص۔ ۳۶۴،تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ص۔؟؟؟
(۶۹) بزم شمال،ص نمبر ۳۶۴
(۷۰) تذکرہ بزم شمال۔ص ۳۸۷/۳۸۱،دیوان مضطر،گلستان ہزار رنگ۔ص ۱۹،۶
(۷۱) مولانا سید محمد شمس الحق،حیات اور علمی وادبی کارنامے۔مختلف صفحات
(۷۲) روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ ۵/جون ۱۹۹۴ء،تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (ششم) ص ۵
(۷۳) تذکرہ بزم شمال۔ص (۵۳۲/۵۲۷)
(۷۴) تذکرہ علمائے بہار،جلد اول،۳۸۰،کلام ذکا،مختلف صفحات
(۷۵) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۲۸۸
(۷۶) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۲۰۹
(۷۷) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۸۴
(۷۸) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (سوم) ص (۲۳۲)
(۷۹) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔(جلد ششم) ص ۱۲۱
(۸۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (اول) ص ۴۳
(۸۱) تاریخ ادب اردو جلد سوم،ص ۱۹۴۶
(۸۲) تاریخ ادب اردو جلد سوم،ص ۱۹۴۷
(۸۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۲۷۵
(۸۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔جلد ششم ص ۸۱
(۸۵) الشمس میگزین،تذکرہ علمائے بہار۔جلد دوم،ص ۱۴۸،مسلم شعرائے بہار جلد (اول) ص ۱۰۸
(۸۶) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص (۲۳)
(۸۷) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۱۸۱
(۸۸) تذکرہ بزم شمال۔ص (۳۵۴)
(۸۹) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۱۵۲
(۹۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۶۱
(۹۱) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۲۹

(۹۲) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۳۰
(۹۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۱۶۰
(۹۴) امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین اوران کی شاعری، ص ۱۳)
(۹۵) امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین اوران کی شاعری، ص ۲۷)
(۹۶) امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین اوران کی شاعری، مختلف صفحات)
(۹۷) خودنوشت
(۹۸) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ مختلف صفحات)
(۹۹) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ ص ۲۴۷)
(۱۰۰) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ ص ۲۵۳)
(۱۰۲) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ ص ۲۵۴)
(۱۰۳) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ ص ۲۵۹)
(۱۰۴) مولانا ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی، حیات وادبی خدمات۔ مختلف صفحات)
(۱۰۵) خودنوشت
(۱۰۶) حرف آرزو، ص ۲۲
(۱۰۷) حرف آرزو، ص ۹۱
(۱۰۸) حرف آرزو، ص ۱۳۳
(۱۰۹) خودنوشت
(۱۱۰) خودنوشت
(۱۱۱) تذکرہ شعرائے سارن ۲۳۴
(۱۱۲) تذکرہ شعرائے سارن، ص ۴۰۰
(۱۱۳) تذکرہ شعرائے سان، ص ۲۲۷
(۱۱۴) بادنسیم، مختلف صفحات

☆☆☆

باب سوم

بہار کے چند علماء کی شاعری کا
تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ

بہار کی اردو شاعری میں علماء کا اہم رول رہا ہے، اور آج بھی ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو نئے رنگ و آہنگ اور اعلیٰ افکار سے مزین کرانے میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کی شاعری جملہ اصناف سخن پر محیط ہے۔ اور ہر صنف میں انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ ان کے نقوش اتنے نمایاں ہیں کہ ہر موقع پر چمکتے ہیں۔ اور اردو شاعری میں ان کے کارناموں کو روشن کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ ان کی شاعری کا تفصیلی و تنقیدی جائزہ لیا جائے، تا کہ اقدار و مقام متعین کرنے میں آسانی ہو۔ اس لئے اس باب میں میں نے ۱۰ر علماء کی شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ جس کی تفصیل پیش ہے۔

(۱)

شاہ محمد آیت اللہ جوہریؔ پھلواروی

شاہ محمد آیت اللہ نام، جوہری تخلص، حضرت قطب الاقطاب محمد مخدوم کے صاحبزادہ تھے۔آپ کی ولادت ۷رشوال ۱۱۲۶ھ /۱۵/اکتوبر ۱۷۱۴ء روز سہ شنبہ کو ہوئی۔ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔۸ر ربیع الاول ۱۱۳۶ھ/ ۲۵رنومبر ۱۷۲۳ء کو ابتدائی تعلیم شروع کی۔درسیات کی انتہائی کتابیں اپنے عم محترم ملا وجیہ الحق محدث شاگرد ملا عیسیٰ سے تمام کیں۔بعض کتابیں ملا جمال الدین بہجت بن قاضی علاء الدینؒ سے بھی پڑھی تھی۔خصوصاً علم عروض تو انہیں سے سیکھا۔مثنوی ترقی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر قصبہ بین پٹنہ میں رہنا ہوتا تھا۔اور جہاں کہیں ان کے چچا تشریف لے جاتے، وہ بھی ساتھ جاتے تھے۔اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۶ر ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مطابق ۷ر دسمبر ۱۷۵۹ء بروز جمعہ سجادہ نشیں ہوئے۔اور ہدایت خلق میں مصروف ہو گئے۔

صاحب درس و تدریس اور بڑے خوشخط تھے۔شاگردوں اور مسترشدوں کا ایک گروہ کسب سعادت میں مصروف رہا۔ان میں سے کچھ پھلواری کے تھے۔اور کچھ حاجی پور اور حسینا ضلع مظفر پور کے تھے۔آپ ۲۷ سال تک مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز رہے۔

شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔اور اردو میں جوہریؔ، فارسی میں مذاقیؔ تخلص کرتے تھے۔مثنوی گوہر جوہریؔ آپ کی مشہور مثنوی ہے۔

آپ کی وفات ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۶ء میں ہوئی۔پھلواری میں مدفون ہوئے۔جس جگہ ان کی قبر ہے وہ اب مقبرہ آیت اللہ کے نام سے موسوم ہے۔یہ مقبرہ سنگی مسجد کے پورب سے اتر جانب میں واقع ہے۔ (۱)

بہار میں اردو میں مرثیہ گوئی کی ابتدا آپ ہی نے کی۔اگر پورے ملک کو سامنے رکھ کر کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ اردو مرثیہ گوئی کے صف اول سے تعلق رکھتے تھے۔خوش قسمتی سے حضرت جوہری کے فارسی اور اردو کلام کا نایاب قلمی سرمایہ پھلواری کی خانقاہ سلیمانیہ میں محفوظ ہے۔چونکہ آپ کے زمانہ میں علم و ادب کی عام زبان فارسی تھی اور اردو نشو و نما کے دور سے گذر رہی تھی، اس لئے فطری طور پر آپ کا فارسی کلام اردو کلام سے بڑھا ہوا ہے، آپ کے اردو کا یہ ایک

شعر بہت مشہور ہے۔

لگایا عشق نے آ مجھ دل بیتاب میں آتش　　کہ دے ہے جون مہوس بوتہ ءِ سیماب میں آتش

حضرت شاہ آیت اللہ جوہریؔ پھلواروی کی ایک ضخیم اردو مثنوی جو تین ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے جسے جوہریؔ نے ۱۱۶۱ھ میں لکھا تھا اور جس کا نام ''مثنوی گوہر جوہریؔ'' رکھا تھا، پروفیسر حسن عسکری صدر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج نے ایک سڑی گلی ردی کتابوں کے انبار سے ڈھونڈ کر نکالا تھا۔ اسے بابائے اردو مولوی عبد الحق نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی آرگن مجلہ اردو میں شائع کیا تھا، جو اس وقت حیدر آباد دکن سے نکلتا تھا۔ اس میں جوہریؔ نے ''کنول دی'' اور ''راجہ رام'' کے معاشقہ اور پھر ان کے انجام کو منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیا بن ہے ہماری سیج سونی　　ہوئے رہ رہ مجھے دکھ درد دونی
پیا کے وصل کی ہوں ایسی بھوکی　　کہ جوں سورج کے پیچھوں سورج موکھی
کنول ہوں میں، کنول دی ہے مرا نام　　مجھے جل بیچ بن سورج نہ آرام
نہ سورج بن ہوں میں آرام وکل میں　　کھڑی جلتی ہوں نت آنسو کے جل میں
اکارت جائے ہے میری جوانی　　پیا پردیس، کیا یہ زندگانی

گیا پھاگن چڑھا اب چیت سرپر　　جلی ہولی ہماری آگ لے کر

پھری پھرتی ہوں اس گل بن ڈنواڈول　　کروں کیا لے کے غنچہ کیا کروں پھول
مرے غم سین کوئی گل چاک داماں　　مری حسرت ستیں غنچہ ہے حیراں
(۲)

ڈاکٹر سید اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

پروفیسر حسن عسکری صاحب، صدر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج نے شاہ آیت اللہ جوہریؔ کی ''مثنوی گوہر'' کا انکشاف کیا اور رسالہ اردو، دہلی، اپریل ۱۹۴۰ء میں ایک تفصیلی مضمون مثنوی کے متعلق

سپرد قلم فرمایا۔ مثنوی گوہر جوہریؔ کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر موصوف کو اپنے ایک ہندو شاگرد کے ذریعہ حاجی پور کے علاقہ سے ملا تھا۔ پھلواری شریف میں کوئی نسخہ اب تک غالباً نہیں ملا۔ ۱۹۵۴ء مئی میں پروفیسر عسکریؔ صاحب نے، اور میں نے ایک نامکمل نسخہ قلمی، مثنوی گوہر جوہریؔ، کا شاہ مجتبیٰ حسنؔ صاحب کے کتب خانہ بہار شریفؔ میں دیکھا تھا۔ عسکری صاحب کا نسخہ فی الحال پٹنہ۔ یونیورسیٹی لائبریری شعبۂ مخطوطات کی ملکیت ہے۔ ۱۹۴۰ء میں عسکری صاحب کا یہ خیال تھا کہ بجز دیوان فارسی اور مثنوی گوہر کے شاہ آیت اللہ کا کلام مفقود ہے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مجھے اور پروفیسر عسکری صاحب کو پھلواری شریف کے متعدد قدیم مراثی ملے۔ جس میں شاہ آیت اللہ کے مراثی بھی ہیں۔ بعد ازآں حکیم شعیب صاحب مرحوم سے مجھے شاہ آیت اللہ کی ''شہر آشوب'' کی نقل بھی ملی۔ (۳)

مزید تحریر کرتے ہیں:

تذکرہ عشقیؔ عظیم آبادی (شیخ محمد وجیہہ الدین) میں درج ہے کہ:

''جوہریؔ تخلص۔، اسمش مولوی آیت اللہ۔ مردے فاضل از بزرگان قصبہ پھلواری ست۔ پیشتر فکر مرثیہ وسلام ہندی می کرد۔ در مقطع مرثیہ مذاقیؔ و در غزل فارسی شورش تخلص می آورد۔ گاہ گاہ بہ نظم پروازی ریختہ نیز جوہر طبع خود بہ عنوان فاضلان آشکارا می ساخت۔۔۔۔

عشقیؔ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آیت اللہ نے پہلے مرثیہ وسلام میں طبع آزمائی کی ہے۔ لہٰذا میں مراثی کی مثالیں پہلے پیش کروں گا۔ اور بعد ازآں مثنوی سے حوالے درج کروں گا۔ میں قاضی عبدالودودؔ صاحب کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ''اردو غزلیں انہوں نے غالباً بہت کم لکھیں۔'' فارسی غزلوں میں تو وہ صاحب دیوان تھے۔ (۴)

تاریخی روایت کے مطابق بہار کی اردو شاعری میں مرثیہ کی ابتدا جوہریؔ سے شروع ہوئی۔ جوہریؔ مرثیوں میں عربی مرثیہ سے الگ اہل بیت کو طرح طرح سے نوحہ کرتے اور روتے دکھایا گیا ہے۔ درد اور سوز پیدا کرنے کے لئے کمزور روایتوں کو قبول کرلیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جوہریؔ کے مرثیوں میں محاکات، مصوری اور تخیل آفرینی ہے۔ درد وسوز کی حکایت میں سادگی ہے۔ اور نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں مقامی رنگ بھی نمایاں ہے۔ جوہریؔ کے عہد میں شمالی

ہند میں جو مرثیہ لکھے گئے ان میں کوئی جدت نہیں ہے۔لیکن جوہریؔ کے مرثیہ میں ایک نیا رنگ اور آہنگ ہے۔ جو دوسرے دبستان سے مختلف ہے۔

مرثیہ کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

آل نبی نہیں جینے پایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی
کٹا بتولؔ وعلیؔ کا جایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی
تیغ ستم کو تن پر کھایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی
خنجر سے گردن کٹوایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

تن کو سر سے ہے نہ پہرا وا سر اوس تن سے دور ہے دور
سر نیزہ پر جھوم رہا ہے تن مانٹی میں گھاؤ سے چور
ہائے نبی کا خاصہ نواسا وائے بتول علی کا پور
کیا کیا ظلم نہ اوس پر آیا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

بعد شہید ہونے سرور کے خیمہ بیچ در آیا قاتل
لوہو بہرا و خنجر بران کف میں لے چمکا یا قاتل
گہر میں اسا سا جو کچھ پایا پیادوں سے لٹوایا قاتل
سب نسوات سے نالہ بر آیا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

قتل کتیں عابد کے ہے ہے جب قاتل نے ارادہ کیا
اوس بیمار کے سر کٹنے کو جب کہ تعین پیادہ کیا
خواہی نخواہی غصہ ہوکر قتل پہ زور زیاہ کیا
پہوپہی نے اوسکو روک بچایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

آپ کا ایک مشہور مرثیہ جو آج تک پھلواری شریف کے امام باڑوں میں سالانہ مجلس عزا کے

موقع پر پڑھا جاتا ہے، وہ یہ ہے ؎

لوٹ لیو بنجارہ بن میں ٹانڈا لداہو سارہ بن میں
ہائے حسین پچارا بن میں بیکس کر کے مارا بن میں

بن میں کھڑی دکھیاری روئے گھر جو لٹا گھر باری روئے
بانو دکھیا پچاری روئے راول جس کا مارا بن میں

بٹماروں نے بن میں گھیرا لوٹ لیا سب خیمہ ڈیرا
ہائے حسینا راول میرا سیس بدن سے اتارا تن میں

جو جھا سارا کمبا رن میں لوتھ پڑی ہے کالے بن میں
جیسے برسے میہنہ ساون میں اڑت لہو کا پھوہارا بن میں

بانو دُکھیا کو کے دکھ سے اکبر کا ہے سوئے ہوسکھ سے
میٹھے بچن کچھ بولو مکھ سے جاگو سانجھ سکارا بن میں
اکبر ہمرا راج دلارا اکبر ہمرے نینوں کا تارا
ہائے ہمرا اکبر پیارا توہے کس نے مارا بن میں

(۵)

جوہریؔ مثنوی نگار کے حیثیت سے بھی بہت مشہور ہیں۔ ان کی مثنوی ''مثنوی گوہر جوہری'' بہت ہی مشہور ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۷۔۱۷۴۸ء) میں لکھی گئی۔ اس مثنوی میں دو ہزار تین سو چار اشعار ہیں۔ یہ مثنوی ایک المیہ ہے۔ یہ رام راجا اور کنول دی دونوں کا المیہ ہے۔ اس مثنوی کا پلاٹ سادہ ہے۔ لیکن مرتب و منظم ہے۔ قدیم مثنویوں کی طرح ''گوہر جوہریؔ'' میں جن، پری اور دیو وغیرہ کا قصہ نہیں بلکہ انجام فطرت کے خلاف دکھایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں داخلی سے

زیادہ خارجی عناصر کی ترجمانی کی گئی ہے۔اس مثنوی کے پس منظر میں اس دور کی پوری ترجمانی موجود ہے۔اس دور میں دربار اور درباریوں کی خودغرضی، تن پروری اور اخلاق رذیلہ پائے جاتے تھے۔جس کی وجہ سے بہار میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔شعراء عام طور پر ان تلخ حقائق سے پرہیز کرتے تھے۔لیکن جوہریؔ نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے۔اور اپنے اشعار میں ان حقائق پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔جوہریؔ کی مثنوی مبتذل خیالات اور اخلاق سوز بیانات سے بھی پاک ہے۔

اردو میں ولیؔ دکنی نے حتی الوسع سراپا نگاری میں سالمیت مذاق کا ثبوت دیا ہے۔لیکن جوہریؔ کی سراپا نگاری سے بہت مختلف ہے۔جوہریؔ نے سلامت ذوق ہی کو معیار بنا کر سراپا بیان کیا ہے۔انہوں نے ان ہی اعضا کا ذکر کیا ہے جن پر ہماری سوسائٹی میں حسن کا انحصار ہے۔

جوہریؔ نے ظرافت کے بھی نمونے پیش کئے ہیں۔عام طور پر صوفیاء طنزیات، فکاہات اور ہجویات سے پرہیز کرتے رہے، لیکن جوہریؔ نے اس کے خلاف عمل کیا۔گرچہ ان کا طنز فن کے لحاظ سے ناقص ہے، لیکن ظرافت کا انداز قابل توجہ معلوم ہوتا ہے۔

ارے ملا ارے زاہد نمازی　　نہ بازی بوجھ ہرگز عشق بازی

یہ حب جاہ کے چاہ میں تو　　سمجھ کے رکھ قدم اس راہ میں تو

ارے تو سانچ کہ کس کام کا تو　　نہ ہے بندہ خدا کا نام کا تو

ترا دل درد کا کب ہے خریدار　　خودی کا مست ہے از جام دستار

کہاں ہے عشق لگ تیری رسائی　　کدھر جاتا ہے اے باندھے ہوائی

نصیحت چھوڑ اے ناصح سیہ رو　　کہاں یو کوچہ عشق اور کہاں تو

گلی میں عشق کی تیرا گذر نہیں ارے یہ عشق ہے خالا کا گھر نہیں

خرآدم نما تھا لیک بے دم حماقت سیں کیا تھا آپ کوں گم

نہ بن مارے تھی فرصت یک پلک کی ہوئی دم پھول چوں چوں دمے کی چکی

محبت خرسیتیں رکھتا تھا وہ بیل کہ ہے ہرایک کوں جنس اپنے سیتیں میل

کہے تھا دم بہ دم ائے خر ہمارا کہاں ہے اے میری آنکھوں کا تارا

(۶)

محبت

نہ ہو جو عشق میں ہمرنگ معشوق نہ عاشق بلکہ ہے وہ ننگ معشوق

ظہور عشق ہے عالم سراپا خم ہیگا عشق ومے ہے عشق ومینا

کٹانا سرکا ہے عین عبادت اگر سرجائے ہے سرکی سعادت

اگر چاہے ہے تو عشق ومحبت ریاضت کر، ریاضت کر، ریاضت

نہ ہوتن پروری اور عشق یک جا کہ ہو ہے عشق فضل حق سیں پیدا

دل ماہی میں کیا دریائے شوق ہے کہ اسکوں رات ودن پانی کا ذوق ہے

کسی کوں لیکے پانی میں ڈوباوے کسی کوں آگ میں لے کر جلاوے

کسی کوں درد سیں ہمجانگی دے کسی کوں منصب پروانگی دے

ارے اے جوہر اے آیت اللہ مقام راستاں کا عشق سیں چاہ

ارے اے عشق تجھ بن دل خجل ہے ہمارا ہوش ہم کوں قفل دل ہے

ارے اے عشق تو ہیگا فسوں ساز تجھی سیں ہیگا معشوق قوں دل ہے

رکھوں میں غنچہء دل میں اناالحق طلسم نقش ہستی کوں کروں شق

جگر کے خون کی لذت کو جانے جو عاشق ہے وہی اسکوں پچھانے

پنٹ مشکل ہے اے جاں عشق بازی اگر ہوئے حقیقی یا مجازی

نہ خم خانہ رہا نہ خم نہ ساقی رہا یہ عشق کا افسانہ باقی

(۷)

سراپا

جو ہے تجھ قد کا بندہ سرو آزاد تو پھر کس باغ کی مولی ہے شمشاد

تری یو زلف ہے عاشق کی پھانسی مرے لوہو کی ہے ناگن پیاسی

سجن تجھ کان میں یو گوشوارا　　مجھے دکھ دے ہے جیوں سکھ کا ستارا

بھنویں باریک تیغ دوزباں ہے　　ہلال کم نما برآسماں ہے

نہ چشم مست ہے فتنے سیں خالی　　کہ ہے اس میں شراب پر تگالی

تری آنکھوں میں ظالم لعل ڈورے　　بھرے لوہوسیں نرگس کے کٹورے

ترا اے شوخ یو رخسار ہے گل　　نہ بینی نور کے چشمے پہ ہے پل

تری بیسر کرے ہے ہوش کوں سر　　ترا ناظر ہے یو یاقوت وگوہر

ترا یو لعل لب کچھ زور ہے زور　　یمن میں تجھ لباں، کا شور ہے شور

(۸)

جوہریؔ نے بارہ ماسے بھی کہے ہیں۔ان کے بارہ ماسوں میں اختراعی صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے۔اس میں بھی جوہریؔ کا رنگ منفرد اور جدا ہے۔ ہر مہینہ کا اس موثر انداز میں ذکر ہے کہ اس کی ساری خصوصیتیں اور اس میں آنے والے تہواروں کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جوہریؔ کے بارہ ماسوں میں پھول اور پرندوں کا ذکر بھی ہے۔ یہ سبھی جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ بارہ ماسا میں جوہریؔ کی زبان بہت ہی صاف ہے۔ بارہ ماسا میں جوہریؔ نے ہندی اور بھاشا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔محاورات بھی ہندی ہی کے ہیں۔اس کا مزاج بھی ہندی ہی ہے۔لب ولہجہ پر دیہاتی انداز نمایاں ہے۔نسوانی طرز گفتگو بھی موجود ہے۔ جوہریؔ کا بارہ ماسا دوسرے بارہ ماسوں سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔

چند اشعار پیش ہیں ؎

تجھے ہر روز ملتا ہے تراجفت گیا وہ لال میرا ہاتھ میں مفت

کہاں سے دن کہاں وہ عشق کا جوش شراب وصل سیں رہتی تھی مدہوش

کئی طرحوں کئی روپوں کئی رنگ مرے شوقوں کوں کر اظہار پوسنگ

کنول ہوں میں کنول دی ہے مرا نام مجھے جل بیچ بن سورج نہ آرام

بوجھے پانی سیں نہیں یہ آگ میری اری کیسی ابھاگی بھاگ میری

اگن دوکھ کی نہیں جاتی سنبھالی ہوئی ہوں جل کے میں کوئل سی کالی **(۹)**

جوہری صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔اس لئے تصوف کی ہماہمی اوراس کی گرمی ان کے کلام میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

تاقیامت بند ہونے کا نہیں ہے باب فیض
عقدۂ دل ناخن دست پیمبر باب فیض

عشق پر زور نے کیا کیا نہ کیا خانہ خراب
کوہ کن کو ہے ہوا قیس ہوا صحرائی

دل میں آتا ہے کہ دل سب سے جدا کر لیجئے
شوخ اس بت کے تئیں اپنا خدا کر لیجئے **(۱۰)**

علمائے کرام دین اور شریعت کے حامل ہوتے ہیں۔اس لئے محبوب حقیقی ان کے

یہاں سب کچھ ہے۔اسی اعتبار سے ان کی شاعری میں عشق حقیقی کا تصور زیادہ پایا جاتا ہے۔کبھی انہوں نے عشق مجازی کو اختیار کیا تو اس کو بھی عشق حقیقی کا وسیلہ بنایا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حمد اور نعت اور اس طرح کے اشعار زیادہ پائے جاتے ہیں۔شاہ آیت اللہ جوہریؔ اردو شعر و شاعری میں خاص مقام رکھتے تھے۔انہیں مختلف اصناف سخن پر دسترس حاصل تھا۔اور انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی بھی کی۔وہ نعت گو شاعر کی حیثیت سے اہم مرتبہ کے حامل تھے۔ان کے نعتیہ کلام پر مقامی رنگ و آہنگ بھی ہے۔انہوں نے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ بھاشا کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ڈاکٹر اختر اورینوی تحریر کرتے ہیں:

''اس کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ صوفیوں نے مزاج ہندی کا بڑا پاس کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یوں تو اردو کا قدیم نام ہندی ہے۔خود جوہریؔ کہتے ہیں۔

ع بہرا ہوں در دشعر ہندوی موں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آیت اللہ کو بھاشا کے عام پسند لفظوں سے ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے۔ **(۱۱)**

جوہری کے نعتیہ کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

پڑھوں درود نبی پر ہردم صلی اللہ علیہ وسلم ہے جن کو معراج مسلم صلی اللہ علیہ وسلم
مکی و مدنی عربی ہیں ہاشمی و مصری وقریشی ہیں ختم رسالت پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم
حق کے ہیں محبوب ہمارے قبلہ دین ایمان ہمارے امت کے ہیں نیا ہنہارے صلی اللہ علیہ وسلم
ہند کی خاک سے دور عرب ہے تن کو تاب وطاقت کب ہے لیکن دل دیدار طلب ہے صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر صدرالدین فضا لکھتے ہیں۔

پہلی نعت کو غزل کہنا مناسب ہے۔گرچہ اس میں صرف ردیف کا التزام ہے۔اور قافئے کا تعین ہر شعر کے پہلے مصرعے سے ہوتا ہے۔اس کو ہم مستزاد بھی مان سکتے ہیں۔ **(۱۲)**

بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ میں مذکور ہے۔

''میرے خیال میں اس نعت میں نہ ہی غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔اور نہ ہی مستزاد کی۔اس کی اپنی ایک منفرد اور خاص ہیئت ہے۔اس میں صرف ردیف کا التزام ہے۔اگر ہم

ردیف (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہٹا کر دیکھیں تو اس کا ہر شعر مثنوی کی طرح مقفیٰ ہو جاتا ہے۔ ہر شعر جداگانہ قافیہ رکھتا ہے۔ یہ غزل کی طرح مردف تو ہے، لیکن ہم قافیہ نہیں۔ صرف پہلا شعر ہی مطلع معلوم ہوتا ہے۔ یہ نعت بہر متقارب مزاحف میں ہے۔ جس کی ترکیب رکن فعولن سے ہوتی ہے۔ اس میں مختلف طرح کے زحافات لائے گئے ہیں۔ اور ۱۶/رکنی ہیں۔'' **(۱۳)**

جہاں تک زبان، مزاج اور اسلوب کی بات ہے تو جوہریؔ کے شاعری سے قدامت ٹپکتی ہے۔ ان کی مثنوی لسانی ساخت کے اعتبار سے بہار کی یاد دلاتی ہے اور ان کی مثنوی لسانی ساخت کے اعتبار سے مغربی ہندی یا کھڑی بولی کی ہے، لیکن برج بھاشا کا اثر گہرا ہے۔ جیسے جیو، پیو، ماٹی وغیرہ ساتھ ہی مگدھی اور اودھی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ترکی، فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ جوہریؔ کی شاعری میں بڑی تعداد میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں۔ جو فصاحت، بلاغت اور حلاوت میں میرؔ اور دردؔ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

سنا اک راگ اے بیراگ راگی — کہ متوارے نین سے تاک لاگی

جنوں کے جام کا سرشار رہتا — نگاہ مست کا بیمار رہتا

غرض آخر ملا اس بے نواسیں — گدا جاکر ملا آخر گداسیں

ارے ساقی مرا ساغر ہے خالی — مجھے دے وہ شراب پرتگالی

ارے اے عشق تو مشکل کشا ہے — ہم ایسے گمرہوں کا رہنما ہے

ہوئی خاموش جب شمع تجلی — لگے عالم اوسے دینے تسلی

ملے گر یک سبو مجھ نیم جاں کو کروں تعلیم گردش آسماں کو

جوہرؔی کے مرثیوں کے زبان پر ہندی اثر نمایاں ہے۔مراثی میں بین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔رونا دھونا عام طور پر عورتوں کا شیوہ رہا ہے۔اس لئے مرثیوں میں ہندی اثر کے ساتھ نسوانی لب ولہجہ بھی پایا جاتا ہے۔جبکہ ان کے بارہ ماسا کی زبان مثنوی اور مرثیہ کی زبان سے بالکل الگ ہے۔نعت،منقبت،قصیدہ اور شہر آشوب میں ایک خاص رنگ ہے۔اس کا رنگ فارسی اور عربی زبان کے زیر اثر ہے۔یہاں ہندی زبان کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا ہے۔جوہرؔی کے مرثیہ اور نعت کے اشعار پیش کئے جا چکے ہیں۔شہر آشوب کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

کہاں ہے دین کی شوکت گئی کید ہر مسلمانی کیا ہے کفر نے اس دور موں از بسکہ طغیانی
ہوئی ہیں مسجدیں ویران بنتے ہیں صنم خانے نہ ہووے کس طرح ابلیس کو ہی میر سامانی
خدا کا گھر اندھیرا اور چراغ دیر روشن ہے رواج کفر پھیلا مضمحل ہے نور ایمانی
جدھر دیکھو اودھر بتخانہ میں ناقوس بجتا ہے سنی مسجد میں کم جاتی ہے اب گلبا نگ آذانی
برہمن قشقہ کش تو قیر کہتے ہیں زمانے میں رواج مالا اکثر ہے بہ رسم سبحہ گردانی

جوہرؔی کی شاعری میں بہاری لب ولہجہ کا اثر نمایاں ہے۔اکثر وہ الفاظ اور بولیاں استعمال کی گئی ہیں۔جو بہار کے قصبات اور دیہاتوں میں رائج ہیں۔مثلاً ڈولانا = ہلانا۔جھلنا= ہوا دینا۔ اٹنا=سمانا۔سوٹے بازی= ڈنڈے سے پیٹنا۔ صبحے=علیٰ الصباح ۔ سوا=سویا۔ روا= رویا۔ پھرچھانا= واضح کرنا۔ ای= یہ۔ او= وہ۔ اونہاں= وہاں۔ ایہاں= یہاں۔ ابھیں= ابھی۔ ایہی= یہی۔ اوسہی= اسی۔کسہی= کسی۔جیسے الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔

جوہرؔی عربی وفارسی الفاظ کی جمع بھی ہندی قاعدے پر لاتے ہیں۔جیسے فریبیں=فریب۔ غباریں =غبار۔عربی مصادر کی جمع بھی استعمال کرتے ہیں۔جیسے التفاتیں =التفات۔ انصافوں= انصاف۔عدلوں= عدل۔

اشعار ملاحظہ ہو ؎

ارے کیا کیا فریبیں ہم کوں دیکر پہنسائی ہم کوں کس پہاندے میں لیکر

نکالے روکہ تو دل کی غباریں　　مجھے رخصت نہ کیوں کر روپکارا ے

کیا اس بینواسیں التفاتیں　　پری عاشق گداسیں ہنس کے باتیں

گدا پہر پاس آیا اس کے یکبار　　جسے تہا حق کے انصافوں میں انکار

نہیں کچہہ ہمتیں تقسیر آئی　　دہائی شہہ کے عدلوں کی دوہائی

کلام میں کسی مشہور واقعہ یا قصہ کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔جوہرؔی نے اپنی شاعری میں تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے۔انہوں نے عربی، فارسی اور ہندی ہر طرح کے تلمیح سے کام لیا ہے۔جیسے شق القمر، کشتی نوح، خسرو وشیریں، فرہاد وشیریں، لیلی مجنوں۔اس جیسے بہت سے تلمیحات کا استعمال جوہرؔی نے اپنے اشعار میں کئے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے کلام میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔

اشعار ملاحظہ ہو ؎

کیا اعجاز کی انگلی سیں مہ شق　　محمد ہیں رسول اللہ برحق

اوٹھے عالم میں گر طوفاں تو غم کیا　　تجھ ایسا نوح کشتی باں تو غم کیا

کہن افسانہا کرتے کدھوں یاد　　زعشق خسرو وشیرین وفرہاد

جرس ہے محمل لیلی کا نالاں　　غم مجنوں سیں وحشی ہیں غزالاں

جوہرؔی نے اپنے اشعار میں تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کیا ہے۔ان کے تشبیہوں اور استعاروں میں جدت، ندرت، تنوع اور شگفتگی ہے۔ان سے ان کے ذاتی مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔جوہرؔی کے اشعار میں استعمال کئے گئے چند استعاروں اور تشبیہوں کو پیش کیا

جاتا ہے۔ جیسے گلوں کے چمکنے سے دھوپ کا استعارہ، جگنوؤں کا جگمگانا آسمان سے ٹوٹے ہوئے تاروں کا چمکنا، کتان چاک بامہتاب سے وصل محبوب کا استعارہ۔ اس جیسے بہت سے استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

غرض اس گلستاں میں سو روپ تھا　　گلوں کے چمکنے ستیں دھوپ تھا

نہ جگنوں میرے اس دردوں کے مارے　　فلک سیں آئے ٹوٹے ہیں ستارے

سکھی میں نیں مبارک دیکھا　　کتان چاک با مہتاب دیکھا

جوہریؔ نے اپنے اشعار میں دیگر صنعتون کا بھی استعمال کیا ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں طرح کی صنعتوں سے کام لیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

صنائع لفظی۔۔تکرار

نہ کر تو شور اے شوریدہ بلبل　　تحمل کر تحمل کر تحمل

تجنیس تام

کہ کیا فرہاد کا تھا عشق سنگین　　دیا شیریں کے پیچھے جان شیریں

صنائع معنوی۔۔تجاہل عارفانہ

خبر نہیں کس کی ابرو کا فگار ہے　　نہیں جانوں کہ کیا یہ بے قرار ہے

مبالغہ۔۔غلو

اگر وہ گلبدن ہنستی و روتی　　لب و چشموں سے گرتا لال موتی

جوہریؔ کے اشعار میں اس طرح کے صنائع کا استعمال کثرت سے موجود ہے۔

ان تمام کے باوجود شاہ آیت اللہ جوہریؔ کے دور میں بہار کی ادبی زبان بہت صاف اور سشتہ ہو چکی تھی۔ لیکن جوہریؔ کے کلام پر قدامت کا رنگ گہرا ہے۔ ڈاکٹر صدرالدین فضا تحریر کرتے ہیں:

''یہ امر کس قدر حیرت انگیز ہے کہ جوہریؔ جو تیرہویں صدی ہجری کی ابتداء تک زندہ رہے۔اپنی زبان کے لحاظ سے وقت سے پیچھے رہے۔راسخؔ عظیم آبادی کا انتقال ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء۔۱۸۲۳ء) میں ہوا۔۲۸/سال کے فرق نے راسخؔ کی زبان کوکہاں سے کہاں پہنچادیا۔ ان کی دہلوی اثرات سے مج گئی۔لیکن جوہریؔ پر بیرونی اثر نہ پڑ سکا۔'' (۱۴)

مذکورہ بالا تحقیق سے یہ واضح ہے کہ جوہریؔ نے اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔جوہریؔ کا دور ابتدائی دور تھا۔اس لئے ان کی شاعری میں کچھ کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بہار میں اردو مرثیہ نگاری کی روایت کو قائم کیا۔اور دیگر اصناف سخن کی بھی آبیاری کی، یہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔

(۲)
شاہ جلیل الدین حسین صوفیؔ منیری

شاہ جلیل الدین حسین نام،ابومحمد کنیت،شاہ فرزند علی صوفی منیری کے نام سے مشہور تھے۔ ویسے صوفیؔ منیری کے نام کے سلسلہ میں تذکرہ نویسوں کی رائے مختلف ہے۔ پروفیسر معین الدین دردائی اپنی کتاب بہار اور اردو شاعری میں حضرت صوفی منیری کا نام شاہ جلیل الرحمن عرف شاہ فرزند علی صوفی لکھا ہے۔مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب خطوط غالبؔ میں صوفیؔ کے مختصر حالات یوں لکھے ہیں۔منیر الدین نام، ابومحمد کنیت،شاہ فرزند علی صوفیؔ منیری کے نام سے مشہور ہیں۔اور منیر ضلع پٹنہ کی خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے۔جناب کوثرؔ رضوی نے روزنامہ انجام کراچی مورخہ ۲/جون ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں اپنے مقالہ مرزا غالبؔ کے خطوط میں ان کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے،جن کے نام مرزا غالبؔ نے خطوط لکھے ہیں۔صاحب مقالہ لکھتے ہیں ''دوسرا خط سید ابو محمد جلال الدین حسین المشتہر شاہ فرزند علی زاہدی فردوسی کے نام ہے، یہ غالبؔ کے شاگرد تھے۔اور صوفیؔ تخلص کرتے تھے۔حضرت صوفیؔ منیری کے فرزند شاہ اسد اللہ منیری نے اپنے والد بزرگوار کی کتاب ''وسیلہء شرف'' کے اخیر میں آپ کا نام اس طرح لکھا ہے۔حضرت شیخ ابومحمد جلیل الدین حسین عرف سید شاہ فرزند علی صوفیؔ منیری ۔حضرت صوفیؔ منیری کے بڑے صاحبزادے شاہ

عبدالقادر اسلامپوری نے اپنی تصنیف انوار ولایت میں بھی آپ کا نام اسی طرح لکھا ہے۔اس لئے یہی نام صحیح اور مستند ہے۔(۱۵)

صوفی منیری کی پیدائش ۹ر شوال ۱۲۵۳ھ میں ہوئی۔صوفی منیری سات برس کے تھے، تو آپ کے والد شاہ محمد علی زاہدی کا وصال ہوگیا۔والد کے وصال کے بعد اپنے بڑے بھائی شاہ اولاد علی فردوسی زاہدی کے ساتھ منیر شریف نانیہال میں آکر سکونت پذیر ہوگئے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں شیخ محمد اعظم علی عرف بکن فردوسی منیری سے حاصل کی۔عربی کی تعلیم اسلام پور میں مولوی حسام الدین حیدر اور مولوی عبداللہ پیشاوری سے حاصل کی۔کتب بینی کا شوق شروع ہی سے تھا۔خاص طور سے حضرت مخدوم اور ان کے سلسلہ کی تصانیف اور تصوف کی کتابوں کا زیادہ مطالعہ فرماتے تھے۔

آپ کی وفات ۶ر ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ کو ہوئی۔ (۱۶)

صوفی منیری نے فارسی اور اردو میں اشعار کہے ہیں۔انہوں نے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی تھی۔اس لئے ان کے کلام میں غالب کا رنگ نماں نظر آتا ہے۔انہوں نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعیات، حمد اور نعت خاص ہیں۔

شعر و سخن کے طرف آپ کا فطری رجحان تھا۔اس لئے آپ کے کلام میں جذبات کی شدت و گہرائی اور آمد کی کیفیت ہے۔فن شاعری میں آپ نے ایسے استاد کامل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔جس کے پرواز تخیل، قدرت فن، ندرت خیال اور جدت طبع کا معترف سارا زمانہ ہے۔ (۱۷)

صوفی منیری نے مثنوی، قصائد، حمد، نعت، منقبت، اور غزل۔غرض جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان تمام اصناف میں صوفی کی انفرادیت نمایاں ہے۔

صوفی اپنی مثنوی میں اسلوب، طرز نگارش، حسن ترتیب اور کردار نگاری پر خاص طور پر دھیان دیتے ہیں۔ان کی مثنوی تیکنک کے اعتبار سے بہت زیادہ کامیاب ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر، سودا اور مصحفی کی مثنوی کے ہم پلہ ہے۔میر اور سودا کی مثنویوں میں حمد، نعت اور عشق کی تعریف پر زیادہ زور ملتا ہے۔اور مرکزی قصہ کی اہمیت پر کم۔صوفی کی مثنوی میں ایسی بات نہیں۔ان کے یہاں ضمنی اور ذیلی واقعات مرکزی واقعات سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھتے۔صوفی کی مثنوی میں واقعہ

میں حسن ترتیب اور تسلسل برقرار رہتا ہے۔اور اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے کرداروں میں زندگی کی داخلی کشمکش نظر نہیں آتی ہے۔

صوفی کی ایک مثنوی روش عشق ہے۔اس کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہر طرف یہ ظہور اسی کا ہے — دیدۂ و دل میں نور اسی کا ہے
اس کا جلوہ ہر ایک رنگ میں ہے — آب گوہر میں تاب سنگ میں ہے
پرتو جلوہ اش وجود ہمہ — از ظہورش بود نمود ہمہ
شمع دیر وحرم ہے نور اس کا — یاں بھی ہے واں بھی ہے ظہور اس کا
دورگردل سے وہم ہستی ہے — بت پرستی بھی حق پرستی ہے
وہی ہر سو ہے مست جلوۂ ناز — ہے حقیقت کا اک نقاب مجاز

(۱۸)

تھا کوئی گل فروش خوبانام — دل کے کوچہ میں رہتا تھا ناکام
سوز الفت سے ساز رکھتا تھا — شمع ساں دل گداز رکھتا تھا
جی میں پروائے خورو خواب نہ تھی — بے حسینوں کے دل کو تاب نہ تھی
کوچہ گردی میں وہ فسانہ تھا — گل فروشی نہ تھی بہانہ تھا
گھر سے اک روز اپنے جو نکلا — قصر شہ کے تلے سے ہو نکلا
بام پر ایک ماہ کو دیکھا — دختر بادشاہ کو دیکھا
حور کہئے تو ہے سمجھ کا قصور — تھی سراپا وہ ایک شعلۂ نور
سر سے پا تک تھا نور کا جلوہ — ہمہ تن شمع طور کا جلوہ
منھ کی دکھلاتا تھا صفائی ناز — کھل کے کہتا تھا حسن کا انداز

(۱۹)

اردو مثنوی میں عشاق کو ہم عام طور پر روتے بلکتے دیکھتے ہیں۔ان کی حرکت پر لوگوں کو کراہت آنے لگتی ہے۔صوفی کی مثنوی میں ایسی بات نہیں۔ان کی مثنوی میں عاشق کم سے کم روتا دھوتا ہے۔

اور کبھی رونے کی نوبت بھی آئے تو اس کی زبان پر درد اور سوز کے اشعار ہوتے ہیں۔

نہ تو نالہ تھا اور نہ زاری تھی ۔۔۔ نہ تڑپ تھی بیقراری تھی
نہ جنوں کو خیال پردہ دری ۔۔۔ نہ خرد کو حواس بخیہ گری
نہ خودی کو توہم پندار ۔۔۔ نہ تعلق کو یاد یارودیار
نہ ملامت پہ ناصحوں کی گوش ۔۔۔ نہ تشفی کا مشفقوں کی ہوش
ہجر کا رنج نانشاط وصال ۔۔۔ مٹ گیا لوح دل سے نقش خیال
خوف دوزخ نہ آرزوئے بہشت ۔۔۔ نہ خیال حرم نہ وہم کنشت

(۲۰)

صوفی منیری کی ایک مثنوی ''لواٗالحمد'' ہے۔ یہ آپ کی نعتیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں حضورؐ کے سراپا کو پیش کیا گیا ہے۔ آپ کے قد، سر، بال، جبیں، ابرو، چشم، دندان، پہلو وغیرہ کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں صوفی نے عقیدت سے زیادہ اس پر دھیان دیا ہے کہ آپ کے حلیہ مبارک کو پیش کرنے میں غلو نہ آئے۔ آپؐ کے ابروئے مقدس کے بیان میں صوفی کا رنگینی تخیل ملاحظہ کیجئے ۔

تیغ ابرو سے کٹے دل میں ہلال ۔۔۔ ہاتھ پھیلائے ہیں کعبہ پہ بلالؓ
بھویں باریک کشیدہ خم دار ۔۔۔ نہ تھی پیوستگی ان میں زنہار
نظر آتی تھیں وہ پیوستہ مگر ۔۔۔ بال پڑ جاتا تھا واں تار نظر
سبز اک رگ تھی میان ابرو ۔۔۔ تھی وہ رگ تیر کمان ابرو
قہر ہوتا جو نمایاں ہوتی ۔۔۔ غضب آتا تو درخشاں ہوتی

(۲۱)

آپؐ کے چشم مبارک پر صوفی کے اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

مئے دیدار سے آنکھیں مخمور ۔۔۔ رب ہے ساقی تو یہ ہیں جام طہور
رخ ہیں جنت تو یہ ہیں ساغر نور ۔۔۔ نگہ مست ہے صہبائے طہور
سامنا ساقی باقی کا ہے ۔۔۔ عکس رخ جام میں ساقی کا ہے

اس پہ رشک رگ گل ڈورے لال　　جوہر آئینہ حسن کمال
فتنہ گر ہیں نہ فسوں ساز ہیں یہ　　بخدا صاحب اعجاز ہیں یہ
کب بھلا ان کے مقابل ہو سحر　　ان کے اعجاز سے باطل ہو سحر
ان سے چشمک ہو یہ انداز نہیں　　کج ادا یہ نہیں غماز نہیں

(۲۲)

صوفیؔ منیری کی ایک مثنوی ساقی نامہ ہے۔ یہ بہاریہ مثنوی ہے۔اس میں منظر نگاری کا آہنگ موسیقی کے جیسا ہے۔اشعار سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسین وخوبصورت وادی میں اس کی تازگی وناز کی خوشنما پھولوں کی سیج، حسین غنچوں کا پُرفریب نظارہ، بجلی کی کڑک، بارش کی آواز اور مہوشوں کا ہجوم، غرض لطف ہی لطف ہے۔غرض صوفیؔ کی اس مثنوی میں موسیقی ہی موسیقی ہے جس کے پڑھنے کے بعد طبیعت میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

صلائے میکشی ہے رعد کا شور　　دلوں کو کھینچتا ہے ابر کا زور
نہیں قوس قزح یہ جلوہ آرا　　فلک ابرو سے کرتا ہے اشارا
ادھر بجلی بھی چشمک کر رہی ہے　　یہی ہے وقت مینوشی یہی ہے
صدائے تن تنن تن تن تنن ہے　　نہ کہیئے اس کو بارش جلترن ہے
چراغ آسا ہے روشن آتش گل　　پتنگے آتے ہیں جلتی ہے بلبل
ہجوم مہوشاں نور علیٰ نور　　وہ زاہد کش کہ باغ خلد میں حور

(۲۳)

صوفیؔ نے مرثیہ بھی کہے ہیں۔صوفیؔ کے مرثیہ میں ندرت خیال، جذبات نگاری اور محاکات کی فراوانی ہے۔تلوار کی تاریخ دوسرے شعراء نے بھی کی ہے، لیکن صوفیؔ کی تعریف میں ندرت ملتی ہے۔تلوار کی تعریف ملاحظہ ہو ؎

جس فرق پہ گذری کف پا سے اتر آئی　　چار آئینہ وخود وزرہ کاٹ کر آئی
بجلی سی گری سر پہ تو مغضر میں در آئی　　سر کاٹ جگر کاٹ کمر کاٹ برآئی

سینہ میں جو پہنچی تو لہو چاٹ کے نکلی　　　اسوار کو مرکب کو بہم کاٹ کے نکلی

(۲۴)

صوفیؔ نے قصیدے بھی کہے ہیں۔ان کا ایک قصیدہ ''عروۃ الوثقیٰ'' ہے،اس کا رنگ مذہبی ہے۔یہ اللہ کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔اس میں بھی تراشیدہ الفاظ اور چست بندشوں کا استعمال کیا گیا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خدائے پاک ہے ذات وصفات میں یکتا
نہیں شریک ومعاون نہ ضد نہ مثل اس کا
صفات خلق سے اور نقص وعیب سے ہے بری
صفات کاملہ سے متصف ہے آمنا
زمانہ کا نہ گذر اس پہ نہ مکان کا دخل
کہ جسم سے وہ منزہ ہے روح سے اعلیٰ
نہ جسم ہے نہ عرض ہے وہ اور نہ جوہر ہے
نہیں ہے مثل کسی شے کے خالق الاشیا
ہماری زندگی مستعار جان سے ہے
وہ آپ اپنے سے ہے حئی لایموت ابدا
اسے بہشت میں دیکھیں گے مومنیں بیکیف
بغیر منت ادراک ربنا و ارزقنا
قدیم ہے وہ بلاریب وماسویٰ حادث
کہ اس کے علم میں گم تھا جہان ومافیہا **(۲۵)**

صوفیؔ کی شاعری میں غزل بھی ہے۔ان کی غزلوں کا مزاج بھی ان کے دیگر اصناف سخن کی طرح منفرد نظر آتا ہے۔صوفیؔ نے ذوقؔ اور غالبؔ کی زمین میں غزلیں کہی ہیں،اور غالبؔ تو ان کے استاد ہی تھے،لیکن صوفیؔ اپنے ہر جامہ میں پہنچانے جاتے ہیں۔صوفی کی غزل کاؔ اسلوب انوکھا ہے۔اس میں معاملہ بندی،تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ جذب ومستی اور

وسیع المشربی بھی موجود ہے۔صوفی کی غزل میں درددل اور گھلاوٹ کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، جو صوفی کی شاعری کو ممتاز و ممیز کرتی ہے۔اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

بخت خوابیدہ مرے جاگیں یہ امید نہیں
چشم خونبار مری قطرہ فشاں ہوکہ نہ ہو
برہمن دیر بناتاہے تو زاہد مسجد
سدرہ کہیئے یہ دیوار ومکاں ہوکہ نہ ہو
سرشوریدہ پہ نالے مرے دھرنا قاصد
شکوۂ دوست کچھ اس ڈھب کا بیاں ہوکہ نہ ہو

شیخ کی صحبت سے اس نوبت پہ پہنچے ہیں کہ اب
توڑتے ہیں دیر میں بت خانہ ہم پندار کا **(۲۶)**

صوفی کے کلام میں حسرت اور یاس بھی ہے۔حسرت اور یاس کے ساتھ لطف بھی ہے۔اور تاثیر غم بھی۔صوفی نے اپنی شاعری میں اس کو جدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔کلام ملاحظہ ہو ؎

طوطئ خوشنوا ہوں پہ ہوں مرمہ درگلو
آئینہ ایاغ سے دور اور شکستہ پر
بجلی ہی بس گرادے فلک مجھ پہ اب کہ ہوں
پروانہ ساچراغ سے دور اور شکستہ پر

صوفی کی شاعری میں فکر بھی ہےاور فن بھی۔ان دونوں کے حسین امتزاج نے ان کی شاعری میں حسن پیدا کر دیا ہے۔اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

دست رنگیں کی ادا بھاگئی جن کو دم قتل
خوں بہاپاگئے اپنا وہ شہادت والے
جن کی ساقی سے لڑی آئینہ جام میں آنکھ
حشر تک ہوش میں آئیں گے نہ وہ متوالے **(۲۷)**

صوفیؔ کا کلام منظر نگاری سے بھر پور ہے۔ دشت اور صحرا کے حسین منظر کو صوفیؔ نے جگہ دے کرا پنے اشعار میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

جلا کے صومعہ زاہد ہے زیر سایہ تاک
فروغ لالہ وگل نے یہ آگ بھڑکائی
زمیں کے دل کی امنگیں یہ لالہ وگل ہیں
کہ رنگ طبع جواں کی بہار دکھلائی

کنار حسن میں مشاطگئ شوق سے ہے
عروس ناز بصد جلوہ محو رعنائی

چمن میں نخل چراغاں اگر ہیں گل کے درخت
تو لالے دشت میں شاخوں پہ ہیں یہ صحرائی

(۲۸)

صوفیؔ کے کلام میں رندی و مستی کی حکایت، وجد و سرور کی کیفیت، احباب کی سرد مہری، پروانہ کی وسیع المشربی اور یار کی جلوہ ستانی جیسے تجربے غزلوں میں جذبات کے چراغ جلاتے ہیں۔ صوفیؔ کی غزل میں اس طرح کی باتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ غزل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

مری فریاد پر بھی اب گمان شورمستی ہے
بھرا افسانہ ہو کر کام میں نے حق نیوشی کا
نہ ہو بدنام مئے ڈرتے ہیں ورنہ ہم سے رندوں کو
جواب۔ پند ناصح میں سبب کیا تھا خموشی کا
چراغ دیر وکعبہ میں کرے کب فرق پروانہ
دل عاشق ہے بندہ یار کی جلوہ فروشی کا

بٹھائے گی مجھے گوشے میں یہ افسردگی آخر
دم احباب سے لب سرد ہے دل گرمجوشی کا
جنوں آوارہ تھا میں ضعف نے آج اسکے کوچہ میں
اتارا بار میرے دوش سے خانہ بدوشی کا **(۲۹)**

صوقیؔ کے کلام میں سادگی ہے۔ساتھ ہی سلاست بھی ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

دامن صحرا ہے پیراہن مرا
خانہ زنجیر ہے مسکن مرا
ناتوانی کا ہوا زور اس قدر
ہوگیا زنجیر پادامن مرا

غیر کی جاحریم دل میں نہ چھوڑ
کعبہ کو پاک کر بتوں کو توڑ
نہیں سنتا ہے نالہ بلبل
اے صبا چل کے گل کے کان مروڑ

اور ہی رنگ فصل گل لائی
شیخ کی اب کے سال بن آئی
نہ رہی سر پہ منت مطرب
طائروں کی ہے نغمہ آرائی
دل پژمردہ زندہ ہوتے ہیں
ہے دم باد میں مسیحائی
ساغر گل سے شیخ ورند ہیں مست
باد کرتی ہے بادہ پیمائی

ہوا کب شب وصل میں غم غلط
ترے سامنے ہوگئے ہم غلط
ستارے ہیں دن کے ترے سامنے
تماشائے خوبان عالم غلط
نشاں کون دے اور وہاں کون جائے
جہاں یہ غلط تم غلط ہم غلط **(۳۰)**

تصوف اور فلسفیانہ خیالات نے صوفیؔ کے کلام کو اور بھی حسین بنا دیا ہے۔کلام پیش ہے ؎

آئینہ خانے میں آ اپنے دکھا یکتائی
پائیں کثرت میں بھی یکتا تجھے وحدت والے
بیخودی راہ ہے زاہد نہیں واقف صوفیؔ
پیر میخانہ سے اس مسئلہ میں فتویٰ لے

خلوت سرائے دوست ہے دل اپنا صوفیا
بازار گاہ کثرت اوہام کا نہیں

کسی طریقہ میں ہرگز سماع اہل ہوا
روا نہیں روش اہل چشت ہی میں سہی

بت خیالات اپنے ہیں بت خانہ ہے اپنا گماں
وہ نہیں ہے وہ جسے ہیں ہم خدا سمجھے ہوئے
دل میں اس کو ڈھونڈتے ہیں کر کے ہم قطع نظر
نیستی کو رہ کشش کو رہنا سمجھے ہوئے

ہے عکس وہ مرا جسے کہتے ہیں لوگ قیس
میرا ہے جلوہ گاہ بیاباں کہیں جسے
اے رشک مہر جلوہ ترا ہے نگاہ سوز
پردہ ترا ہے عارض تاباں کہیں جسے
غش آپ کو نہ آئے تو لاؤں حضور میں
وہ آئینہ کہ دیدۂ حیراں کہیں جسے **(۳۱)**

صوفیؔ کے اشعار میں غالبؔ کا رنگ نماں ہے۔ غالبؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

صوفی کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

ہے نطق ساز اس کی نواہائے راز کا
کہتے ہیں جس کو لفظ وہ پردہ ہے ساز کا

غالبؔ کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

صوفیؔ کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

حاصل ہے مرے رشک کا حرماں کہیں جسے
سایہ ہے وہ میرا شب ہجراں کہیں جسے
غش آپ کو نہ آئے تو لاؤں حضور میں
وہ آئینہ کے دیدۂ حیراں کہیں جسے

غالبؔ کا مشہور مطلع ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

صوفیؔ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

نسیم صبح چھڑکتی ہوئی گلاب آئی
خبر بہار کے آنے کی بوئے گل لائی

دوسرا مطلع ملاحظہ ہو ؎

اور ہی رنگ فصل گل لائی
شیخ کی اب کہ سال بن آئی **(۳۲)**

صوفیؔ کی غزل میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ان کی غزلوں میں تغزل اور طرز اظہار کا تیکھا پن پایا جاتا ہے۔ساتھ ہی ان کا تیور بھی جدا ہے۔صوفیؔ نے غالبؔ کے انداز پر بھی اشعار کہے ہیں۔لیکن ان کا رنگ منفرد ہے۔البتہ ان کے اشعار غالبؔ سے متاثر ضرور معلوم ہوتے ہیں۔غزل ملاحظہ ہو ؎

ہے نطق سازاس کی نواہائے راز کا
کہتے ہیں جس کو لفظ وہ پردہ ہے ساز کا
آئینہ دوست ہوتے ہیں وہ جو جمیل ہیں
باعث ہے عشق خلق رسول حجاز کا
دامان اہل بیت نبیؐ بادبان ہے
اللہ ناخدا ہے ہمارے جہاز کا
اصحاب وآل پاک کا جو بھر رہا ہوں دم
ہے باد شرط کو مری زور اہتزاز کا
رکھو قدم پہ خواجہ کے صوفیؔ سرنیاز
پھر دیکھو آسمان پہ ہے پاؤں ناز کا **(۳۳)**

صوفیؔ کے کلام میں خیالات کی فراوانی، جدت ادا، جذبات کی مرقع نگاری، تخیل کی رنگینی پورے طور پر موجود ہے۔اس کے باوجودان کے کلام میں ادق مضامین کی گرانباری نہیں۔خیالات صاف ہیں، الفاظ شستہ ہیں، مضامین عام فہم ہیں۔ساتھ ہی ساتھ پورے

اشعار میں فن بھی ہے اور فکر بھی۔ان دونوں کے حسین امتزاج نے صوفیؔ کی شاعری کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

زبس کوئے ملامت میں ہوں خوگر بادہ نوشی کا
گریباں چاک ہے ہاتھوں سے مرے پردہ پوشی کا
مری فریاد پر بھی اب گمان شور مستی ہے
بھراافسانہ ہوکر کان میں نے حق نیوشی کا
نہ ہو بدنام مے ڈرتے ہیں ورنہ ہم سے رندوں کو
جواب پند ناصح میں سبب کیا تھا خموشی کا
چراغ دیروکعبہ میں کرے کب فرق پروانہ
دل عاشق ہے بندہ یار کی جلوہ فروشی کا
بٹھائیگی مجھے گوشے میں یہ افسردگی آخر
دم احباب سے اب سرد ہے دل گرمجوشی کا
جنوں آوارہ تھا میں ضعف نے آج اس کے کوچہ میں
اتارا بار میرے دوش سے خانہ بدوشی کا
میاں مٹھونہ بنناا پنے منہ سے دیکھنا صاحب
نہ لانا رنگ صوفیؔ کرکے دعویٰ سبز پوشی کا (۳۴)

صوفیؔ کے کلام میں مسائل تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ان کے کلام میں عارفانہ حسن بھی موجود ہے۔ان کے اشعار میں فکری اور جذباتی رنگ بھی ہے۔ساتھ ہی ساتھ مذہب اور اخلاقیات کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ سے صوفیؔ کے کلام میں حسن پیدا ہو گیا اور شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

لذت عیش جناں ہے جس کا زاہد کو نشا
جانتا ہوں دردؔ ہے جام مے دیدار کا
باغ جنت جس کی تو کرتا ہے تعریف اس قدر

ہے وہ اک گلدستہ واعظ بزم وصل یار کا
ذات مطلق کی پرستش ہوتی ہے ہر رنگ میں
بندگی کی قید ہے یہ باندھنا زنار کا
صلح کردے اے حقیقت تو ہی آکر درمیاں
بڑھ گیا ہے حد سے جھگڑا کافر و دیندار کا
شیخ کی صحبت سے اس نوبت کو پہنچے ہیں کہ اب
توڑتے ہیں دیر میں بت خانہ ہم پندار کا
باپ ماں سے تو زیادہ مہرباں ہے اے کریم
ڈرتے ہے ہم کو اپنی شوخی گفتار کا
ہوں بڑا عاصی خدایا رکھیو رحمت کی نظر
خاتمہ بالخیر کیجے یو صوفی بدکار کا **(۳۵)**

صوفی کی شاعری مذہبی تلمیحات سے پُر ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں مذہبی تلمیحات کو اس انداز پر استعمال کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس غزل میں ظلوم،جہول،خضر،سکندررومی،نجومی وغیرہ الفاظ نے صوفی کی اشعار کی معنویت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔غزل ملاحظہ کیجئے ؎

شکوہ نہیں مستوں کو ایام کی شومی کا
یاں جام کی گردش ہے کیا کام نجومی کا
اس تہمت ہستی کا جب داغ لگا ہمکو
کیا شرم جہولی کی کیا ننگ ظلومی کا
چشمہ نملا نکلا ظلمت گہہ ہستی سے
کیا خضر تھا طالع بھی اسکندر رومی کا
ہو وصل ترا جس دن ہے روز وہی بہتر
کیوں دیر لگائی ہے کیا قول نجومی کا

بے سبحہ نہیں پڑھتا زاہد جو وظیفہ کو
پابند ہے اے صوفیؔ تقید رسومی کا (۳۶)

صوفیؔ کو علم بیان اور معنی پر بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں مختلف صنعتوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ استعارہ، کنایہ، تشبیہ، حسن تعلیل، صنعت تکرار وغیرہ کا استعمال ان کی شاعری میں موجود ہے۔ اشارہ وکنایہ ملاحظہ کیجئے ؎

مظہر نور حقیقت تھا وہ ماہ　　　وہ تو روشن تھا سپید اور سیاہ

حق نماں آئینہ روئے زیبا　　　جس سے ہوتی تھی حقیقت پیدا

صنعت تکرار ملاحظہ کیجئے ؎

عقل حیراں ہے مضطرب دل ہے　　　ہوئے کس کس پہ فدا مشکل ہے

وہ کشاکش ہے کہ اللہ اللہ　　　تار تار اڑتا ہے دامان نگاہ

تلمیحات ملاحظہ کیجئے ؎

کفر کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا　　　دل کے آئینوں سے زنگ اڑنے لگا

قول جابر ہے کہ میں نے شب ماہ　　　چاند پر اور جو کی ان پہ نگاہ
حسن میں ان کو نرالا پایا　　　بخدا ماہ سے بالا پایا (۳۷)

خلاصہ یہ کہ صوفیؔ کی غزلوں میں ہر رنگ موجود ہے۔ ہر ایک رنگ کا اپنا منفرد آہنگ ہے۔ صوفیؔ پر غالبؔ کا اثر ضرور ہے، لیکن صوفی کا اپنا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

(۳)
مولانا شاہ ابوالحسن فردؔ پھلواروی

شاہ ابوالحسن نام، فردؔ تخلص، خلف اکبر حضرت شاہ محمد نعمت اللہ ''فرد الاولیاء'' کے نام سے مشہور

تھے۔فرؔد پھلواری میں پیدا ہوئے۔ جو شہر پٹنہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔۱ر رجب ۱۱۹۴ھ بروایت دیگر ۱۰ر رجب ۱۱۹۱ھ مطابق ۱۲ر اگست ۱۷۷۷ء کو پیدا ہوئے۔آپ کے والد حضرت شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ تھے۔انہوں نے اپنی نگرانی میں حضرت فرؔد کی پرورش کی اور تعلیم دلائی۔زمانہ طفولیت سے ہی حضرت فرؔد کی غیر معمولی ذہانت اور علمی ذوق کا جوہر ظاہر ہونے لگا۔ آپ کے والد محترم نے فرؔد کو سید العلماء مولانا احمدی کے زیر نگرانی رکھا۔حضرت فرؔد نے ۲۰ر سال کی عمر میں تعلیم مکمل کر لی۔

حضرت فرؔد عہد طفولیت ہی سے علمی اور شاعری کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے۔اور خود بھی خفیہ طور پر اشعار کہنے لگے۔آپ کے والد بزرگوار کو اپنے صاحبزادے کی شاعرانہ دلچسپی کا علم نہ تھا۔ایک دن ایک نامعلوم شاعؔر کی غزل سننے کا آپ کو اتفاق ہوا۔فرط جوش میں اس کے مصنف کا نام معلوم کرنا چاہا، آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ آپ کے صاحبزادے حضرت فرؔد کی یہ غزل ہے۔اوائل کوششوں میں حضرت فرؔد نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مولانا محمد نورالحق طپاںؔ سے کچھ مدد لی۔ان کے علاوہ کسی سے شاعری میں باضابطہ اصلاح نہ لی۔آپ کے تخیلات میں آمد ہوتی تھی۔دیوان حافظؔ کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔سعدیؔ،خسرؔو، جامیؔ اور عرفیؔ کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا اور ان کے انداز شاعری سے متاثر تھے۔حضرت فرؔد نے اپنی تمام شاعری کو حافظؔ کے لقب سے پکارا ہے۔ (۳۸)

حضرت فرد کی اردو شاعری بھی اپنی ندرت خیال اور بندش الفاظ اور اسلوب بیان کے لحاظ سے لاجواب ہے۔اور آپ کا اردو کلام صوبہ بہار میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل جسے کہتے تھے وہ ایک آبلہ تھا بہ گیا ۔۔۔ نام کو اب زخم سا داغ نمایاں رہ گیا
خون دل سینے سے اب تا نوک مژگاں آچکا ۔۔۔ واہ کیا دیکھے اسے لخت جگر ہمرہ گیا
سیر کا کیا ذکر میں اس در سے باہر اک قدم ۔۔۔ اتفاقاً شاذ و نادر کم کبھی ناگہہ گیا
باتوں ہی باتوں میں آیا جور کا اس کے جو ذکر ۔۔۔ چشمکیں کی تھیں رقیبوں نے ولیکن سہ گیا
فرؔد کی کیا خوب حالت عشق میں پہنچی ہے اب ۔۔۔ جس کے جو کچھ جی میں آئی منہ پہ آکر کہ گیا

فردؔ کی شاعری میں الفاظ کی نفاست، تغزل کا رنگ، دل آویز لہجہ پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں فلسفیانہ موشگافیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور یہ فلسفیانہ موشگافیاں ان کے عارفانہ خیالات کو پورے طور پر نمایاں کرتی ہیں۔ فردؔ کا تعلق تصوف سے تھا۔ اس لئے ان کے کلام میں تصوف کی جلوہ گری پورے طور پر ظاہر ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فردؔ کی اردو شاعری بھی ان کی فارسی شاعری ہی کی طرح انفرادی شان رکھتی ہے۔ غزل کے ہر اشعار چست اور درست ہیں۔ اور ان میں تغزل کا گہرا رنگ موجود ہے۔ غزل ملاحظہ ہو ؎

جسے تم غیر سمجھے ہو اسے ہم یار کہتے ہیں — جہاں کو ہم سراسر جلوۂ دلدار کہتے ہیں
نہ ہو جس گل میں تیری بو اسے ہم خار کہتے ہیں — جہاں تو جلوہ گر ہووے اسے گلزار کہتے ہیں
ادا جس حال میں نکلے اسے رفتار کہتے ہیں — سخن جو جی کو لے جاوے اسے گفتار کہتے ہیں
سند منصور ہے یہ بھی ہمیں راہِ محبت میں — سر دار آئے جس کا سر اسے سردار کہتے ہیں
اگر دل صاف ہے کب کوہ ہے دیدار کا مانع — جو ہووے سدراہ یار اسے دیوار کہتے ہیں
کٹی شب انتظار یار میں پر کچھ نہیں دیکھا — نہیں معلوم کس کو دولت بیدار کہتے ہیں
نگاہ مست تیری کس قدر خونریز عالم ہے — عبث آنکھوں کو تیری نرگس بیمار کہتے ہیں
وہ عاقل جس نے دیکھیں مجنوں کی یہ سمجھے ہے — جو ہو مست نگاہ یار اسے ہشیار کہتے ہیں
ترے کوچے میں جو آئے وہ نقد دین و دل لائے — بجا ہے اب جو تیری گرمی بازار کہتے ہیں
فقط زاہد کی کج فہمی تھی ورنہ کچھ نہ تھا قضیہ — وہ محرابیں کہے ہم ابروئے خمدار کہتے ہیں
نہیں ہے اپنا شیوہ شاعری کا فردؔ پر ہم نے — کیا نذر نیاز ان کی جو بے اشعار کہتے ہیں

(۳۹)

فردؔ کی دوسری غزل پیش ہے۔ اس غزل میں فردؔ کا ایک دوسرا رنگ ہے۔ اس غزل کی مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فردؔ کا تجربہ بہت ہی پختہ ہے۔ اس غزل میں فردؔ نے نالہ، دل، فصل گل، آتش گل، رقیب، وصل، عشق، افسوں اور سحر جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کا استعمال دوسرے شعراء سے بہت ہی مختلف ہے۔ فردؔ نے ایک نئے انداز پر ان الفاظ کو استعمال کر کے اپنی شاعری کو پُر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود فردؔ کو ان کی شاعری افسوں و سحر معلوم

ہو رہی ہے۔غزل ملاحظہ ہو ؎

نالے پیہم دل سے اب آنے لگے　　حضرت دل شاید اب جانے لگے
بات میری ہر کوئی پانے لگے　　میراچرچا اب یہاں لانے لگے
ہمصفیرو! اب کے فصل گل میں تم　　آتش گل اور بھڑکانے لگے
زور بازو پر تمہارے اے رقیب　　ہم کو سوسو رنج پہنچانے لگے
دل گیا پر وصل بھی حاصل نہیں　　عشق سے ہم سخت گھبرانے لگے
دیکھتے تھے ہم تماشا غیر کا　　اب تماشا اپنا دکھلانے لگے
خوب ہم سمجھے ہیں باتیں آپ کی　　غیر کی خاطر سے جھنجھلانے لگے
شعر ہے اے فردؔ یاافسوں و سحر　　آپ بھی یہ طرز فرمانے لگے

(۴۰)

فردؔ نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ان کے کلام میں نعت، مراثی اور منقبت بھی شامل ہیں۔مراثی میں ان کا رنگ صاف ہے۔اشعار میں سلاست اور روانی ہے۔ساتھ ہی مرثیہ کے اوصاف پر پورے اترتے ہیں۔فردؔ کی اردو مرثیہ نگاری کامیاب مرثیہ نگاری ہے۔واقعہ کربلا کی المناکی اور اہل کربلا کے درد وغم کو موثر انداز میں نظم کیا ہے۔مراثی میں درد اور سوز ہے۔یہ ان کے دل کا سوز ہے جو ان کے کلام سے مترشح ہوتا ہے۔فردؔ کے مرثیہ میں زبان کی سلاست، الفاظ کی فصاحت، تعبیر کی دلکشی، بندش کی چستی، واقعات اور احوال کی منظرکشی بھی پائی جاتی ہے۔اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اردو شاعری میں فردؔ کا رنگ پختہ ہے اور ان کی شاعری میں انفرادیت ہے۔مرثیہ کے اشعار پیش ہیں ؎

اس طرح قافلے پھرتے ہوئے کم جاتے ہیں　　جس طرح آج کے دن اہل حرم جاتے ہیں
کف افسوس سبھی ملتے بہم جاتے ہیں　　تر بہ تر اشک سے سرتابقدم جاتے ہیں
کاروا نند و ندارند وراء و جر سے　　نہ انیسے نہ رفیقے نہ کسے ہم سفرے
سازو سامان سفر بے سروسامانی تھی　　دست تقدیر میں سونپے ہوئے تھے کام سبھی
سب کی آنکھوں سے تھا خونناب کا دریا جاری　　تھی اٹھی سب کے دل وجاں سے تمنائے خوشی

رہرواں نند شکستہ دل و خستہ جگرے — جز غم ودرد ندارند انیسے دگرے
ضبط نالہ کریں تو سینہ پھٹا جاتا ہے — نہ کریں گریہ تو دل غم سے جلا جاتا ہے
ناتوانی سے بدن اپنا گراجاتا ہے — صبر کا تاب وتواں دل سے اٹھا جاتا ہے
رہ دراز است مراطاقت رفتار نماند — تا بعمرم بجز از رنج سروکار نماند
(۴۱)

وہ ۲۴ رمحرم الحرام ۱۲۶۵ مطابق ۲۱ ردسمبر ۱۸۴۸ء کواس دارفانی سے رخصت ہو گئے۔

(۴)

مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی

محمد سعید نام، حسرتؔ تخلص، شمس العلماء لقب، صوبہ بہار کے مشہور عالم تھے۔آپ کے والد کا نام منشی واعظ علی تھا۔آپ کی ولادت ۲۷ رذی قعدہ ۱۲۳۱ھ میں ہوئی۔ابتدائی درسی کتابیں مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے پڑھیں۔پھر مولوی ابوالحسن منطقی سے تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد لکھنؤ گئے۔اور وہاں مولانا حسن علی ہاشمی سے حدیث اور تفسیر کی سند حاصل کی۔پھر کانپور آئے،اور مولانا سلام اللہ کی خدمت میں رہ کر کتب درسیہ کو پڑھا اور مشکل مقامات کا حل کیا۔کانپور سے واپسی کے بعد اپنے گھر آئے۔اور درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔اور رشد وہدایت کا کام بھی انجام دیتے رہے۔سینکڑوں علماء نے آپ سے تعلیم پائی۔اور حدیث کی سند حاصل کی۔قسطاس البلاغہ اور مقصد البلاغہ آپ کی علمی یادگار رہے۔ (۴۲)

آپ کی ذات جامع کمالات تھی۔ظاہری وباطنی دونوں علوم سے متصف تھے۔طبقہ شعراء میں بھی اسی طرح مشہور تھے جس طرح طبقہ صوفیاء اور علماء میں شہرت تھی۔خاندانی ریاست نے فارغ بنادیا تھا۔اس لئے علم کی خدمت کا کافی موقع دستیاب ہوا۔(۴۳)

آپ کو شاعری کا ذوق تھا۔اس فن میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے۔سعیدؔ اور حسرتؔ تخلص فرماتے تھے۔فارسی میں زیادہ طبع آزمائی فرماتے،پٹنہ میں فارسی طرحوں میں مشاعرے ہوتے تھے،ان میں برابر شریک ہوتے تھے،طبیعت عزلت پسند تھی،اور گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔آپ کے اوقات

درس وتدریس، ہدایت وتلقین اور اوراد ووظائف میں صرف ہوتے تھے۔ امراء وحکام کی ملاقات کو نہیں جاتے تھے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب آپ کو ملا تھا۔ **(۴۴)**

آپ کی تصنیفات میں کلیات مسمی بہ قسطاس البلاغہ اور اس کا ضمیمہ مقصد البلاغت قابل ذکر ہے۔ قسطاس البلاغہ پانچ حصوں پر منقسم ہے، چوتھے حصے میں اردو کی غزلیں ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حسرتؔ کو الفاظ کے دروبست پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے یہاں فنی شائستگی ہے۔ اور جذبہ کا گداز بھی ہے۔ ان کے انداز بیان میں بے ساختگی بھی ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جس طرح فارسی شاعری میں کمال حاصل تھا، اسی طرح اردو شاعری کو بھی انہوں نے سنوارنے کی کوشش کی۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ ہے۔ اور قادرالکلامی کے ساتھ انفرادیت بھی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

بہے ہیں اشک خوں رشک حنائے یار پر کیا کیا — پسے عشاق کے دل دست وپائے یار پر کیا کیا
دکھا کر اپنا جلوہ کر دیا ہر شئے سے مستغنی — حسد ہے بادشاہوں کو گدائے یار پر کیا کیا
رہا محروم میں بھی خوبی مقسوم سے ورنہ — لٹی دولت در دولت سرائے یار پر کیا کیا

حسرتؔ کی شاعری میں زندگی کا فلسفہ بھی ہے اور انسان کے وجود کے سربستہ راز پر اظہار خیال بھی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات اور عارفانہ نظریات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام میں زبان کی صفائی، بیان میں سلاست اور خیالات میں پاکیزگی بھی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو ؎

واقف سر نہاں ہوں کیا کہوں — میں تو گونگے کی زباں ہوں کیا کہوں
واجب وممکن میں ہے ایک ربط خاص — راز دار کن فکاں ہوں کیا کہوں
درد کا مجھ میں اثر ہے کچھ سعیدؔ — میں سراغ رفتگاں ہوں کیا کہوں

زخم دل پر مرے ہنس ہنس کے چھڑکتے ہو نمک — یہ مزا عشق کا حاصل نہ ہوا تھا سو ہوا
کیا تڑپ کر دل مجروح نے کی بے لطفی — خون سے تر دامن قاتل نہ ہوا تھا سو ہوا **(۴۵)**

حسرتؔ عظیم آبادی ایک کامیاب نعت گو بھی تھے۔انہوں نے اس صنف کی طرف خصوصی توجہ دی۔اور باضابطہ طور پر بڑے ہی اہتمام کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا۔لیکن جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے انکا فارسی کلام اردو کلام سے بہتر ہے۔اس لئے فارسی زبان میں ان کی متعدد نعتیں دستیاب ہوتی ہیں، جو زبان و بیان اور موضوعات کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔اردو کلام سے مجھے ایک طویل نعت دستیاب ہوئی۔شاعری میں سعیدؔ اور حسرتؔ دونوں تخلص فرماتے تھے۔اس نعت میں انہوں نے سعید تخلص فرمایا ہے۔انہیں انحضرتؐ سے والہانہ شیفتگی تھی۔چنانچہ ان کی نعت کا ایک ایک لفظ عشق وعقیدت کے رنگ میں ڈوبا ہوا اور خلوص ومحبت کے نور سے منور ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں ان کی شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔یہ شعر ان کی بیقراری دل اور سوز جگر کیا حقیقی غماز ہے ؎

حالت تو ذرا دیکھئے مجھ خستہ جگری کی
آنسو ہیں بھرے آنکھوں میں اور لب پہ فغاں ہے

حسرتؔ کو علم معانی اور علمی بدیع پر بھی مکمل دسترس حاصل تھا۔ان کے کلام میں صنائع لفظی اور معنوی دونوں پائے جاتے ہیں۔مختلف صنعتوں سے کام لے کر انہوں نے کلام کو دل کشی بخشنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں تشبیہ واستعارہ کو برمحل استعمال کیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے کلام میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہو ؎

قد تیرا نہال چمن مطلبی ہے گلزار خلیلی کا یہ سرو رواں ہے
ٹکڑا ہے کوئی چاند کا پیشانی پر نور ہیں تیر مشرہ ابروئے خمدار کماں ہے
دو جام ہیں یہ بادہ توحید سے لبریز بیخود انہیں دو جام سے ہر ایک دل وجاں ہے

ان کی شاعری میں تلمیحات کا بھی استعمال موجود ہے۔اس کے لئے ایک شعر پیش ہے ؎

ہے اہل کبائر کے لئے تیری شفاعت اس بات کا تو صاف حدیثوں میں بیاں ہے

(۴۶)

آپ کی وفات ۴؍شعبان ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۱؍اپریل ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔محلہ مغلپورہ میں اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(۵)

مولانا سید شاہ محمد اکبر اکبرؔ داناپوری

سید شاہ محمد اکبر نام، اکبرؔ تخلص، خلف حضرت سید شاہ محمد سجاد، بڑے مشہور عالم تھے۔ داناپور سادات کی ایک قدیم بستی ہے، اور عظیم آباد پٹنہ سے چھ کوس سمت مغرب واقع ہے یہاں آپ کا مسکن تھا، اور یہاں کی خانقاہ کے آپ سجادہ نشیں تھے، اس بستی میں اکابر اولیاء، مثلاً حضرت سید شاہ محمد یٰسین صاحب اور حضرت سید جہانگیر آسودہ خواب ہیں۔ اکبر داناپوری علوم ظاہری میں کامل اور علوم باطن میں عارف تھے۔ آپ کے خاندان میں بڑے بڑے صوفیاء اور آپ کے آباؤ اجداد میں بڑے بڑے اولیاء گذرے ہیں۔ آپ کے چچا اور پیر حضرت سید شاہ محمد قاسم مصنف رسالہ ''نجات قاسم'' کی صفات درویشی اور حق پرستی مشہور تھی۔ آپ کے پدر بزرگوار بھی بڑے عارف و کامل تھے۔ (۴۷)

آپ کی اردو شاعری مستند تھی۔ مولانا وحید الہ آبادی سے آپ کو تلمذ تھا۔ مختلف اصناف سخن مثلاً قصیدہ، غزل، قطعہ اور تاریخ گوئی پر کاوش فرماتے، مگر نعت شریف میں زیادہ فکر فرماتے تھے۔ اور کیوں نہ ہو آپ کو جب محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا تو اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ کلام کے اس مبارک صنف میں آپ زیادہ توجہ فرمائیں۔ بکثرت لوگ آپ سے رشد و ہدایت کی تعلیم کے علاوہ فن شاعری کی تعلیم سے بھی فیضیاب ہوئے، بعض کے نام یہ ہیں۔۔۔

سید شاہ محمد کبیر داناپوری متخلص بہ عرفانؔ یہ حضرت اکبر کے بھتیجے تھے، منشی امیر اللہ شوقؔ ساکن اجمیر شریف، منشی نثار علی نثارؔ ساکن آگرہ، شیخ محمد ظہورؔ صاحب ظہور عظیم آبادی، سید محمد نصر اللہ نصرؔ رئیس داناپوری، شاہ محمد ادریس ادریسؔ اور سید مبارک حسین مبارکؔ عظیم آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ (۴۸)

مولانا محمد اکبرؔ وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

''وحیدؔ الہ آبادی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ یہ خواجہ حیدر علی آتشؔ کے منتخب یادگار تھے۔ طبیعت گداز، مزاج عاشقانہ، بندش نفیس، زبان دلچسپ، قابلیت فن میں انتہا درجے کی معلومات، میری طبیعت کو آپ سے اتحاد پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ میرے والد ماجد سے اور آپ

کے والد ماجد سے روحی ارتباط تھا۔ وہ اور بھی از دیاد محبت کا سبب قرار پایا۔ میں نے بے تکلف آپ کی شاگردی قبول کر لی۔ آپ نے مجھے اس فن کے اصول بتا دیئے۔ اور میری غزلوں کو زیور اصلاح سے آراستہ فرما دیا۔'' (۴۹)

اکبرؔ داناپوری کو ان کے والد نے نصیحت کی:

''میں تمہیں شعر کہنے کو منع نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ لغو اور فضول نہ کہنا۔ تصوف کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اس میں اپنی قابلیت کو صرف کرنا کہ تمہیں بھی فائدہ پہنچے اور سننے والے بھی نفع اٹھائیں۔ شرف آگین مضامین اور ناپاک نظم سے اپنے خامہ کی زبان کو آلودہ نہ کرنا۔ ایسے شاعر جو بازاری اور فاحشہ عورت کی زبانیں اور ان کی شرمگیں حرکات وسکنات کو حسن تغزل قرار دیتے ہیں، اس سے بہت اجتناب کرنا۔ اہل فن اور اہل علم کے نظر میں اس رنگ کا شاعر ہزلیات گو شاعر سے بھی زیادہ بے وقعت اور ذلیل معلوم ہوتا ہے۔'' (۵۰)

اکبرؔ کی شاعری میں والد کی نصیحت کی پوری جھلک موجود ہے۔ جبکہ ان کے کلام میں استاذ وحیدؔ الہ آبادی کا رنگ غالب ہے۔

آپ کا دیوان ''تجلیات عشق''، ''دیوان اکبر'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نعتیہ کلام سے مزین ہے۔ اکبر داناپوری ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے ممتاز و منفرد مقام کے حامل ہیں۔ آپ کا دل عشق رسولؐ کے جذبہ سے سرشار تھا۔ (۵۱)

سید احمد اللہ ندوی تحریر کرتے ہیں:

حضرت اکبرؔ داناپوری مختلف اصناف سخن مثلاً قصیدہ، غزل، قطعہ اور تاریخ گوئی پر کاوش فرماتے۔ مگر نعت شریف میں زیادہ فکر فرماتے تھے۔ اور کیونکہ ہو آپ کو جب محبوب رب العالمین سے والہانہ عشق تھا۔ تو اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ کلام کے اس مبارک صنف میں آپ زیادہ توجہ فرمائیں۔ (۵۲)

اکبرؔ داناپوری کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں عشق کی آگ چھپی ہوئی ہے۔ جو ہر موقع پر ان کے اشعار میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ ان کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے فحش اور لغو باتوں سے اپنے کلام کو پاک رکھا ہے۔ تصوف کا عارفانہ رنگ ان کے

کلام میں نمایاں ہے۔کلام ملاحظہ ہو ؎

ہوجائے حال اور سے کچھ اور حور کا ۔۔۔ دکھلا دوں میں ابھی جومرقع حضور کا
پر توفگن ہو گررخ روشن حضور کا ۔۔۔ موسیٰ کو یاد بھی نہ رہے نام طور کا
کوچہ میں اس حسیں کے یہ عالم ہے نور کا ۔۔۔ جلوہ ہرایک ذرہ میں ہے برق طور کا
جس عضو پر نگاہ پڑی رہ گئی وہیں ۔۔۔ وہ دلربا تمام سراپا ہے نور کا
ممکن ہے تیری کنہ تلک جاسکے نہ عقل ۔۔۔ ہر ذرہ اک جہاں ہے تیرے ظہور کا
اپنے سوا نظر میں سماتا نہیں کوئی ۔۔۔ اللہ رے دماغ کسی کے غرور کا
کس طرح آئیں ہوش میں ہم رندساقیا ۔۔۔ منہ سے لگا ہے جام شراب طہور کا
پردے میں وعظ کے ہے یہی ذکر روز شب ۔۔۔ اللہ رے شوق حضرت واعظ کو حور کا
جب بندے ہیں توسر سے قدم تک خطا ہیں ہم ۔۔۔ کرتے رہیں حساب کہاں قصور کا
شیطاں کے حال سے نہیں واقف جہاں میں کون ۔۔۔ یاروں بہت برا ہے نتیجہ غرور کا
اکبرؔ فشار قبر سے کیا خوف ہو مجھے ۔۔۔ پیرو ہوں میں جیب خدائے غفور کا

(۵۳)

عشق پر بہت سے شعراء نے اشعار کہے ہیں اوراس کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اکبرؔ کی شاعری میں عشق کا تصور ہی عجیب ہے۔وہ اپنے عشق کو عشق حقیقی کے طور پراستعمال کرتے ہیں۔اوروہ عشق ایسا جوعشق مجازی سے بہت ہی مختلف اورالگ ہے۔چنانچہ ان کے عشق کے سامنے لیلیٰ مجنوں کے عشق کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

اکبرؔ کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

میرے آنے سے یہ آباد ہوا خانہ عشق ۔۔۔ یوسفستاں نظر آنے لگا ویرانہ عشق
کعبہ پاسکتاہے کب منزلت خانہ عشق ۔۔۔ عرش کرتاہے طواف در کاشانہ عشق
گنج سرمدہے نصیب دل دیوانہ عشق ۔۔۔ دولت آباد حقیقت ہے یہ ویرانہ عشق
بحرذخاّر ہے کونین،مدینہ ہے صدف ۔۔۔ جسم نورانی حضرت دُرِ یکدانہ عشق
ہمہ دم رہتے ہیں سرشارمے حب علیؓ ۔۔۔ منہ سے ہروقت لگا رہتا ہے پیانہ عشق

جلوۂ نور رخ یار سے روشن یہ ہوا　　بن گیا مطلع خورشید سیہ خانۂ عشق
ابھی اڑ جاؤں لگا کر سوئے شمع یثرب　　ہاتھ آجائے جو مجھ کو پر پر وانہ عشق
بھول جائیں ابھی سب قصہ لیلیٰ مجنوں　　سن لیں عشاق ہمارا اگر افسانہ عشق
فکر دنیا ہے نہ اندیشہ عقبیٰ اکبرؔ　　دونوں عالم کو ہے بھولا ہوا مستانہ عشق

(۵۴)

اکبرؔ کی شاعری میں اخلاق ومحبت، اعلیٰ کردار، عارفانہ خیالات، رکھ رکھاؤ کے ساتھ محبوب کا مختلف انداز بھی پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ ان کے اشعار کے پڑھنے کے بعد کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک تجربہ کار ناصح کے حیثیت سے موجود ہیں، تو کبھی ایسا لگتا ہے کہ ایک تجربہ کار عاشق کا تجربہ بھی ان کے پاس موجود ہے۔ ساتھ ہی زمانہ میں وقت گزارنے کا کیا انداز ہونا چاہئے اس سے بھی وہ پوری طرح واقف ہیں۔ اور اس کارگاہے جہان کے کارخانے کو دیکھ کر چلانے والے کے سلسلہ میں بھی انہیں پوری واقفیت ہے۔ یہ پورا مزہ ان کی غزل میں موجود ہے۔

غزل ملاحظہ ہو ؎

ملے اسی سے جو ہو آدمی ٹھکانے کا　　تمہیں خبر نہیں کیا حال ہے زمانے کا
خیال آپ کو ہو میرے گھر مین آنے کا　　کہاں نصیب یہ اپنے فقیر خانے کا
جمال اپنا دکھاؤ ہمارا دیکھو حال　　مزا اسی مین ہے کچھ دیکھنے دیکھانے کا
قتیل ناز سکتے ہیں ہاتھ اوچھے تھے　　سبب یہ ہے مرے قاتل کے منہ چھپانے کا
دکھادی ایک جھلک اور کرلیا گھونگٹ　　بلائے جان ہے یہ انداز منہ چھپانے کا
جمال یار سے ہوتی ہے روح کو تفریح　　یہی سبب ہے جو ہے عمر کے بڑہانے کا
چٹک رہے ہین بگڑ کر گلاب کے غنچے　　نہ آیا ڈھنگ انہین تیرے مسکرانے کا
دہان زخم سے تحسین کی ہے بلند صدا　　یہ ڈھنگ خوب ہی قاتل کے دل بڑہانے کا
اجل ٹھہر ابھی جلدی نکر خدا کے لئے　　کہ انتظار ہے اون کے جواب آنے کا
کھچا تو خوب ہی نقشہ لب ودہن کا ترے　　نہ کھیچ سکا مگر انداز مسکرانے کا
جو آپ آئین تو ہم فرش بوریاں بچھوائین　　دکھائین تم کو تکلف غریب خانے کا

پڑے ہین ہاتھ جو اوچھے تو زخم ہنستے ہین ۔۔۔ یہ ڈھنگ لے اڑے قاتل کے مسکرانے کا
حضور آئے مرے گھر کی بڑھ گئی رونق ۔۔۔ مزاج عرش پہ ہے اب فقیر خانے کا
پیا ہے تم نے ابھی جس مین شربت اے زاہد ۔۔۔ کہان لیا یہ ہے ساغر شراب خانے کا
چڑھے ہوئے ہین بہت اندنون رقیب کے سُر ۔۔۔ جناب من یہ نتیجہ ہے سر چڑہانے کا
جناب غیر بھی حاضر ہے جان نثار بھی ہے ۔۔۔ کہان ہے تیغ یہ موقع ہے آزمانے کا
لیا محبت صیاد نے یہ ہاتھ مین دل ۔۔۔ قفس مین خواب بھی دیکھا نہ آشیانے کا
کسی سے ٹوٹ گیا ہے درست کردین آپ ۔۔۔ حضور جانتے ہین کام دل بنانے کا
جو محتسب کے چلا ساتھ میکدے پہونچا ۔۔۔ کہ خضر راہ یہی ہے شراب خانے کا
یہ کارگاہ جہان ہے عجیب حیرت زا ۔۔۔ چلانے والا ہے کون ایسے کارخانے کا

رقیب کی بھی ہوا وہ نہین رہی اکبرؔ
بگاڑ ہم سے موافق ہے اب زمانے کا **(۵۵)**

اکبرؔ اردو کے قادرالکلام شاعر تھے۔علم عروض،علم معانی،علم بیان اور علم بدیع پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ان کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی پورے طور پر موجود ہے۔تشبیہ و استعارہ،اشارہ وکنایہ،تلمیح،حسن تعلیل اور صنعت تکرار وغیرہ کا استعمال بھی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔جس سے ان کے قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔بہت سی جگہ پر مبالغہ کا بھی استعمال کیا ہے۔لیکن مبالغہ ایسا نہیں کہ جس میں جھوٹ کا پہلو ظاہر ہو بلکہ مبالغہ کا استعمال اس انداز پر کیا گیا ہے،جس سے شاعری میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔صنائع کا استعمال ان کی شاعری میں ملاحظہ کیجئے ؂

تشبیہ واستعارہ

تمہارے روئے روشن کی قسم کھائی ہے خالق نے ۔۔۔ کلام اللہ میں یا شاہ دیں شمس الضحیٰ تم ہو

تینوں قبریں روضۂ اقدس میں ہیں اس شان سے ۔۔۔ خط کوفی میں لکھا ہو جیسے نام اللہ کا

اشارہ وکنایہ

مصحف ناطق رخ پُرنور ہے اس ماہ کا　　　اب روئے سلطان دیں توگرا ہے بسم اللہ کا

تلمیح

بلال آپے سے باہر ہو گئے اویس اپنی ہستی سے　　　ادا اچھی ہے سیرت خوب ہے صورت کا کیا کہنا

حسن تعلیل

سبب یہ ہے جو طوبیٰ میں ہے اس درجے کی رعنائی　　　یہی ہے جس نے سایہ پالیا ہے آپ کے قد کا

صنعت تکرار

ملک نے مجھ سے پوچھا قبر میں تو کس کا عاشق ہے　　　کہا میں نے محمد کا محمد کا محمد کا

آپ کے نعتیہ کلام میں تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔اور یہ رنگ اس قدر نمایاں اور گہرا ہے کہ اگر اس کو منفرد طور پر پیش کیا جائے تو نعت کے اشعار سے الگ ہو کر غزل کے اشعار ہو جاتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

رتبہ بلند عرش سے بھی اس زمین کا　　　جس جس جگہ پڑا قدم اس نازنین کا

تصور آ گیا پھر اس کے گیسوئے معنبر کا　　　وبال جان ہوا نظارہ آخر سنبل تر کا

کیا نازک شفاف ہے جلد رخ جاناں　　　آنکھوں میں ضیا چہرے پہ ہے رنگ حیا کا

یہ دنداں آبیاری میں کہیں روشن ہے گوہر سے
یہ پتلے ہونٹ نازک ہیں بہت برگ گل تر سے

اکبؔر دانا پوری علم عروض میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ان کے نعتیہ اشعار بحر ہزج مثمن سالم۔مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن میں ملاحظہ کیجئے ؎

حضور اس عالم ظاہر میں اب تشریف لاتے ہیں
زمیں سے عرش تک مژدہ گیا ہے آمد آمد کا

نہ ہوا و لادکو امید کیوں اس ذات اقدس سے
گناہ حضرت نے بخشایا ہے اپنے جدا مجد کا

خلاصہ یہ کہ اکبؔر داناپوری اردو کے خوش فکر، عظیم المرتبت اور قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں قابل قدر خدمات انجام دیئے۔

(۶)
مولانا ظہیر احسن شوقؔ نیموی

ظہیر احسن نام، شوقؔ تخلص، شیخ سبحان علی کے صاحبزادے۔ ۴ جمادی الاولی بروز بدھ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کو صالح پور ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالخیر اور ظہیرالاسلام مادہ تاریخ قرار پایا۔ آپ کا آبائی وطن نیمی ضلع پٹنہ تھا۔ یہ ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ کی ایک نہایت قدیم اور مشہور بستی ہے۔ یہ شہر پٹنہ کے پورب دکھن جانب تقریباً ۲۸ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد شوق ہوا کہ اب دوسرے علمی مراکز میں پہنچ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی جائے۔ اور علم کی تشنگی بجھائی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے وہ سب سے پہلے پٹنہ (عظیم آباد) پہنچے، اور شمس العلماء مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے ہونہار طالب علم کی ہمت افزائی کی۔ اور ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ مولانا نیموی یہاں کئی سال رہے۔ کچھ کتابیں مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی سے اور کچھ کتابیں دوسرے اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر کسی دوسرے بڑے علمی مراکز میں جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس کے بعد غازی آباد پہنچے۔ جہاں مولانا مفتی محمد فرنگی محلی سے مدرسہ چشمۂ رحمت میں فیض حاصل کیا۔ اور مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی سے بھی علم حاصل کیا۔ پھر لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر مزید علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

شوقؔ نیموی نے مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی اور حضرت تسلیمؔ لکھنوی سے شعر وادب کا ذوق پایا اور کمال حاصل کیا۔ غازی پور میں تعلیم کے دوران ہی شعر وشاعری شروع کر دی۔ شوقؔ تخلص

کرتے تھے۔حضرت شمشادؔ لکھنوی سے اصلاح سخن لیا۔پھر تسلیمؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔حضرت مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی کے پاس چار غزلیں بھیجیں۔مولانا نے خوب تعریف کی اوران کی صلاحیت کا اعتراف کیا۔ (۵۶)

شوقؔ نیموی کو شعروادب سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ ادبی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔غازی پور اور لکھنؤ کی شعری وادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں وسعت پیدا ہوئی۔اور انہیں اردو زبان کے رموز ونکات،طریقہ استعمال،الفاظ کا برمحل استعمال،صحیح معنی ومفہوم،محاورات اور روزمرہ کے الفاظ کی پوری جانکاری ہوگئی۔متقدمین اور متاخرین شعراء کے ہزاروں اشعار یاد کرلئے۔عربی اور فارسی کے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں،اس میں انہیں پوری مہارت ہوگئی۔ شوقؔ نیموی نے اس مہارت سے اردو شاعری کو بہت فائدہ پہنچایا۔اور اس سلسلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ازاحۃ الاغلاط،اصلاح،ایضاح اور سرمۂ تحقیق جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ان کتابوں میں علامہ نیموی کا انداز نہایت معیاری اور تحقیقی ہے۔انہوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اہل لغت عربی اور فارسی شعراء کے اشعار پیش کر کے مستند کیا ہے۔جس سے اردو زبان وادب کو بہت فائدہ پہنچا،اوران کی تحقیق کو ادباء اور شعراء نے قبول کیا۔چند نمونے ملاحظہ کیجئے ؎

ازاحۃ الاغلاط میں لفظ حجلہ کی تحقیق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''حجلہ'' بہ فتح حا پردہ کہ برائے عروس سازند ازصحاح وقاموس وتاج ومنتہی الارب وبہار عجم وبالضم درست نیست۔

یعنی: حجلہ حا کے فتحہ (زبر) کے ساتھ،اس پردہ کو کہتے ہیں جو دلہن کے لئے بنایا جائے۔ دیکھئے صحاح،قاموس،تاج،منتہی الارب اور بہار عجم ضمہ (پیش) کے ساتھ درست نہیں ہے۔

جہد کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہد بالفتح کوشش ازصراح ومنتخب اللغات ومنتہی الارب وبہار عجم بالکسر درست نیست،نظامی درمخزن الاسرار گوید ؎

دست وفا در مکر عہد مکن نانشوی عہد شکن جہد کن

امیر خسرو در ''لیلی مجنوں'' گوید ؎

صد طرفہ سخن چو شکر وشہد نمود مگر بہ مثنوی جہد

یعنی: جہد فتحہ (زبر) کے ساتھ کوشش کے معنی میں ہے۔ دیکھئے صراح ومنتخب اللغات، منتہی الارب اور بہار عجم۔ کسرہ (زیر) کے ساتھ درست نہیں۔ نظامی اور امیر خسرو نے زبر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

اس طرح اس کتاب میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ کی تحقیق کی ہے جو اردو میں مستعمل ہیں۔ اس رسالہ کو پڑھ کر نواب رامپور کلب علی خاں بہت متاثر ہوئے۔ اور علامہ نیموی کو لکھنو بلایا۔ خلعت اور انعام سے نوازا۔ اس رسالہ کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد بہت متاثر ہوئے۔ اوران کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

اسی طرح ان کی دوسری اہم تصنیف ''اصلاح'' ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے تعقید لفظی، حشو، پہلوئے ذم، متروکات، تذکیروتانیث، املاء، ایطاء وغیرہ سے بحث کی ہے۔ اور تائید میں اردو کے شعراء کے اشعار پیش کئے ہیں۔

املاء کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

''اژدہام، ژسے اور چھوٹی ہ سے لکھنا غلط ہے۔ ازدحام زای تازی وحائے حطی سے لکھنا چاہئے۔ اکسیر کو اکثیر ث سے لکھنا غلط ہے۔ اوس، اودھر میں متقدمین برابر واو سے لکھا کرتے تھے، مگر متاخرین بھی واو کو حذف کر کے الف پر پیش دیدیا کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک واو کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے۔ برات کو بارات لکھنا صحیح نہیں ہے۔ پاؤں کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

پاؤں کا املا مختلف فیہ ہے۔ دلی والے پانو لکھتے ہیں اور ردیف واو میں لاتے ہیں۔ اور لکھنووالے پاؤں لکھتے ہیں۔ ردیف نون میں داخل کرتے ہیں۔ اور بعضے پانوں بھی لکھتے ہیں۔ یعنی الف کے بعد بھی نون لکھتے ہیں۔

ڈانکا۔ عوام نون سے لکھتے ہیں، اور سحر مرحوم نے بھی خندان کا افشاں کی زمین میں یہ شعر لکھا ہے ؎

جلا کر ٹھوکروں سے نقد دل مردوں کے لیتے ہیں
سحر شہر خموشاں میں بھی اب پڑنے لگا ڈانکا

مگر ڈاکو میں نون نہ ہونا ڈاکے کے بے نون ہونے پر دلالت کرتا ہے۔اس کے علاوہ نون جمہور شعراء کے خلاف ہے۔واجد علی شاہ کے زمانے میں اس لفظ کی بحث آپڑتی تھی۔ قلقؔ،قبولؔ، برقؔ،طورؔ نامی شعراء موجود تھے۔سب نے اتفاق کیا کہ اس کو بے نون لکھنا چاہئے۔

اس طرح سے بہت سے الفاظ کی تحقیق اس کتاب میں موجود ہے۔

متروکات کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

آ چک:۔ یہ لفظ دوسرے شعراء کے یہاں آجا کی جگہ پر مستعمل ہے۔جلال لکھنوی نے اس کا استعمال اس طرح کیا ہے۔

کہیں آنکھوں میں آ چک نزع کی آسان ہو مشکل
نکل جائے وہ دم جو سدرہ ہے راہ میں تیری

علامہ نیموی کے نزدیک یہ لفظ رکیک ہے،اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے۔

آئیو، جائیو:۔علامہ نیموی کے معاصر شعراء کے یہاں یہ الفاظ مستعمل تھے۔لیکن انہوں نے اس کا استعمال ترک کر دیا تھا۔اس کے بجائے آنا جانا استعمال کرتے تھے۔اس طرح کے بہت سے الفاظ ہیں،جن کا تفصیل سے علامہ نیموی نے تذکرہ کیا ہے۔

سرمہ تحقیق جلال لکھنوی کے جواب میں تحریر کیا۔اس کتاب میں جلال لکھنوی کی ادبی اور تحقیقی لغزشوں کو اجاگر کیا۔ یہ کتاب زبان وادب کے لئے قیمتی سرمایہ ہے۔

جلال لکھنوی نے اپنی کتاب'' سرمایہ زبان اردو''میں لفظ روپیہ کے بارے میں لکھا تھا۔''روپیا''سکہ دار چاندی کو کہتے ہیں۔جمع اس کی فصحا روپے بولتے ہیں۔اور یہ جو ہائے مختفی سے روپیہ لکھا جاتا ہے،مئولف ہیچمدان کے عندئے میں غلط ہے۔اس کو رد کرتے ہوئے،علامہ نیموی نے لکھا کہ شاید جلال صاحب نے روپیہ بہائے مختفیہ اس لئے غلط سمجھ لیا کہ یہ لفظ ہندی ہے۔اور الفاظ ہندیہ کے اخیر میں ہائے مختفیہ نہیں لکھی جاتی ہے۔جیسے تارا،کلیجا اس قسم کے الفاظ بہائے مختفیہ لکھنا درست نہیں۔حالانکہ ایسا سمجھنا درست نہیں۔اصل یہ ہے کہ الفاظ ہندیہ کو بہائے مختفیہ لکھنا درست نہیں۔لیکن اگر کوئی لفظ ہندی سے فارسی کر دیا جائے تو اس کو ہائے مختفیہ کے ساتھ لکھنا درست ہے۔یہی وجہ ہے کہ متاخرین عجم نے ہائے مختفیہ کے ساتھ روپیہ کا استعمال کیا ہے۔

اس کے علاوہ جلال لکھنوی نے خود اپنی دوسری کتاب ''گلشن فیض'' میں روپیہ کو ہائے مختفیہ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

اس طرح کے بہت سے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں۔ انہوں نے اس کی تحقیق کی ہے۔ اور اس کو اردو میں صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔

شوقؔ نیموی نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ۔ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل مثنویاں کہی ہیں۔

نغمہ راز، سوز گداز، درد جدائی، صبح وصال، شام فراق۔ مثنوی سوز وگداز اور مثنوی نغمہ راز طویل ہیں، سوز وگداز میں سات سو سینتیس اور نغمہ راز میں پانچ سو چونتیس اشعار ہیں۔ بقیہ مثنویاں مختصر ہیں۔ درد جدائی میں انٹھانوے، صبح وصال میں اکاون اور شام فراق میں چھتیس اشعار ہیں۔

مثنوی سوز وگداز بہت ہی مشہور ہے۔ یہ مثنوی محمد حسن اور شام سندر کی محبت پر مشتمل ہے۔ یہ عشق ومحبت کی دلچسپ داستان ہے۔ اس مثنوی میں فطری اور تاریخی واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ انداز بیان فطری ہے۔ واقعہ کی مناسبت سے مناسب اور برمحل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ضرورت کے مطابق جزوی مسائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس مثنوی میں جذبات نگاری، منظر کشی اور قصہ نگاری کا بھرپور مظاہرہ ہے۔

شام سندر کی خوبصورتی کی تصویر کشی ملاحظہ کیجئے ؎

نظر آیا یکایک شور محشر　　پڑی آنکھ اک بت کافر ادا پر
پریوش، ماہ سیما، مہر طلعت　　بلا قامت، قیامت قہر آفت
دو زلفیں مو بمو شکل سلاسل　　خم گیسو کمند آہوئے دل
قیامت مانگ کی باریک تحریر　　رہ آب بقایا چشمۂ شیر
جبیں یا کوئی ٹکڑا چاند کا تھا　　سحاب زلف میں کچھ کچھ چھپا تھا
نگار ستاں چین چینی جبیں تھی　　خط موج شراب آتشیں تھی
بھنویں محراب ایوان فرخ تھیں　　سپہر حسن کی قوس قزح تھیں
جگر دوز حسینان تیر مژگاں　　اترتے تھے دلوں میں شکل پیکاں

شرارت مست آنکھوں میں بھری تھی — سبو میں مئے کہ شیشے میں پڑی تھی
نگاہ چشم پرفن فتنہ پرداز — قدح نوش شراب شوخی وناز
سوجھائی تھی یہی باریک بینی — کہ شمع حسن کی ایک لوتھی بینی
لب شیریں تھے رشک شہد وشکر — جو اب لذت قند مکرر
حلاوت یہ دم شکرفشانی — بھرآتا زاہدوں کے منہہ میں پانی
نظرآتے جواوس گل کے کہیں گال — ٹپک پڑتی جناب شیخ کی رال
دہن تھا غنچہ سربستہ راز — گل عارض بہار گلشن ناز **(۵۷)**

یہ مثنوی بہت مشہور ہوئی۔اور ہر جگہ اس کی پذیرائی ہوئی۔داغؔ دہلوی نے اس کی بیحد تعریف وتوصیف کی ہے۔

مثنوی نغمہ راز دوسری طویل مثنوی ہے۔اس کا انداز بیان فطری ہے۔اس میں جذبات کی فراوانی ہے۔واقعہ کے ہر ہر جز کی کامیاب منظرکشی کی گئی ہے۔زبان وبیان نہایت ہی سادہ ودلچسپ ہے۔ساتھ ہی حقیقت پر مبنی ہے۔جب یہ مثنوی چھپی تو امیرؔ مینائی،تسلیمؔ لکھنوی،شمشادؔ لکھنوی اور یاسؔ لکھنوی جیسے اساتذہ شعراء نے اس کی تعریف کی۔

معشوقہ کے خط کے جواب میں اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اے مری جاں مری محرم راز — کچھ مرے دل کا سنو سوز وگداز
آتش شوق بھرک اٹھتی ہے — آہ کی برق کڑک اوٹھتی ہے
اب اولٹتا ہے کلیجہ میرا — غم سے پھٹتاہے کلیجہ میرا
ہجر کی اب نہیں طاقت مجھ کو — مارڈالے گی یہ فرقت مجھ کو
ہجر میں اب یہ مرا عالم ہے — صدمۂ درد سے لب پردم ہے
ضعف سے تن ہے سراپا لاغر — بن گیا ہے رگ تاربستر
نالے ہوئے ہیں جورخصت دل سے — لب تک آتے ہیں بڑی مشکل سے
میں ہوں یابستر رنجوری ہے — ایک ہمدم غم مہجوری ہے
شمع دل سوزی مری بالیں پر — روتی رہتی ہے الم میں شب بھر **(۵۸)**

شوقؔ نیموی نے قصیدے بھی کہے ہیں۔ان میں بھی ان کی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ان کے قصیدے میں حسین اور پرشکوہ الفاظ،زورِکلام،جدت بیان اور بلند پایہ مضامین پائے جاتے ہیں۔فارسی ترکیب کا استعمال عمدہ طریقے پر موجود ہے۔تشبیب،گریز،مدح اور دعا کے موقع پر خوبصورت اور دلکش اسلوب پایا جاتا ہے۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی شان میں جو قصیدہ کہے ہیں،اس سے ان کی جولانی طبع،قدرت بیان اور قادر الکلامی نمایاں ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

جناب فضل رحمن پر ہوا جب فضل رحمانی — دل اقدس بنا آئینہ اسرار ربانی
خدا نے آپ کو آئینہ قدرت بنایا ہے — نظر آتی ہے جس میں شان حسن صنع یزدانی
توجہ آپ کی جس پر ہوئی وہ ہوگیا کامل — اگر تھا ذرہ آسا بن گیا خورشید عرفانی
مسخر کر لیا دم مین پریزدان معنی کو — سویدائے دل پر نور ہے مہر سلیمانی
اگر دیکھے عرقہائے جبین پاک کے قطرے — ندامت سے ہو پانی پانی آب دُرعمانی
جو بیٹھے آپ کے حلقے میں اطمنان دل پائے — حضور فضل رحمن کیا چلے افسون شیطانی
اگر چاہیں سلاطیں جہاں پر ہو شرف حاصل — کہو خاقان وقیصر سے کریں حضرت کی دربانی
سریرآرائے اقلیم ولایت وہ ہوئے جب سے — ملا ہے بوریا کو پایہ اورنگ سلطانی

(۵۹)

علامہ شوقؔ نیموی کا اصل میدان غزل گوئی بھی ہے۔ان کی غزل گوئی میں انفرادیت ہے۔اپنی غزل میں انفرادی شان کی وجہ سے وہ ممتاز غزل گو شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کی غزل گوئی میں لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکول کا رنگ پایا جاتا ہے۔وہ شمشادؔ لکھنوی اور تسلیمؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔تسلیمؔ لکھنوی گرچہ لکھنوی تھے لیکن نسیمؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔تسلیمؔ لکھنوی کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے۔لیکن دہلوی رنگ زیادہ نمایاں اور غالب ہے۔یہی وجہ ہے کہ شوقؔ نیموی کی غزل گوئی میں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں حقیقت بیانی،رنگینی،صداقت،تاثیر،آمد اور سوز وگداز موجود ہے۔جو دہلی اسکول کا رنگ ہے۔ساتھ ہی ساتھ حسن کی رنگینی،دلکش ادائیں اور شوخیاں بھی پائی جاتی ہیں،جو لکھنؤ اسکول

کا رنگ ہے۔ان دونوں رنگوں کے امتزاج نے شوقؔ نیموی کے غزل کو ایک انفرادی شان عطا کر دیا ہے۔اوراس کا مظاہرہ ان کی ہر شعر کے اندر موجود ہے۔

معشوق کے وصال وفراق کا بیان اردو شاعری میں کثرت سے موجود ہے۔کسی کو وصال زیادہ عزیز ہے۔توکسی کو فراق۔ان دونوں مضمون کو شعراء نے اپنے اپنے انداز پر پیش کیا ہے۔لیکن شوقؔ نیموی کا تجربہ نہایت ہی پختہ ہے۔انہوں نے اس مضمون کو اپنی غزل میں مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔دیکھئے معشوق کے فراق کا بیان کس درد و کیف،مگر کس خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔

بے ترے اور رشک گل دیکھا عجیب رنگ چمن
شاخیں تلواریں تھیں ہر پتہ کف جلاد تھا

دھیان آیا تھا جو زلف پر شکن کا وقت شام
صبح تک برہم مزاج خاطر ناشاد تھا

ہجر کی تھی کچھ ایسی رات — میں نے مرمر کے کاٹی ساری رات
پوچھتے ہیں وہ کس تجاہل سے — آج کیوں کر کٹی تمہاری رات
ہیں یہ نیر نگیاں زمانے کی — اک رات ان کی اک ہماری رات
رخ وزلف سیہ کے عاشق کو — دن بھی پیارے ہے اور پیاری رات

شب بھر الجھن سی رہا کرتی ہے دن بھر وحشت — زلف ورخ یار جو ہم شام وسحر کرتے ہیں
سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں جو محفل میں آج — دیکھئے وہ نظر لطف کدھر کرتے ہیں
آئینہ دیکھ کے وہ ناز سے بولے ہنس کر — دل عشاق میں کبھی ہم یونہی گھر کرتے ہیں
ہے وہی دل کی لگی اور وہی سوزش داغ — لاکھ رورو کے مدد دیدہ تر کرتے ہیں

(٦٠)

علامہ شوقؔ نیموی کی غزلوں میں جدت بیان،نازک خیالی،رنگینی،صداقت،شگفتگی اور زبان کی سادگی جس قدر خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ان کی وجہ سے ان کی انفرادیت دیگر معاصر شعراء میں

نمایاں ہے۔غزل کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

نہ ٹھہرے میرے دلمیں غیر کی منزل میں جا ٹھہرے تمہیں انصاف سے سوچو نہ کیونکر بیوفا ٹھہرے
نگاہ شوق سمجھانے سے محفل میں رکے کیونکر جسے عادت ہو چلنے پھرنے کی وہ گھر میں کیا ٹھہرے
یہی دو گھر تو کل نکلے دیار حسن والفت میں میں ان کے دل میں جا ٹھہر یا وہ میرے دل میں آ ٹھہرے
شکایتیں کیجئے کس کی بتائیں نام ہم کس کا کریں فریاد کس کی جب اوسی پر فیصلہ ٹھہرے
چلا ہے مجھکو تنہا چھوڑ کر دل کوئے جاناں کو مزا ہے جب وہاں بھی جا کے ظالم بے وفا ٹھہرے
مرا دل گلشن جنت میں گھبراتا ہے اے رضواں یہ کچھ کو چہ نہیں اون کا یہاں میری بلا ٹھہرے
نظر کی کیا حقیقت شوقؔ دل تک مل گیا اون سے مگر یہ خوبی قسمت کہ پھر ہم وہ جدا ٹھہرے

علامہ شوقؔ نیموی کی شاعری میں رنگینی، شوخی اور ان کا پختہ تجربہ بھی پایا جاتا ہے۔ساتھ ہی رکھ رکھاؤ بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔اور ہر ایک شعر کی انفرادیت ایک شان کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

غزل ملاحظہ کیجئے ؎

نالے بیتاب ہیں سینے سے نکلنے کے لئے اوس ستم گر سے کوئی کہہ دے سنبھلنے کے لئے
چشم عاشق کے ہوں آنسو کہ کسی کا جوبن بڑھ چلیں لاکھ مگر دونوں ہیں ڈھلنے کے لئے
خانہ دل میں رہو تم جو یہاں جی گھبرائے چلے آنا مری آنکھوں میں ٹہلنے کے لئے
شوخیاں اون کی سر بزم حیا سے بولیں تجھ کو محفل سے ہوا حکم نکلنے کے لئے
درد تعظیم کو پہلو سے نہ کیوں کر اوٹھے دل میں آتا ہے کلیجہ کوئی ملنے کے لئے
کبھی میرا کبھی اون کو جو ہے شکوہ دل کو ڈھونڈ تا ہے کوئی پہلو یہ مچلنے کے لئے
اے مرے جذبہ دل وقت مدد آ پہنچا گھر سے وہ آج نکلتے ہیں ٹہلنے کے لئے
اون کی تصویر جو چومی تو وہ جل کر بولے اب یہ معشوق نکالا ہے بہلنے کے لئے
لاکھ رسوا ہو مگر جاہ بری ہوتی ہے دل کو پھر ضد سے اوسی کوچے میں چلنے کے لئے
محفل غیر میں کیوں شمع جلائی تم نے کیا وہاں کوئی نہ تھا رشک سے جلنے کے لئے
نامناسب ہے یہاں غیر کا رہنا شب وصل تم اشارہ کرو اب شرم کو ملنے کے لئے

مر گئے ہم تو کفن دیکھ کے بولا وہ شوخ　　جان دی اس نے بھیس بدلنے کے لئے
حسرتیں بھر گئیں اے شوقؔ یہاں تک دل میں　　آرزو ڈھونڈتی ہے راہ نکلنے کے لئے

شوقؔ نیموی کی غزلوں میں زبان کی سادگی کے ساتھ نازک خیالی اور جدت بیانی کے ساتھ رنگینی اور صداقت بھی پائی جاتی ہے۔ان کے خیالات میں ندرت اور بیان میں سادگی ہے۔غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اودھر رخ سے گھونگھٹ اوٹھانا کسی کا　　ادھر کھا کے غش تلملا نا کسی کا
شب وصل وہ روٹھ جانا کسی کا　　مزادے گیا پھر منانا کسی کا
گراتا ہے دل پر قیامت کی بجلی　　وہ منہ پھر کر مسکرانا کسی کا
نہ کر آہ کا قصد گھبرا کے اے دل　　کچھ اچھا نہیں دل دکھانا کسی کا
وہ بھولی سی صورت لڑکپن کی باتیں　　ہمیں یاد ہے وہ زمانا کسی کا
کہاں تک یہ زلف آپ سلجھا یئے گا　　ذرا دیکھئے پیچ کھانا کسی کا
مرے آگے کیا گل کھلائیں گے غنچے　　مجھے یاد ہے مسکرانا کسی کا
چمن میں جو گلچیں نے کچھ پھول توڑے　　تو یاد آگیا دل دکھانا کسی کا
سر بزم تم اور نیچی نگاہیں　　اجی کھل گیا دل چرانا کسی کا
مرے خانہ دل میں خلوت گزیں ہے　　کسی کو ملے کیا ٹھکانا کسی کا
تمہیں عشق سے شوقؔ سب روکتے تھے　　مگر تم کہنا نہ مانا کسی کا

شوقؔ نیموی کے لب ولہجہ، زبان وبیان، جذبات وخیال اور رنگ وآہنگ کی انفرادیت ہر غزل میں نمایاں ہے۔اور ہر ایک کا الگ الگ انداز ہے۔ان کی غزلوں کے اشعار سادہ، سلیس، عام فہم ہوتے ہیں۔ساتھ ہی وہ شعری محاسن اور فنی چابک دستی سے بھی کام لیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

دل شوقؔ حسینوں سے لگانا نہیں اچھا　　ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا
ہم صاف کہے دیتے ہیں مانو کہ نہ مانو　　دل عاشق بیکس کا دکھانا نہیں اچھا

رہتے ہو جو دل میں تو جگر کو نہ جلاؤ ہم سائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا
منہ سے نہ کہیں آہ جہاں سوز نکل جائے جلتا ہو جو آپ اوس کو جلانا نہیں اچھا
دل کوئی چرالے تو نہیں اس کی شکایت آنکھیں مگراے جان چرانا نہیں اچھا
کھل جائیں گے راز آپ کے اس شرم وحیا سے منہہ مجھ سے سر بزم چھپانا نہیں اچھا
دیکھو نہ کہیں دل کی لگی اور بھڑک جائے بالین لحد شمع جلانا نہیں اچھا
ہم خوب سمجھتے ہیں جہاں جاتے ہو جاؤ ہر روز مگر راہ بتانا نہیں اچھا
پڑ جاؤ گے جھگڑے میں کہے دیتے ہیں اے جان ہر ایک کی آنکھوں میں سمانا نہیں اچھا
نازک ہیں، عجب کیا کہ وہ دل تھام کے رہ جائیں حال شب غم اون کو سنانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھلتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
اے شوقؔ ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

(۶۱)

(۷)

مولانا سید ابوالخیر رحمانی دربھنگوی

مولانا سید ابوالخیر کا تاریخی نام محمد مظہر عالم تھا۔ خیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ادبی دنیا میں خیرؔ رحمانی کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے والد محمد شفیع الدین ایک اچھے طبیب تھے۔ آپ موضع قاضی بہیرہ ضلع دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں جالہ سے تین کیلومیٹر پورب میں واقع ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء کو ہوئی۔ بعض تذکرہ میں تاریخ پیدائش ۱۲۷۴ھ درج ہے۔ لیکن ان کے تاریخی نام سے ۱۲۸۶ھ نکلتا ہے۔ خانقاہ رحمانی سے منسلک ہونے کی وجہ سے رحمانی لکھا کرتے تھے۔ بچپن ہی میں والد محترم کا وصال ہو گیا۔ والدہ ماجدہ نے تعلیم و تربیت کی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ وہیں سے تقریباً ۱۸۸۶ء میں فراغت حاصل کی۔ تقریباً ۱۸۸۹ء میں مونگیر سے ماہنامہ شوخ نکالا۔ کچھ دنوں کے بعد پٹنہ چلے آئے۔ اور اخبار الپنچ بانکی پور کے حلقہ ادارت سے منسلک ہو گئے۔ تقریباً تیس سال چار ماہ تک ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۰/ جنوری ۱۹۰۲ء کو الپنچ چھوڑا اور وطن لوٹ آئے۔ اور نواب

سخاوت علی خاں سعادتؔ پیغمبر پور اسٹیٹ دربھنگہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ عرصہ تک ان کے جلیسوں میں رہے۔ دیوان سعادتؔ کی طباعت میں شریک رہے۔

زندگی کے آخری زمانہ میں نواب سید واجد حسین خسرو پور کے یہاں اتالیق ہو گئے۔ لیکن وہاں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکے۔ وہاں سے خانقاہ رحمانی مونگیر پہنچے۔ اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ کچھ دنوں وہاں مقیم رہ کر تعلیم باطنی حاصل کی۔ پھر وطن واپس لوٹے۔ **(۶۲)**

شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے، اور خیرؔ تخلص کرتے تھے۔ خیرؔ کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ کئی رسالوں کے مدیر رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ اردو میں نواب مرزا داغؔ دہلوی اور کبھی کبھی امیرؔ مینائی سے غزلوں پر اصلاح لی۔ فارسی کلام پر پروفیسر آقا سید محمد علی ایرانی، نظام کالج، حیدر آباد (دکن) سے اصلاح لینے کی سعادت حاصل کی۔ اردو کے دو دیوان 'حسنات خیر / ۱۳۲۹ھ' اور 'لمعات خیر/ ۱۳۵۱ھ' اور فارسی کا ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ فن تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ تاریخی قطعات کا ایک ضخیم مجموعہ ان کے علاوہ ہے۔ **(۶۳)**

شاداںؔ فاروقی نے ''حسنات خیر'' اور ''لمعات خیر'' کو دیکھا ہے۔ یہ دونوں دیوان ابھی تک قلمی ہیں۔ ابھی تک ایڈٹ نہیں کئے جا سکے ہیں۔ ان کے خانوادہ کے لوگوں نے بتایا کہ یہ دونوں دیوان خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ خدا بخش لائبریری میں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دونوں دیوان کا قلمی نسخہ یہاں موجود نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں دیوان ان کے خاندان ہی کے لوگوں میں سے کسی کی ملکیت میں ہوں گے۔

خیرؔ رحمانی کا ذکر خم خانہ جاوید میں بھی ہے۔ خم خانہ جاوید سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ وہ نکتہ ہے کہ سمجھیں اسے اسرار پسند
ہے فرشتوں کو خال رخ دلدار پسند

سر شوریدہ کو چوکھٹ پر مجھے رکھ دینا — اب کرے یا نہ کرے اس کو در یار پسند
دل ہے تو ہوں گے اس خریدار اور بھی — ہم ڈھونڈ لینگے تم سے طرحدار پسند
مجھ کو یہ دیکھنا ہے کہاں تک کرے گا شور — ہاں اے جفا شیار ستم گار پسند

فتنے اٹھا رہی ہے تمہاری نگاہ ناز
ڈھاتی ہے حشر شوخی رفتار اور بھی

(۶۴)

خیرؔ رحمانی ماہرفن شاعر، کامیاب رباعی گو برگزیدہ تاریخ گو، فن عروض و قافیہ پر دسترس، محاورات ولغات پر گہری نظر رکھنے والے، اردو اور فارسی زبان کے صاحب دیوان اور پر گو شاعر تھے۔ان کے کلام میں پختگی اورغزل میں کلاسیکی لب ولہجہ نظر آتا ہے۔

اے فلک چھوڑ دے شیوہ ستم ایجادی کا
حوصلہ تنگ ہوا ہے ترے فریادی کا
خیرؔ تربیت پہ گرائے تو کسی نے آنسو
دیکھ کر حال مری خاک کی بربادی کا

خیرؔ کی شاعری میں نازک خیالی،تصوف کی چاشنی، کسرنفسی کے ساتھ ان کے اشعار میں تازگی اور فکر میں ندرت اور بیان میں مہارت بھی موجود ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں انفرادیت نظر آتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

سخت ہنگامہ مری آہ و بکا سے ہوگا   تہلکہ حشر میں نالوں کی صدا سے ہوگا
درد سر دور ہمارا نہ دوا سے ہوگا   فائدہ یار کی خاک کف پا سے ہوگا

قتل کے بعد تڑپنے میں مزا آئے گا   زخم پر میرے جو قاتل نمک افشاں ہوگا

خیرؔ کی شاعری میں تجربات،مشاہدات،احساسات اورخودداری بھی پورے طور موجود ہے۔ان کے پختہ تجربات اور احساسات نے ان کی شاعری کے رنگ کو مزید نکھار دیا ہے۔ان کے اشعار پڑھتے وقت ایک طرح کا مزہ حاصل ہوتا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

نظر غیر کھا گئی ہے کیا   رخ پہ زردی یہ چھا گئی ہے کیا
کیوں یہ اٹھکھیلیاں ہیں بادصبا   سچ بتا کچھ تو پا گئی ہے کیا

کروٹیں لے کے کہتا ہوں شب ہجر   نیند کو موت آگئی ہے کیا
کیوں یہ آنکھیں جھکی ہیں حضرت خیرؔ   کوئی صورت ستا گئی ہے کیا

دل بے تاب کیوں نالہ نہ کرتا   مثل سچ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا
محبت میں جو ہوتا غیر کامل   تمہارے ظلم کا شکوہ نہ کرتا
اگر دیتا زمانہ خیرؔ فرصت
تو میں اس کے لئے کیا کیا نہ کرتا

حال قاصد سے بیاں کیا ہو گا   وہ بھلا میری زباں کیا ہوگا
یار سے ہوگیا روا مطلب   اب ہمیں مدعی سے کیا مطلب
پڑھ سکے کیا کوئی کتاب جنوں   خبط ہے اس میں جابجا مطلب
کیوں لکھیں خیرؔ کو وہ نامۂ شوق
کچھ غرض ٬ کامٔ مدعا مطلب   (۶۵)

خیرؔ کو شعر وشاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ مرزا داغؔ دہلوی اور امیرؔ مینائی سے غزلوں پر اصلاح لی۔ اس لئے ان کے کلام میں داغؔ دہلوی اور امیرؔ مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست اور حلاوت ہے۔ زبان سادہ اور صاف ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

سنولا گئی صورت جو سر بام پڑی دھوپ
کیا جانیں حسین وادی غربت کی کڑی دھوپ
آہوں سے دھواں نکلے کبھی تو کبھی شعلہ
دو چار گھڑی ابر ہو دو چار گھڑی دھوپ
رونے میں ہے یہ حال مرے آتش دل کا
جس طرح کہ برسات میں ہوتی ہے کڑی دھوپ

امید نہیں خیرؔ کو شب وصل کی آئے
میرے در و دیوار میں گویا ہے جڑی دھوپ

اس قدر نور ہے ان چاند سے رخساروں پر دیکھے خورشید تو لوٹا کرے انگاروں پر

روز ہوتی ہیں جفائیں ایجاد کہیں لوگ ان کو ستمگر نہ کہیں
تم سے اچھی ہے تمہاری تصویر بات انصاف کی کیوں کر نہ کہیں

خیرؔ رحمانی نے داغؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ان کی شاعری میں استاد کے رنگ کا ظاہر ہونا فطری بات ہے۔یہی وجہ ہے کہ خیرؔ رحمانی کی شاعری میں شوخی اور پختہ تجربہ پورے طور پر موجود ہے۔اور الفاظ کے دروبست نے اس کو اور بڑھادیا ہے۔''کوچہ گیسوئے جاناں''اور'' نازبادصبا'' جیسی ترکیب کا مشاہدہ کیجئے۔ساتھ ہی دوسرے شعر میں ''سرگشتہ صحرائے جنوں''اور''خاک اڑاتی صبا''کوبھی دیکھئے۔تیسرے شعر میں''رقیب ہم نشیں''اور''مارآستیں''کو ملاحظہ کیجئے ۔اس جیسی ترکیب سے خیرؔ رحمانی کی شاعری کی شوخی اور پختگی ظاہر ہوتی ہے۔چنداشعار پیش ہیں ؎

کوچہ گیسوئے جاناں سے یہ کیا آتی ہے
ناز کرتی ہوئی جو باد صبا آتی ہے
مرگیا کیا کوئی سرگشتہ صحرائے جنوں
خاک اڑاتی ہوئی کیوں آج صبا آتی ہے

بچے رہنا رقیب ہم نشیں سے حذر لازم ہے مارِ آستیں سے
سنے احکام سب شیخ و حرم کے سلام ان کو مرا پہنچے یہیں سے

خیرؔ رحمانی فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔فارسی اور اردو دونوں کی شاعری میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔خیرؔ رحمانی بھی خانقاہ اور تصوف سے رشتہ رکھتے تھے۔اس لئے ان کی

شاعری میں عشق کا عارفانہ تصور پایا جاتا ہے۔ساتھ ہی عشق میں فنا اور مر مٹنے پر بقا کا یقین بھی انہیں حاصل ہے۔اوراس تصور کو انہوں نے اپنی شاعری میں نہایت ہی حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے اشعار تازہ اور حسین ہو گئے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

عشق کیا ہے ارے فنا ہے یہی　　　مر مٹے عشق میں بقا ہے یہی
خوب ہی تم نے کی دل آزادی　　　دل لگانے کی ہاں سزا ہے یہی
لے کے دل تم نے کر دیا واپس　　　کیا محبت کا اقتضا ہے یہی
جانب خیرؔ دیکھئے تو سہی　　　آپ کا کشتۂ ادا ہے یہی

خیرؔ رحمانی ماہر فن استاد شاعر تھے۔ان کے کلام میں استعارات وکنایات کا استعمال بھی کثرت سے نظر آتا ہے۔اوراس استعمال صحیح ربط وضبط وفنکارانہ مشاقی سے کرتے ہیں۔ساتھ ہی نازک خیالی اور صنعت گری بھی ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ان کا تعلق مذہب وروحانیت سے بھی گہرا رہا۔ساتھ ہی علمی اعتبار سے بھی بہت آگے تھے۔تصوف اور خانقاہوں سے بھی ان کا رابطہ تھا۔پھر بھی ان کی شاعری میں شاعرانہ فنکاری پائی جاتی ہے۔جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ہر طرح کا مزہ ملتا ہے۔اشعار پیش ہیں ؎

میں کچھ کلیم نہیں ہوں کہ بے خودی ہوگی　　　کسی سے طور پہ مجھ سے جلی کٹی ہوگی
جمے گا رنگ قیامت کا ان کے ہاتھوں میں　　　ہمارے خون میں مہندی اگر بسی ہوگی

رموز عشق و محبت سے خیرؔ واقف ہیں
وہ کون بات ہے جو آپ سے چھپی ہوگی :(٦٦)

خیرؔ رحمانی کی شاعری محاسن صوری ومعنوی سے پُر ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں استعارہ ،کنایہ اور تلمیحات کا جس طریقہ سے استعمال کیا ہے،اس سے ان کے شعر کی معنویت بہت بڑھ جاتی ہے۔اور شعر کا حسن اپنے معنوی محاسن کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتا ہے۔خیرؔ کی شاعری میں حقیقت،مجاز،محمود اور ایاز کا استعمال جس انداز پر ہوا ہے،اس سے اسلامی تصوف اور تاریخ سامنے آتی ہے۔اس سے خیرؔ رحمانی کی اسلامی معلومات اوران کی شاعری میں قادرالکلامی بھی ظاہر ہوتی ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہیں حقیقت کبھی مجاز ہیں ہم   میرے اللہ ایک راز ہیں ہم
اپنی ہستی کے خود ہیں شیدائی   خود ہیں محمودؔ، خود ایاز ہیں ہم
حسرت و یاس کس کے گھر جائیں   جس میں نغمہ نہ ہو وہ ساز ہیں ہم
خیرؔ مرتے ہو تم حسینوں پر
پھر یہ کہتے ہو پاکباز ہیں ہم (٦٧)

ستم بے جا کئے ہم پر رقیبوں سے وہ درگذرے   ہمارے دل دکھانے میں جو کرنا تھا وہ کرگذرے

ہاتھ میں کیوں لئے ہو تم خنجر   لاؤ اس کو گلے میں لگائیں ہم :(٦٨)

۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔اور اپنے مکان کے سامنے میدان میں مدفون ہوئے۔

(۸)
مولانا سید سلیمان ندوی کیفؔ

سید سلیمان نام، والد کا نام ابوالحسن تھا۔دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کرنے کی وجہ سے ندوی مشہور ہوئے۔صوبہ بہار کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ ضلع پٹنہ،موجودہ ضلع نالندہ میں ۲۳/صفر ۱۳۰۲ھ/ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں پھلواری شریف اور دربھنگہ میں بھی تحصیل علم کے لئے رہے۔مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے انجمن طلبہ میں ایک تحریر پڑھی تو اساتذہ نے داد دی۔اور تحریر پٹنہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار اپنچ میں شائع ہوئی۔۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ندوۃ میں ان کی علمی وادبی ذوق کی تربیت ہوئی اور کچھ شعر وسخن کی مشق شروع کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے جید علماء میں سے تھے۔آپ مولانا شبلیؒ کی تربیت میں رہے۔مولانا شبلیؒ کے پاس مصر وشام کے عربی رسائل بکثرت آتے تھے۔سید صاحب ان کا برابر مطالعہ کرتے رہے۔جس سے ان میں جدید عربی کا ذوق پیدا ہوا۔اور رفتہ رفتہ ایک اچھے ادیب

میں شمار کئے جانے لگے۔

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلیؒ نے ندوۃ کی طرف سے ایک سالانہ رسالہ ''الندوہ'' نکالنا شروع کیا۔ سید صاحب طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان میں علمی وادبی مضامین لکھنے لگے۔

آپ کی تصانیف میں سیرت النبی، ارض القران خطبات مدراس۔ عرب وہند کے تعلقات، حیات شبلیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا ۱۹۴۶ء میں نواب بھوپال کے اصرار پران کی ریاست کے دارلقضاء اور جامع مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامورر ہوئے۔ یہاں اکتوبر ۱۹۴۹ تک قیام رہا۔ اسی سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے واپسی کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ آپ کی سوانح ''حیات سلیمان'' شائع ہوچکی ہے۔ **(۶۹)**

مولانا سید سلیمان ندوی عربی، فارسی اور اردو میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان ادب کی دل و جان سے خدمت کی۔ علامہ شبلیؒ کی تربیت نے ان میں ادبی ذوق پیدا کردیا۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ اور رمزیؔ تخلص کرتے تھے۔ ارمغان سلیمان اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔ جسے ۱۹۶۶ء میں کراچی میں طبع کیا گیا۔ بہار کی اردو نعتیہ شاعری میں تحریر ہے۔ بقول رفقائے مولانا سید سلیمان ندوی شاعری میں وہ تخلص رمزیؔ فرماتے تھے۔ لیکن مجموعہ کلام ارمغان سلیمان کی ہر غزل تخلص رمزیؔ سے خالی ہے۔ **(۷۰)**

مولانا ندوی کو شبلیؒ جیسا استادفن ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں شاعری کے جوہر دکھانے لگے۔ مشاعروں میں کلام سنایا تو تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ رسالوں میں غزلیں چھپیں تو اہل نظر نے تعریف کے خطوط لکھے۔ مولانا کی ایک غزل جس کا مطلع ہے:

عجیب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ ''میں'' وہی بات جو ''تو'' میں ہے

جب شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کی نظر سے گزری تو انہوں نے لکھا:

''آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے''

(۷۱)

سید سلیمان ندوی کے کلام میں تنوع ہے۔ تصوف، مذہب، اسلامیات اور حق و معرفت کا گہرا رنگ غالب ہے۔ **(۷۲)**

اشعار کا نمونہ پیش ہے ؎

☆ پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں — ہر سود و زیاں دوسرا بھول گیا ہوں
☆ حل جب سے ہوا فلسفہ حسن حقیقت — ہر مسئلہ اے ذہن رسا بھول گیا ہوں
☆ مدرسہ چھوڑا خرابات میں آ کر بیٹھا — دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں
☆ چل کھڑا ہو رہنما سے پوچھ کر راہ سفر — بحث میں الجھا مسافر تو سفر نا کام ہے
☆ کس نے بھر دی یہ صدائے ولنواز — ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
☆ اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ — اب وہی ہو گا فقیہ شہر جو مئے نوش ہے
☆ زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی — گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ
☆ دیدہ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں — جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
☆ تیرے میخواروں کے ساقی عجب انداز ہیں — دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے

(۷۳)

علامہ ندوی کے کلام میں فکر بھی ہے اور فن بھی۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اشعار پر ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوتی رہی۔ ان کے شعری مجموعہ ارمغان سلیمان سے چند غزلیں پیش ہیں۔

دل حریف نگاہ یار کہاں سے لاؤں — جو نہ بے خود ہو وہ میخار کہاں سے لاؤں
نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے — تاب نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں
اُف رے دریائے معاصی کی تلاطم خیزی — وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل — فطرت دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں

مدرسہ چھوڑ خرابات میں آکر بیٹھا — دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں
جام پر جام مجھے دے کے بنادے بدمست — صبر سر جوشی اذکار کہاں سے لاؤں

(۷۴)

مولانا ندوی کے غزلیات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قادرالکلام اور روشن فکر شاعر تھے۔ ہر غزل سے پختہ فکری سنجیدہ نگاری اور بیدار مغزی عیاں ہے۔ کلام میں سلاست اور پاکیزگی پورے طور پر موجود ہے۔ اخلاقیات اور عرفان کو شعر کا قالب عطا کیا گیا ہے۔ فنی نزاکت اور تخیل کی لطافت ہر جگہ ظاہر ہے۔ شعری ذوق اور فن شاعری میں کمال کا مظاہرہ بھی سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر ہی فکر ہے۔ ساتھ ہی تخیل کی فراوانی بھی۔ غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

چاندنی چھٹکی ہوئی جس کی ہزاروں دل میں ہے — وہ فروغ نور عالم اس مہہ کامل میں ہے
لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کرسکیں — شوق بے انداز پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے
وا کر اے مجنوں تو اپنے دیدۂ مشتاق کو — لیلی پردہ نشیں ہر پردۂ محمل میں ہے
جدوجہد دید میں ہے ذوق وشوق و لطف دید — حاصل ہر سعی، میری سعی لاحاصل میں ہے
آہی جائے گا کبھی اس تک بھی ساقی جام دور — منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے
منزل مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم — وہ سر منزل ہے جو اب تک رہ منزل میں ہے

(۷۵)

مولانا ندوی نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دینے کی کوشش کی۔ ان کے اشعار میں تیر بھی ہے اور نشتر بھی۔ حسن وعشق کے روایتی موضوعات سے الگ ہوکر اردو غزل کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے لہجہ میں لطافت اور شائستگی ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ ''میں'' اور ''تو'' کا فرق ان کی شاعری میں ایک نئے رنگ میں موجود ہے۔ عشق حقیقی اور اخلاقیات کا درس ان کی شاعری میں پورے طور پر نمایاں ہے۔ فصاحت وبلاغت، سلاست وروانی، جدت تخیل، ندرت خیال اور اظہار کی شائستگی مولانا ندوی کی غزل میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنے خط میں مولانا ندوی کے غزل کی تحسین کی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو ؎

عجیب طرح کا اک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ ''میں'' میں وہی بات ہے جو ''تو'' میں ہے
ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں
پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے
خطاب غیر میں گو لاکھ احترام رہے
مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ ''تو'' میں ہے
دہن میں تیغ کے ابھی ہے تشنگی باقی
عجیب لذت پنہاں مرے لہو میں ہے
نگاہ لطف ادھر ہو کہ آچلاہے کیف
بچا نہ رکھ میرے ساقی جو سبو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے
قفس میں نالہ نہ کر مرغ! صحن باغ سے دور
کہ لطف شکوۂ یارانہ رو برو میں ہے

(۷۶)

دریائے نربدا کے متعلق انہوں نے اپنے جذبات کو نظم میں پیش کیا ہے۔ جس کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ ''سفر کے اثناء میں جب میں بھروچ پہنچا، اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کردیں اور گو میں شاعر نہیں تاہم جذبات کے طلاطم نے موزون ترانہ کی شکل اختیار کرلی۔'' مولانا کے اس نظم میں اسلامی تاریخ کا ایک باب پنہاں ہے۔ مولانا کی یہ نظم اسی طرح رواں ہے جس طرح دریائے نربدا۔ اس نظم میں سلاست، روانی اور جذبات کی فراوانی پورے طور پر موجود ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر مولانا ندوی کے قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے باضابطہ شاعری نہیں کی، لیکن جو کچھ بھی کہا وہ اردو شاعری میں ایک قابل فخر سرمایہ ہے۔ دریائے نربدا پر نظم ملاحظہ کیجئے ؎

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب
گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادہ بحر عرب
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
تو گزشتہ کاروانوں کا نشان راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتہ ہندوعرب تجھ سے ہوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہراک ذرہ ہے اس کی یادگار
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چارصدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستان پاستاں
تیرے ساحل پہ جب اترا تھا عرب کا کارواں
تو ہے دریائی پری یا شاہد عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو

تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سر شار جام
اس تن آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام
اے بہروح! اے خاتم انگشت رود نربدا
عہد ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا
تو تیائے چشم ظاہر آج تری خاک ہے
ذرہ ذرہ پرتو خورشید ذی لولاک ہے
یادگار عہد خیرالقرن ہے تیری زمیں
مطلع انوار ذی النورین ہے تیری جبیں
چشم عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں
تیری موجیں کنہ انسانوں کی سطریں بن گئیں

(۷۷)

جنوری ۱۹۴۹ء کو بھوپال میں محفل شعر و سخن بڑے پیمانہ پر منعقد ہوئی، اس میں جوشؔ ملیح آبادی بھی مدعو کئے گئے، انہوں نے اپنی نظم کو تاریخی غلطیوں سے مدلل کر کے وجود باری تعالیٰ کے عقیدہ کا مذاق اڑایا۔ یہ نظم دوسرے روز ۱۳/جنوری ۱۹۴۵ء کو مقامی اخبار ندیم میں چھپی، وہ یہ ہے ؎

ہفوات جوشؔ

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش
باپ کی صرف ایک ''ہوں'' نے کر دیا سب کو خموش
''ہوں'' بزرگ خانداں کی آہنی دیوار ہے
بہر فساد و غلغلہ کا ایک ''ہوں'' ہی درکار ہے
سنتے ہیں انساں کا ہے باپ رب کائنات
اس لئے اے دوست تجھے پوچھتا ہوں میں یہ بات
جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندیاں
کوئی ''ہوں'' اس وقت کیا گونجی تھی زیر آسماں؟
تحفتہً آئے تھے جب مقتول انسانوں کے سر
پھٹ پری تھی کیا کوئی ''ہوں'' خیمہ چنگیز پر؟
شعلہ ہائے حکم نیرو جبکہ تھے بھڑکے ہوئے
ڈانت کی کوئی صدا آئی تھی بام عرش سے؟
لے اڑا تھا جبکہ راون ایک دیوتا کا ''گھر''
کوئی ''ہوں'' گرجی تھی کیا اس وقت اوج چرخ پر؟
جب بپا تھا کربلا کی خاک پر دریائے خوں
دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک ''ہوں''؟
کر رہا تھا زہر جب سقراط کے دل پر اثر
عرش سے اتری تھی ''ہوں'' کوئی بساط فرش پر؟
عیسیٰ مریم کو جب کھینچا گیا تھا دار پر
ہوگئی تھی کیا کسی ''ہوں'' سے زمیں زیر و زبر؟
آئیٹم نے دیا تھا بھون کر جب ایک شہر
قلزم تنبیہ میں آئی تھی کیا اس وقت لہر؟
ہستیاں غلطاں تھیں جب موت کے گرداب میں
کوئی ''ہوں'' کڑکی تھی کیا ہنگامہ پنجاب پر؟

جب ہوئے تھے آخری اوتار گاندھی جی ہلاک ۔۔۔ آئی تھی کوئی ندائے خشمگیں و قہرناک؟
اتنی چپ سادھے ہوئے ہے کس لئے عرش بریں ۔۔۔ کیوں ہمارا آسمانی باپ ''ہوں' کرتا نہیں؟

(۷۸)

اس ملحدانہ نظم کا جواب مولانا سید سلیمان ندوی نے نظم میں دیا، جو ندیم میں ۲ رفروری ۱۹۴۹ء کو چھپا۔ یہ نظم جوشؔ کے انداز پر ہے اور جوشؔ سے بہتر شاعری ہے۔ جس میں فنی محاسن بھی ہیں اور سنجیدہ افکار بھی۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد جوشؔ کی شاعری پھیکی نظر آتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو ؎

باپ کی ''ہوں'' سے سنبھل جاتے ہیں فرزند سعید ۔۔۔ ناخلف جو ہیں نہیں سنتے ہیں تہدید و وعید
تازیانہ غافلوں کو فتنہء چنگیز تھا ۔۔۔ راہوار نظم ملت کے لئے مہمیز تھا
نسل سے چنگیز کی سلطان دیں پیدا ہوا ۔۔۔ ظلمت تاتار سے نورمبیں پیدا ہوا
ظلم نیرو سے کھلیں آنکھیں عوام روم کی ۔۔۔ ہل گئی بنیاد اس کی عظمت موہوم کی
راون بدکیش، ظلم و جور کا فرماں روا ۔۔۔ ہند کے دیوکا جو ''گوہر'' اڑا کر لے گیا
اس سے جوہر کھل گیا سیتا کے پاک اخلاق کا ۔۔۔ رام کی عزم بلند و شہرہ آفاق کا
کربلا کی خاک سے اٹھا تھا جو سیل رواں ۔۔۔ ظلم پیشہ بادشاہوں کو بہار کر لے گیا
جو پیالہ زہر کا سقراط پی کر مرگیا ۔۔۔ عقل کے وہ تا ابد جینے کا ساماں کر گیا
عیسیٰ مریم کی مظلومی کا یہ اعجاز دیکھ ۔۔۔ روم کے ظالم ہوئے یوں حق سے سرفراز دیکھ
آئیٹم بم سے ہوا جو شہر کل ویران دیکھ ۔۔۔ چین کی آہوں کا شرارہ اندروں جاپان دیکھ
خرمن پنجاب و بنگالہ پہ جو بجلی گری ۔۔۔ اس سے جل کر خاک ہے سامان فرقہ پروری
کشتہ بیداد گاندھی کے بدن کا سرد خوں ۔۔۔ ہے زبان فطرت خاموش کی خاموش ''ہوں''
جاگ اٹھی اس ''ہوں'' کے پیہم شور سے خوابیدہ روح ۔۔۔ رو پڑی چشم ستمگر ہنس پری غمدیدہ روح
بے بصر کو کیا خبر! ہوتا رہا ہے باربار ۔۔۔ تیرگی سے ''نور'' شر سے ''خیر'' یونہی آشکار

(۷۹)

۲۲ رنومبر ۱۹۵۳ کو کراچی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ اور احاطہ قبور اسلامیہ کالج کراچی میں مدفون ہوئے۔

(۹)

مولانا سید مناظر احسن مناظر گیلانی

سید مناظر احسن نام، مناظر تخلص، ۱۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید ابوالخیر اور جد امجد کا نام مولانا محمد احسن ہے۔ وطن مالوف موضع گیلانی تھا۔ مولانا مناظر احسن نے عربی و فارسی کی متوسطات تک تعلیم وطن میں اپنے حقیقی چچا مولانا سید ابونصر سے حاصل کی۔ پھر جب مشہور روزگار مولانا برکات احمد بہاری ثم ٹونکی اپنے سابق وطن تشریف لائے تو اپنے ساتھ مولانا مناظر کو ریاست ٹونک لے گئے۔ اور علوم وفنون کی تعلیم سے بہرہ ور کر دیا۔ پھر حدیث شریف کی تعلیم کے لئے دیو بند گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فراغت حاصل کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔

مولانا سید مناظر احسن صوبہ بہار کے جید علماء میں سے تھے۔ آپ کے مضامین صدق، معارف، برہان، ترجمان القرآن، دارالعلوم اور الفرقان میں بے شمار شائع ہوئے ہیں۔ (۸۰)

پھر سرزمین دکن کی آب و ہوا نے مولانا ممدوح کو اپنی طرف کھینچا اور وہ دکن پہنچ گئے۔ اور وہ جامعہ عثمانیہ میں لکچرر کی حیثیت سے بحال کئے گئے، اس خدمت پر بحال ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جامعہ کی ہر جماعت میں آپ کے دینی لکچر ہونے لگے اور پورے جامعہ کے تلامذہ آپ کے شاگرد ہو گئے۔ جامعہ کے تمام اساتذہ اور طلبہ سے بہت جلد آپ متعارف ہو گئے۔ پھر ایک عرصہ کے بعد صدر شعبہ دینیات کے عہدہ پر فائز کئے گئے، اور جب پچپن سال کی عمر کو پہنچے تو اس عہدہ سے وظیفہ (پنشن) لے کر خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ (۸۱)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ آپ کی مکمل سوانح ''حیات گیلانی'' ہے۔

مولانا گیلانی نے شاعری بھی کی ہے۔ اور شاعری میں مناظر تخلص کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ منظر کشی میں انہیں پوری مہارت حاصل ہے۔ (۸۲)

بازگشت کے عنوان سے ان کی ایک نظم مشہور ہے۔ یہ نظم شعری محاسن سے آراستہ ہے۔ ترکیب کی پختگی، بندش کی چستی، مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے پُر ہے۔ اسلامی تاریخ کی جھلک اس نظم

میں نمایاں ہے۔نظم میں سلاست اور روانی ہے۔ساتھ ہی جذبات کی فراوانی بھی ہے۔اس نظم کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا گیلانی قادرالکلام اور روشن فکر شاعر تھے۔نظم ملاحظہ ہو ؎

بازگشت

رعشہ سا اک طاری ہوا — اور تھی بدن میں تھرتھری
باہر کی کچھ تاثیر تھی — یا وہم کی کاریگری
چپکے سے کہتا ہے کوئی — تیری نظر ہے سرسری
حیران کیوں ہوتا ہے تو — کیوں ہے تجھے یہ ششدری
کوئی نیا نظارہ ہے — یہ زیر چرخ چنبری
اسلاف کے تیرے یہاں کی — بخت نے کی جب یاوری
تیرے بزرگوں کو یہاں — جس دم ملی تھی برتری
وہ شوکت اسکندری — وہ صولت گردوں فری
شاہنشہی و سروری — دارای وہم داوری
ہاں! کون ان میں تو بتا — ہامانیت سے تھا بری
اور خاک وخشت وسنگ سے — کسی نے نہ کی بازیگری
کتنے ہوئے ان میں جو تھے — بر جادۂ پیغمبریؐ
کتنوں نے ؟ تو انصاف کر — دکھلائی شان حیدری
کتنے بنے کسریٰ یہاں — اور کی انہوں نے قیصری
دنیا اسی کا نام ہے — یہ سب ہے جنگ زرگری
لے غافل! اپنی تو خبر — تجکو پرائی کیا پڑی (۸۳)

مولانا گیلانی نے علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات حسرت آیات پر ایک نوحہ بعنوان ’’نوحہ سلیمان‘‘ یا ’’عقیدت کے چند آنسو‘‘ تحریر فرمایا ہے ۔ اس میں مرثیہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔زبان رواں،شخصیت پر حاوی اور زندگی کے نشیب وفراز پر محیط ہے۔اس سے مولانا گیلانی کی شاعری میں مہارت پوری طرح جلوہ گر ہے۔نوحہ سلیمان پیش ہے ؎

اے سلیماں! آہ پیغمبر کا وہ سیرت نگار!
جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار

آج محفل علم کی افسوس سونی ہوگئی
دین ودانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار

اب کریگا کون ہم میں دین کے اسرار کو
کاوش تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

خدمت بے مزد کرتا کون ہے اسلام کی
کس پہ ہوگا مفت کے اس عشق کا سودا سوار

ذوق علمی کے ترے عربی زباں ممنون ہے
ندوے کی تعلیم کا مانا گیا تو شاہکار

گو پڑھا ندوہ میں تھا لیکن علی گڈھ دیوبند
تیرے علم وفضل کا کرتے تھے دونوں اعتبار

خندہ زن یورپ تھا قرآنی قصص پر جہل سے
تیرے خامہ نے بتایا اس کا تاریخی وقار

چاک پردوں کو کرے گا کون استشراق کے
ان کی چالوں پر کرے گا خود انہیں کو شرمسار

حوصلہ افزائیاں تیری، خدا بخشے تجھے
کتنے ناکارے بنے ان کی بدولت اہل کار

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

آج ہیں مبہوت تیری راہ کے سارے رفیق
گم وہی ہے ان میں جو تھا سب سے بہتر شہسوار

کھوئے کھوئے آج کل ہیں جوش بھی اور ہوش بھی
حضرت امجد بھی چپ ہیں اور جگر بھی دلفگار

خلق تیرا، حلم تیرا، تیرا شرمیلا مزاج
یاد میں ان کی رہینگی اپنی آنکھیں اشکبار

فتنہائے نو بہ نو سے ہوگیا آزاد تو
بے قراری میں بھی اک چیز ہے وجہ قرار

جن کے تو قابل نہ تھا ان سے ملی تجھکو نجات
وہ بھی ہلکے ہوگئے جن کے دلوں کا تھا تو بار

اہل دنیا اب نہ آئیں گے ستانے کے لئے
ایک ہی مسلہ کو پوچھیں گے نہ تجھ سے بار بار

اب بیاں چاہیں گے نہ تجھ سے صحافت کے سفیر
وقت کو ضائع کریگی اب نہ پبلک کی پکار

کام کیا ہے اب خدا والوں کا ایسے عہد میں
خودنمائی، خودفروشی کی ہو جب دنیا شکار

پیری وبیماری میں اللہ رے چستی تری
جست اک ایسی لگائی ہوگیا دنیا سے پار

بس گئے ہوں جس کے دل میں رحمۃ اللعالمین
گود میں اس کو نہ لے کیوں رحمت پروردگار

دل بھی کہتا ہے کہ تو مرحوم ہے مغفور ہے
مصطفیٰ تیرے شفیع اور رب ترا آمرزگار

ہے یہی کافی کہ تجھ کو تھانوی دربار سے
جانشینی اور خلافت کا تھا حاصل افتخار

گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقیں
آرہے ہیں آگے پیچھے سب ترے احباب ویار

حق کی مرضی تھی وگرنہ آرزو اپنی یہ تھی
ہوتا اعظم گڈھؔ میں یا دسنہؔ ہی میں تیرا مزار

ہے جسد مدفون تو کیا روح تو آزاد ہے
اپنے تصنیفی ادارے کی تماشا کر بہار

قافلہ سالار اب بھی غمزدہ مسعودؔ ہے
بعد تیرے پشت پر اپنی اٹھائے تیرا بار

رو رہے ہیں منہ چھپائے مولوی عبدالسلام
دل بھی اور آنکھیں بھی ان کی آج ہیں خونبانہ بار

شاہ مولانا معین الدین احمد کو بھی دیکھ
چاک ہے جن کا گریباں اور دامن تار تار

اور عزیز خاص وہ صباح الدینؔ غریب
تیرے ہی در پر پڑا ہے خستہ وزار و نزار

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریاباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یاران غار

ہو کبھی آنا جو دسنہؔ تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

(۸۴)

۵/جون ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔اور آبائی قبرستان گیلان میں مدفون ہوئے۔

(۱۰)

مولانا سید عبدالحکیم ارمانؔ بتیاوی

سید محمد عبد الحکیم نام۔ابو نعیم کنیت ۔ارمانؔ تخلص، مولوی سید محمد کریم بخش کے صاحبزادے۔مولد موضع بانس گھاٹ ،ضلع چمپارن۔مسکن بتیا،ضلع مغربی چمپارن۔ ولادت ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء۔ان کا سلسلہ نسبت حضرت مولانا جمال الدین کوڑہ جہان آبادی (لکھنؤ) سے ملتا ہے۔ان کی اولاد کو حضرت مخدوم قتال نے بحیثیت امام مسجد چوکی قتال پورہ چھپرہ بلایا تھا۔اور تب سے یہ خانوادہ وہیں سکونت پذیر ہے۔تبحر علمی اور خاندانی علو مرتبت نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا یا۔مہاراجہ بتیا نے ان کے پردادا کو بلوا کر مسجد کی امامت کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا اور نرکٹیا گنج کے علاقے میں جاگیر بھی عطا کی۔

حضرت مولانا ارمانؔ نے عربی وفارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولوی آرش حسین سے پڑھیں۔ مدرسہ اسلامیہ موتیہاری میں داخل ہوئے۔ وہاں فوقانیہ تک تعلیم حاصل کی۔ پڑھنے میں تیز تھے۔خان بہادر محمد جان نے انہیں ان کی ذہانت وتیزی طبع کا اعتراف کرتے ہوئے ایک مڈل عطا کیا تھا۔مولانا نے درجہ بدرجہ تعلیمی مراحل طے کر کے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے

فاضل کی سند حاصل کی۔ کچھ دنوں مسجد درگاہ شاہ ارزاں کے امام بھی رہے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا پھر بتیا لوٹ آئے۔ کے۔ آر میشن ہائی اسکول بتیا میں ان کا تقرر بحیثیت ہڈ مولوی ہو گیا اور تب سے بتیا ہی میں مقیم ہو گئے۔ مولانا حضرت سید محمد شفیق نقشبندی کے مرید تھے۔ ان کے پیر طریقت حضرت مولانا سید محمد شفیق نقشبندی سندیلویؒ کے فیوض و برکات کو بڑا دخل رہا ہے۔ موصوف ہر وقت اذکار و اشغال میں منہمک رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانے میں وہ عالم استغراق میں اس طرح کھو گئے کہ لوگ انہیں صاحب جنون سمجھنے لگے۔ لیکن یہ کیفیت تھوڑے دنوں رہی۔ آہستہ آہستہ عالم سلوک میں داخل ہو کر بالکل نارمل ہو گئے۔ (۸۵)

جناب ارمانؔ کو ایام طالب علمی ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی رہی ہے۔ لسان العصر حضرت نوحؔ ناروی کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شاگرد جب سے ایسے سخنور کے ہو گئے ۔۔۔ مشہور خلق ہو گئے ہم نوحؔ کی طرح

اضافہ ہو گیا تیری طبیعت کی روانی میں ۔۔۔ جناب نوحؔ کے طوفان کا یہ فیض ہے ارمانؔ

ارمانؔ نے اہل چمپارن میں شعر و سخن کی جو لہر دوڑائی وہ آج تک یادگار ہے۔ وہ بذات خود ایک انجمن تھے۔ ان کی صحبتوں سے بہتوں نے فیض اٹھایا۔ یہ وہ چراغ تھے جن سے سینکڑوں چراغ روشن ہوئے۔ ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد بتیا اور اس کے نواح میں ہے اور جو اب بھی شمع ادب فروزاں کئے ہوئے ہے۔

ارمانؔ پر داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر خورشید سمیع تحریر کرتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں سادات گھرانے میں ایک چراغ روشن ہوا۔ اور وہ تشنگی علم کے سبب موتیہاری سے ہو کر عظیم آباد میں مدرسہ شمس الہدیٰ تک حصول علم کی خاطر جلتا رہا کہ روشنی پھیلے اور دور دور تک پہنچے۔ دینی علم کے حصول سے فارغ ہو کر پٹنہ یونیورسیٹی سے گریجویٹ کی سند حاصل کی تاکہ انگریزی اور دنیاوی علم میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ مگر بہ ایں ہمہ شعری محرکات کو یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا کہ شاعرانہ کیفیت کبھی کبھی اضطراری اور زود شکن ہوتی ہے۔ اور یہی کشش فصیح الاثر استاد گرامی حضرت نوحؔ ناروی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے تک پہنچاتی ہے۔ اور اس طرح داغؔ دہلوی کی شعری روایت نوحؔ ناروی سے ارمان تک بخوبی پہنچ جاتی ہے۔ اور علم کی خواہش نے

سید سلیمان ندویؔ کے خطبات کی کتابت کے فرائض ادا کرنے کی راہ دکھائی۔ ان تمام باتوں سے عظیم آباد سے وابستگی واضح ہو جاتی ہے اور یہی والہانہ لگاؤ ان اشعار میں منعکس ہوتا ہے۔

ہائے اب کیا ہوگئی رونق عظیم آباد کی
دل میں یاد آتی ہے رہ رہ کر جناب شادؔ کی
لطف نظارہ بتوں کا اور وہ گنگا کی سیر
خلد میں بھی یاد آئے گی عظیم آباد کی
زاہدو! اس کا سمجھ سکتے نہیں تم مرتبہ
عشق کے کوچہ میں جس نے زندگی برباد کی

یہاں داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ الفاظ کی نفاست بلکہ الفاظ کی مناسب نشست کا لحاظ، تغزل کا رنگ اور غزلوں کا مستند اور دل آویز لہجہ ان اشعار کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے کہ اس قبیل کے اور اس سے خوب تر اشعار بھی آپ کو اسی شعری مجموعے میں ملیں گے۔ ارمانؔ نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے کہ غزلوں کی کیفیت سے گزر کر ''الہام ارمان'' میں اصناف نظم، رباعیات، قطعات، منقبت، سہرے، موسمیات، تہواروں، حب الوطنی، اور دینی جذبات سے سرشار نظمیں اس شعری مجموعے کو گلہائے رنگارنگ بنا دیتی ہیں۔ **(۸۶)**

ارمانؔ نے کامیاب نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں نظیرؔ اکبر آبادی کا عکس جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید سمیع تحریر کرتے ہیں:

ارمانؔ اپنی شعری مزاولت میں نسبتاً کہنہ مشق ہیں اور شعری روایات میں داغؔ دہلوی اور نوحؔ ناروی کے شعری روایات سے قریب تر ہونے کے باوجود اپنی نظموں میں نظیرؔ اکبر آبادی ہی کی طرح مختلف موضوعات پر کامیاب نظمیں لکھ کر موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں قوافی کا التزام بلکہ اکثر جگہوں پر قوافی کی جھنکار کا تسلسل ملتا ہے۔ بطور خاص ''ساون'' کے آنے سے قبل اور ساون کی رِم جھم کے بعد منظر نگاری کے ثبوت کے طور پر یہ اشعار دیکھئے ؎

ہر خاک کے ذرے ذرے پر اک قہر خدا کا چھایا تھا
یا زور جہنم نے دنیا میں آ کے خود دکھلایا تھا

اللہ رے وہ گرمی کا عالم دھونی ہر جا جلتی تھی
تھیں سورج کی کرنیں وہ یا آگ کی برچھی چلتی تھی
برف پگھلتی رہتی تھی اور آگ کے دریا بہتے تھے
سیماب کی صورت سے حیواں ہر وقت تڑپتے رہتے تھے

اور یہ بھی قابل غور ہے کہ ساون کے انتظار میں شاعر جھلس رہا ہے کہ یہاں منظر نظم کے پور پور سے ابھر رہا ہے اور اسے منہا کر دینے سے کام نہیں بنتا کہ یہ منظر موضوع بن کر نظم میں جاری وساری ہے اور نظم کی ہیئت اسی موضوع کی زائیدہ اور پروردہ ہے کہ منظر نگاری میں ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ میں باندھنے میں یا سو رنگ کے مضمون کو ایک رنگ میں باندھنے میں شاعرانہ صناعی سے کام لیا گیا ہے۔اب ساون کے آتے ہی منظر بدلتا ہے اور یہ سماں سامنے آتا ہے ؎

دریائے کرم کو جوش ہوا جو قہر یہ دیکھا گرمی کا
اللہ نے موسم وہ بھیجا جو زور دکھائے نرمی کا
پھر ماہ یہ آیا ساون کا پورب سے اٹھی گھنگھور گھٹا
شاداب بنانے دنیا کو ناگاہ چلی پھر سرد ہوا
بیلا جو ہنسی چمپا بھی ہنسی اور نرگس بھی اترانے لگی
پھر ہجر کے سارے قصوں کو بلبل بھی وہاں دہرانے لگی
پھر کوک اٹھی کوئل کی بن میں مور بھی دیکھو بول اٹھا
اور ناچ دکھانے کی خاطر وہ پر کو اپنے کھول اٹھا **(۸۷)**

مزید تحریر کرتے ہیں:

نظیرؔ اکبر آبادی سے نظموں کا جو بدلا ہوا رویہ ملتا ہے وہ الفاظ کی نفاست وزور بیان اور روانی کے لئے مشہور ہوا ہے اور کم وبیش وہی رویہ ارمانؔ کی نظموں میں نظر آتا ہے کہ موسمیات کے حوالے سے جو نظمیں کہی گئی ہیں وہ سب کی سب نظمیں طویل ہونے کے باوجود رواں دواں ہیں۔’’آمد فصل بہار‘‘ اس کی جاگتی مثال ہے۔تہواروں کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب یں ہزاروں سال پرانی مذہبی روایات سامنے آتی ہیں۔’’ہولی‘‘ بڑا دن اور ’’عید سعید‘‘ کے حوالے سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں

وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ تمثیلی طور پر عیسیٰ مسیحؑ کی پیدائش کے دن جس روز سے دن بڑھنے لگتا ہے اس معجزاتی کیفیت کو ان دو اشعار میں یوں اجاگر کیا گیا ہے ؎

مسیحا کی ولادت پر نہ صرف انسان شاداں تھے
پکار اٹھے عنادل بھی بہار آئی بہار آئی
مسرت انس و جاں پر ہی نہ تھی موقوف اے ارمانؔ
خوشی سے بڑھ گیا ''دن'' جب ولادت کی خبر آئی **(۸۸)**

حضرت ارمانؔ کی نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شاداںؔ فاروقی تحریر کرتے ہیں:

حضرت ارمانؔ نے اچھی نظمیں کہی ہیں اور پیاری غزلیں بھی۔ ان کی نظموں میں ''بزم درشیز گان'' ''یوم آزادی'' ''آمد فصل بہار'' ہسپتال'' ''اور ایک لڑکی کو دیکھ کر'' امتیازی شان رکھتی ہیں اور ان میں آپ جناب ارمانؔ کے دھڑکتے ہوئے دل کی صدائیں سن سکتے ہیں۔ ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کرنے کی میں بھی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

ہے یاد تجھے کچھ اے ساقی کہ ننگ مرا شاہانہ تھا : تھا ملک میں ساغر میرے ہی اور قبضے میں پیمانہ تھا
جب ہوش میں تھے تو ساقی کی کچھ چشم کرم بدلی ہی رہی : جب مست ہوئے تو ساقی کا پیمانے پر پیمانہ تھا
ہے ہے رے اُداسی محفل کی جب روٹھ کے وہ محفل سے چلے : خاموش زباں تھی شمع کی، بیتاب ہر اک پروانہ تھا
اللہ رے رشک شرم گنہہ محشر میں مجھے یہ راز کھلا : قطرہ جو گرا تھا آنسو کا، ہر ایک گہر کا دانہ تھا
ہم ہجر کا قصہ کہنے کو جب بزم میں ان کی بیٹھے تو : سر پٹ کے اعدا روتے تھے وہ درد بھرا افسانہ تھا
اللہ رے ان کا طرز وفا، پوچھا نہ کبھی جیتے جی : اب بعد ہمارے مرنے کے کہتے ہیں مرا دیوانہ تھا

خدا کے واسطے ہم میکشوں کو یوں نہ رسوا کر
نگوں مینا، شکستہ جام، ساقی تیری محفل میں

نہ پوچھ مجھ سے چمن کی بہار اے ہمدم! : رہا میں قید میں جب موسم بہار آیا
خدا کے واسطے میخانہ کھول دے ساقی : خزاں کے دن گئے اب موسم بہار آیا
کہاں جائے سلامت بچ کے کوئی شوخ چتون سے : ہزاروں ہو گئے مجروح تیری چشم پرفن سے

سوا نیزے پہ آئے مہر دنیا میں قیامت ہو | اٹھے اک دن اگر پردہ کسی کے روئے روشن سے
اسیرو! ہو نہ ہو لائی یہ اب مژدہ رہائی کا | صبا انگڑائیاں لیتی ہوئی آئی ہے گلشن سے
ہجوم غم میں دل بہلے تو بہلے کس جگہ ارماںؔ
مجھے وحشت ہے صحرا سے مجھے وحشت ہے گلشن سے

وہ رخ پر ڈال کر گیسوئے پیچاں مسکراتے ہیں | گہن میں چاند کو لا کر کوئی جادو جگاتے ہیں
یہ اقرار محبت ہے کہ انکار محبت ہے | کہ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ فوراً مسکراتے ہیں

فلک کو لاگ تھی مجھ سے یہاں تک | مٹایا میری تربت کا نشاں تک
وفا کی اب رکھوں امید کس سے | گریزاں مجھ سے ہے عمر رواں تک
بہت بے ربط ہے افسانہ غم | سناؤں میں کہاں سے اور کہاں تک

مٹی بھی میری وصل سے محروم ہی رہی | کترا کے وہ نکلتے ہیں میرے مزار سے
لے چل جنوں وہاں پہ جہاں ہو نہ صبح وشام | تنگ آ گیا ہوں گردش لیل ونہار سے
ان کو بھی تو سنورنے سے فرصت کبھی نہیں | کیونکر ملیں گے عاشق سینہ فگار سے
کیاں مہوشوں سے پڑ گیا ارماںؔ کو واسطہ
لیل ونہار رہتے ہیں وہ بے قرار سے
کچھ آپ بھی تو کہئے کیا دال میں ہے کالا | کچھ راز کھل رہا ہے مسکی ہوئی قبا سے

اقرار وصل کرنے پہ انکار ہوگیا | یہ تو جناب آپ سے سوبار ہوگیا
دے کر زبان وصل کی پھرنا ہے کب درست | اقرار ہوگیا بس اقرار ہو گیا
الفت میں اور ہو گیا ایزا پسند دل | مرنا اسی سے اور بھی دشوار ہوگیا
خنجر کے وار ہم تو سنبھالا کئے مگر | بچنا تمہارے تیر سے دشوار ہوگیا
ساقی یہ ہے اعجاز تری چشم مست کا | میخوار جو نہ تھا وہ اب میخوار ہوگیا

کیا میکشوں نے دیکھ لی مستی بھری نگاہ　　بدمست کوئی ہوگیا، کوئی سرشار ہوگیا

جھلک چلمن سے وہ اپنی دکھا کر　　زمانے سے مجھے تڑپا رہے ہیں
شب وصلت کی باتیں یاد کر کے　　ابھی تک مجھ سے وہ شرمسار ہے ہیں

(۸۹)

حضرت ارمانؔ نے ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔ آستانہ امینیہ لہوریا میں ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔

آپ نے علماء کی شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ کیا۔ اس سے واضح ہے کہ علماء کی اردو شاعری فکر اور فن دونوں سے آراستہ ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں شعری محاسن بھی موجود ہیں۔ اور انہوں نے اردو شاعری کو عالمی ادبی معیار تک پہنچانے میں قابل قدر خدمات پیش کئے ہیں۔ ان کی شاعری میں مرعوبیت نہیں، بلکہ انہوں نے اپنے ادبی سرمایہ کو قابل فخر سمجھتے ہوئے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ اس میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔

مراجع

(۱)　تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ ص۔ ۲۵۷
(۲)　مسلم شعرائے بہار جلد اول۔ ص ۲۲۹
(۳)　اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص ۱۸۳)
(۴)　اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص ۱۸۴)
(۵)　مسلم شعرائے بہار جلد اول۔ ص ۲۲۹
(۶)　شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری۔ ص۔ ۱۴۷
(۷)　شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری۔ مختلف صفحات
(۸)　شاہ آیت اللہ جوہری حیات و خدمات، ص ۱۵۳ / ۱۵۴
(۹)　شاہ آیت اللہ جوہری حیات اور شاعری، ص ۱۹۹
(۱۰)　بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری۔ ص ۱۳۱
(۱۱)　بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص۔ ۲۶۰

(۱۲) حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری۔ص۔۲۹۰
(۱۳) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ص۔۵۰۹
(۱۴) حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری۔ص۔۲۵۵
(۱۵) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص۔۴۹
(۱۶) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص۔۵۱
(۱۷) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری۔ص۔۳۲۶
(۱۸) صوفی منیری حیات اور شاعری،ص ۱۴۳
(۱۹) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۲۳
(۲۰) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۰۷
(۲۱) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۱۱
(۲۲) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۱۱
(۲۳) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۱۳
(۲۴) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۲۲
(۲۵) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۲۵
(۲۶) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۳۳
(۲۷) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۳۴
(۲۸) صوفی منیری حیات اور شاعری۔مختلف صفحات
(۲۹) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۳۵
(۳۰) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص۔۱۳۵
(۳۱) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۱۳۶
(۳۲) صوفی منیری حیات اور شاعری۔مختلف صفحات
(۳۳) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص۔۹۵
(۳۴) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۹۶
(۳۵) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۹۷
(۳۶) صوفی منیری حیات اور شاعری۔ص ۹۹
(۳۷) صوفی منیری حیات اور شاعری۔مختلف صفحات

(۳۸) مسلم شعرائے بہار جلد سوم ص ۲۱۲ تلخیص۔ حیات فرد سوانح
(۳۹) مسلم شعرائے بہار جلد سوم۔ ص ۲۱۲
(۴۰) رسالہ جام جم جلد ۲ شمارہ ۲ (حمید عظیم آبادی)
(۴۱) مسلم شعرائے بہار جلد سوم۔ ص ۲۱۲
(۴۲) تذکرہ علمائے بہار۔ ص۔ ۲۷۴
(۴۳) مسلم شعرائے بہار جلد اول۔ ص۔ ۲۴۴
(۴۴) مسلم شعرائے بہار جلد۔ اول۔ ص۔ ۲۴۴
(۴۵) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد۔ اول۔ ص۔ ۲۴۴
(۴۶) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری۔ ص۔ ۳۰۶
(۴۷) تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ ص۔ ۲۸۲، بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری، ص ۳۲۹
(۴۸) مسلم شعرائے بہار جلد اول، ص ۸۳
(۴۹) تجلیات عشق، ص ۵
(۵۰) تجلیات عشق، ص ۶
(۵۱) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری، ص ۳۳۰
(۵۲) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد اول۔ ص ۸۳
(۵۳) مسلم شعرائے بہار جلد (اول) ص ۸۳
(۵۴) مسلم شعرائے بہار جلد (اول) ص ۸۳
(۵۵) دیوان اکبر، ص ۳۲
(۵۶) تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول۔ ص۔ ۱۳۰
(۵۷) سوز و گداز، ص ۷
(۵۸) نغمہ راز، ص ۶۳
(۵۹) دیوان شوق، ص ۸۲
(۶۰) دیوان شوق مختلف صفحات
(۶۱) علامہ شوق نیموی حیات و خدمات۔ ص۔ ۱۳۵
(۶۲) تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول۔ ص۔ ۴۴، تذکرہ شمال بزم صفحہ نمبر (۳۳۹/۳۳۷)، یادگار وطن
(۶۳) تذکرہ شمال بزم صفحہ نمبر (۳۳۹/۳۳۷)

(۶۴) خم خانہ جاوید۔ جلد سوم۔ ص۔ ۱۰۰
(۶۵) دیوان حسنات خیر قلمی، بحوالہ تذکرہ بزم شمال۔ ص ۳۳۷
(۶۶) دیوان حسنات خیر قلمی، بحوالہ تذکرہ بزم شمال۔ ص۔ ۳۳۸
(۶۷) دیوان لمعات خیر بحوالہ تذکرہ بزم شمال۔ ص۔ ۳۳۹
(۶۸) تذکرہ مسلم شعرئے بہار۔ جلد دوم۔ ص۔ ۲۳
(۶۹) حیات سلیمان مکمل سوانح پرانے چراغ۔ ص۔ ۱۹، تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول۔ ص۔ ۱۱۳
(۷۰) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری۔ ص۔ ۳۸۳
(۷۱) مکتوب ۳۴، اقبال نامہ حصہ اول، ارمغان سلیمان، ص ۵
(۷۲) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری۔ ص۔ ۳۸۳
(۷۳) مسلم شعرائے بہار، دوم، ص۔ ۱۶۲
(۷۴) ارمغان سلیمان، ص ۱۰
(۷۵) ارمغان سلیمان، ص ۱۲
(۷۶) ارمغان سلیمان، ص ۴۷
(۷۷) رسالہ معارف جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ، مسلم شعرائے بہار، جلد دوم، ص ۱۶۴
(۷۸) مسلم شعرائے بہار، جلد دوم، ص ۱۶۵
(۷۹) مسلم شعرائے بہار جلد دوم، ص ۱۶۶
(۸۰) تذکرہ علمائے بہار جلد اول، ص ۳۱۶
(۸۱) مسلم شعرائے بہار جلد، چہارم، ص ۲۱۶
(۸۲) تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ ص۔ ۳۱۶
(۸۳) مسلم شعرائے بہار جلد چہارم، ص ۲۱۶
(۸۴) مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم، ص ۲۱۶
(۸۵) تذکرہ علمائے بہار۔ ص۔ ۳۱۲
(۸۶) الہام ارمان۔ ص۔ ۲۲
(۸۷) الہام ارمان۔ ص۔ ۲۴
(۸۸) الہام ارمان۔ ص۔ ۲۵
(۸۹) تذکرہ بزم شمال۔ ص ۳۶۳

باب چہارم

محاکمہ

میرے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ'' ہے۔اس کا باب اول بہار میں اردو شاعری ہے۔اس باب کے ابتدا میں میں نے بہار میں اردو شاعری کا مختصر مطالعہ پیش کیا ہے۔جس سے بہار میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے۔اس مطالعہ میں میں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بہار میں اردو شاعری کا دور اسی عہد میں شروع ہوا جب دکن، دلی اور لکھنؤ میں شروع ہوا تھا۔چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں بہار میں بزرگان دین کی آمد شروع ہو گئی تھی۔حضرت تاج فقیہ ۵۷۶ھ میں قصبہ منیر میں تشریف لائے،اور منیر کو فتح کیا۔ان کے خانوادہ میں سے حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری (۶۶۱ھ۔۷۸۲ھ) کے دوہے ملتے ہیں۔جن سے بہار میں قدیم اردو کے رائج ہونے کا پتہ چلتا ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بہار کی ادبی روایتیں بہت قدیم ہیں۔اور جدید تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دبستان دکن کے فوراً بعد بہار میں تخلیق ادب کا کام شروع ہو چکا تھا۔اور یہاں کے علماء،صوفیاء شعر وادب کی آبیاری کرر ہے تھے۔جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری میں داخلیت کا عنصر غالب تھا۔صوفیانہ خیالات،سنجیدگی اور پاکیزگی کی آمیزش نے یہاں کی شاعری کو اور چمکایا۔پھر یہ کہ تاریخی اعتبار سے پٹنہ اور دہلی کی فضاء ایک جیسی تھی۔اس لئے دہلی کی مماثلت اسے حاصل ہوئی۔

اردو زبان وادب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گیارہویں صدی ہجری سے بہار میں اردو شاعری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔مرزا عبدالقادر بیدلؔ (۱۰۵۴ھ-۱۱۲۳ھ) عظیم آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی تقلید دہلی کے شعراء نے بھی کی ہے۔ان کے بعد سید شاہ عمادؔالدین قلندر پھلواروی (۱۰۶۵ھ-۱۱۲۴ھ)، ملا محمد علیم تحقیق (۱۰۷۰ھ - ۱۱۶۳ھ)، شاہ مجیبؔ اللہ پھلواروی (۱۰۹۸ھ-۱۱۹۱ھ)، غلام نقشبند سجادؔ (۱۱۱۶ھ-۱۱۷۳ھ) وغیرہ کے کلام ملتے ہیں۔ان کے بعد شاہ آیت اللہ جوہریؔ (۱۱۲۶ھ-۱۲۱۰ھ)، غلام یحیٰؔ حضور (متوفی ۱۲۰۶ھ)، شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی (۱۱۵۰ھ-۱۲۱۶ھ)، شاہ نور الحق طپاںؔ (۱۱۵۶ھ- ۱۲۲۳)،

غلام علی راسخؔ عظیم آبادی (۱۱۶۲ھ - ۱۲۳۸ھ)، شاہ ابوالحسن فردؔ (۱۱۵۱ھ - ۱۲۶۵ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ اشرف علی فغاںؔ، میر محمد باقر حزیںؔ (۱۱۶۵ھ)، شاہ رکن الدین عشقؔ (۱۲۰۳ھ)، مرزا محمد علی فدویؔ (۱۲۱۰ھ)، ضیاءؔ عظیم آبادی نے بھی بہار کی اردو شاعری کو آگے بڑھانے میں اہم کردار پیش کیا۔

راسخؔ عظیم آبادی نے اردو شاعری کو آگے بڑھانے میں مثبت رول ادا کیا۔اردو شاعری کو نئے آہنگ سے ہمکنار کرنے میں راسخؔ عظیم آبادی کا نام نہایت ہی اہم ہے۔انہوں نے غزل اور مثنوی میں بیش بہا اضافے کئے۔ان کی غزلوں میں داخلیت کا عنصر غالب ہے۔ان کی مثنوی کا بھی ایک خاص رنگ ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں جو بیش بہا اضافے کئے اور اردو شاعری میں جو نئی روایت قائم کی وہ تیرہویں صدی ہجری میں نہایت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ان کے شاگردوں نے شاعری کے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔اور اس میں کمال پیدا کیا۔فرحتؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۱۶۱ھ)، شاہ امیرالدین وجدؔ (۱۷۹۸ء- ۱۸۶۸ء)، حسرتؔ عظیم آبادی (۱۲۳۱ھ - ۱۳۰۴ھ)، شوقؔ نیموی (۱۲۷۸ھ - ۱۳۲۳ھ)، شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء -۱۹۲۷ء) نے اردو شاعر میں کمال پیدا کیا۔اور بہار کی اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچایا۔ان کے بعد صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ھ-۱۳۰۷ھ)، اکبرؔ داناپوری (۱۲۶۰ھ- ۱۳۲۷ھ)، فضل حق آزادؔ (۱۸۵۲ء- ۱۹۴۲ء) احقرؔ بہاری (۱۲۷۳ھ - ۱۳۴۸ھ) اور امداد امام اثرؔ (۱۸۴۹ء- ۱۹۳۰ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ علماء کی بے شمار تعداد ہیں، جن میں سے بہت سے شعراء کے کلام کو میں نے اس مقالہ میں شامل کیا ہے۔

مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ دور جدید کے بعد ایک دور مابعد جدید بھی ہے۔اس طرح میں نے دور مابعد جدید کو بھی اپنے تحقیقی خاکہ میں شامل کردیا ہے۔اس طرح چار دور ہوگئے۔دور متقدمین، دور متوسطین، دور جدید اور دور مابعد جدید۔پھر میں نے ان چاروں دور کی حد بندی کی۔ بیدلؔ کا سال پیدائش ۱۰۵۴ھ ہے۔طفولیت کے زمانہ کو چھوڑ دینے کے بعد ۱۰۷۰ھ سے باضابطہ بہار میں اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔اس لئے میں نے اسی سال کو دور متقدمین کی ابتدا قرار دیا ہے۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دور متقدمین (بیدلؔ سے راسخؔ عظیم آبادی تک) ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء سے ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء تک۔

دور متوسطین (راسخؔ عظیم آبادی سے شادؔ عظیم آبادی تک) ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء سے ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء تک۔

دور جدید (شادؔ عظیم آبادی کے بعد سے ۱۹۸۰ء تک) ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۸۰ء تک

دور مابعد جدید یا دور حاضر۔ ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۴ء تک۔

اس باب میں ہر دور کے شروع میں اس دور کے شعری خصوصیات کا مختصر طور پر تذکرہ بھی کیا ہے۔ تاکہ ہر دور کے شعراء کے کلام کی خصوصیت اور اہمیت واضح ہو سکے۔ ساتھ ہی ان کا مقام بھی متعین ہو سکے۔

میں نے اس باب میں بہار کے ان شعراء کا تذکرہ اور نمونہ کلام پیش کیا ہے جو علماء نہیں ہیں۔ چونکہ علماء کی شاعری کے لئے ایک الگ باب مخصوص کیا گیا ہے۔ جس میں بہار کے علماء کی اردو شاعری پر تفصیلی گفتگو ہے۔ اس لئے اس باب میں علماء کو چھوڑ کر اردو کے دیگر شعراء کے حالات اور ان کے کلام سے بحث کیا ہے۔ تاکہ بہار میں اردو شاعری کا عمومی رنگ کیا رہا، اس پر روشنی پڑ سکے۔ اور بہار کے غیر علماء شعراء کا تعارف اور ان کے کلام کا خاکہ بھی سامنے آ سکے۔ اس باب میں میں نے بہار کی اردو شاعری میں اولیت کا شرف کسے حاصل ہے، اس کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہار میں اردو شاعری کی اولیت پر بحث وتمحیص کا دور شروع ہوا، اس کو تحقیق کے روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ موافقین اور مخالفین کے دلائل کو پیش کر کے اس میں مضبوط دلیل کو ترجیح دیتے ہوئے بہار میں اردو کے پہلے شاعر کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب دوم میں میں نے علماء کی اردو شاعری کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جو اس مقالہ کا موضوع ہے۔ اردو شاعری کے آغاز وارتقاء میں علماء اور غیر علماء دونوں نے حصہ لیا۔ گرچہ علماء اس میں پیش پیش رہے۔ اس لئے میں نے قدیم دور کی اردو شاعری پر خاص طور سے ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ بہار کی اردو شاعری کے آغاز وارتقاء پر روشنی پڑ سکے۔

اردو شاعری کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بہار کے قدیم دور کی اردو شاعری میں مفہوم کی سادگی اور صفائی ہے۔ اور یہ یہاں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ چنانچہ قاضی عبدالودود کے مطابق قدیم شعرائے بہار کے باقیماندہ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ عہد آبروؔ و مضمونؔ کی ایہام بندی

سے اس صوبہ کے شعراء کو کچھ سروکار نہیں تھا۔ چنانچہ بہار کی ابتدائی اردو شاعری میں ذو معنیٰ الفاظ اور ایہام گوئی نہیں ہے۔ یہاں مقامی بولیوں کا اثر زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ قصبات کی زبان اور ادبی زبان میں فرق نظر آتا ہے۔ بہار کی اردو شاعری میں فارسی کے اثرات کم ہیں جبکہ بھاشا کے اثرات زیادہ ہیں۔ ہندی شاعری کا درد اور فارسی کی چاشنی سے اردو شاعری کے لئے ایک نیا مزہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلی اور لکھنؤ کا جو معیار اردو معلّٰی کے سلسلہ میں ملتا ہے۔ بہار میں اس کا جداگانہ معیار پایا جاتا ہے۔ بہار کی اردو شاعری چونکہ خانقاہوں سے آگے بڑھی۔ اس لئے اس میں پاکیزگی اور مضامین میں رنگارنگی شروع ہی سے ملتی ہے۔ بہار کی شاعری امرد پرستی و عامیانہ خیالات سے بالکل پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دور اول کی اردو شاعری میں بھی جو غزلیں دستیاب ہیں ان کا رنگ زیادہ تر عارفانہ ہے۔ اس تمہیدی بحث کے بعد میں نے علماء کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اور ہر دور کے علماء کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ تاکہ اردو شاعری میں بہار کے علماء کی خدمات سامنے آسکیں۔

دور متقدمین میں ابتدائی دور کے علماء جن کے اردو کلام محفوظ ہیں، ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں قدامت کا رنگ غالب ہے۔ ساتھ ہی فکر کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اردو شاعری کی آبیاری کی ہے۔ اور جملہ اصناف کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے اپنی کوششوں کے ذریعہ اردو شاعری کو ایک معتبر اور مستند راستہ فراہم کرایا۔ عربی اور فارسی کا سرمایہ ان کے پاس موجود تھا۔ اس سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اور اردو شاعری میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ غزل، مخمس، رباعی، مثنوی، قصیدہ، نعت، مرثیہ، غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ اور اس کو فکر وفن سے آہنگ کیا۔ جبکہ بعد کے شعراء کے کلام کافی صاف اور شستہ ہیں۔ ان میں فکر بھی ہے، فن بھی ہے اور صوتی آہنگ بھی۔

دور متوسطین کی شاعری میں متقدمین کے مقابلہ میں زبان بہت حد تک صاف ہے۔ انداز بیان شگفتہ اور سلیس ہے۔ اردو شاعری کے فروغ اور ارتقاء کے لحاظ سے دوسرا دور کامیاب اور شاندار رہا ہے۔ اس دور میں بہت سے شعراء پیدا ہوئے۔ جنہیں پوری قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ ساتھ ہی وہ قادر الکلام بھی تھے۔ انہوں نے ہیئت اور موضوع کو وسعت دیا۔ لسانیاتی اعتبار

سے اس دور کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس میں زبان کی قدامت کم ہوتی نظر آتی ہے۔اور کلام میں سادگی، صفائی، فصاحت و بلاغت اور روانی و سلاست پائی جاتی ہے۔اس دور میں غزل کو خاص اہمیت حاصل رہی اور اردو غزل گوئی کو مقبول بنانے میں علماء نے بھی خوب حصہ لیا۔اس دور میں شعراء کی سوانح اور ان کے کا نمونہ کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی جگہ جگہ ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

دور جدید اردو شاعری کے لئے نہایت ہی روشن اور تابناک دور ہے۔اس میں بہت سے شعراء پیدا ہوئے، جنہوں نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا، اسے فروغ بخشا اور اپنی کاوشوں سے بام عروج تک پہنچایا۔زبان و بیان کے اعتبار سے یہ دور اردو شاعری کے لئے نہایت ہی کامیاب رہا۔فن کو نئی نئی تیکنک سے ہم آہنگ کیا۔طرز اظہار اور پیرائے بیان میں دلکشی اور رعنائی پیدا کی۔کلام میں جدّت وندرت سے کام لیا۔موضوعاتی اعتبار سے اپنے کلام کو کافی وسعت دیا۔اور اپنے کلام کو فلسفیانہ رنگ سے ہم آہنگ کیا۔ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور گیرائی بھی ہے۔ساتھ ہی حسن اور تر و تازگی بھی ہے۔اس دور میں بھی شعراء کی سوانح اور ان کے کلام کو پیش کر کے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

باب سوم میں چند شعراء کے کلام کا تفصیلی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں چند شعراء کی سوانح کلام کا نمونہ، ان کی شاعری کی خصوصیت اور معاصر شعراء میں ان کی حیثیت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس باب میں شاہ جلیل الدین احمد صوفؔی منیری کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ صوفؔی منیری کی کلام میں جذبات کی شدت، گہرائی اور آمد ہے۔انہوں نے غالبؔ کی شاگردی اختیار کی تھی، اس لئے ان کے کلام میں غالبؔ کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔صوفؔی نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان کے غزلوں کا مزاج ان کے دیگر اصناف سخن کی طرح منفرد نظر آتا ہے۔انہوں نے غالبؔ کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔لیکن صوفؔی کی شاعری میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ان کے طرز اسلوب میں تصوف کی چاشنی اور وسیع المشربی نظر آتی ہے۔صوفؔی کے اشعار میں غالبؔ کا رنگ نمایاں ہے، اس کو تقابلی مطالعہ سے واضح بھی کیا گیا ہے۔

صوفیؔ کے کلام میں رندی و مستی کی حقائق بھی ہیں، اور وجد سرور کی کیفیت بھی۔ یار کی جلوہ ستانی اور دیر وحرم کا تجربہ بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔اس طرح صوفیؔ کی شاعری مختلف رنگوں سے آراستہ ہے۔خیال اور انداز بیان ایسا ہے کہ بہت سی دفعہ استاد اور شاگرد کے اشعار میں فرق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔اس کو واضح کرنے کے لئے صوفیؔ کی غزل کے چند اشعار ثبوت کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

صوفیؔ کے کلام میں رندی و مستی کی حکایت، وجد وسرور کی کیفیت، احباب کی سرد مہری جیسے تجربے غزلوں میں موجود ہیں۔صوفیؔ کی غزلوں میں اس طرح کی باتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔غزلوں کے اشعار پیش کر کے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

یہی حال علامہ شوقؔ نیموی کا ہے۔انہوں نے مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی اور حضرت تسلیمؔ لکھنوی سے شعر وادب کا ذوق پایا۔اور کمال حاصل کیا۔ان کے کلام میں غزل گوئی کی جو خوبیاں نظر آتی ہیں، اس کی بناء پر انہیں اردو ادب کے ممتاز غزل گو شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی غزلوں میں جدّت بیان، نازک خیالی، رنگینی، صداقت، شگفتگی، زبان کی سادگی اور جس قدر خوبیاں پائی جاتی ہیں، ان کی وجہ سے ان کی انفرادیت دیگر معاصر شعراء میں نمایاں ہیں۔

علامہ شوقؔ نیموی کی انفرادیت نے انہیں اردو شاعری میں اہم مقام حاصل عطا کیا ہے۔انہوں نے اپنی ان خوبیوں کو اور شعری مقام کو بار بار اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔میں نے ان کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔

شوقؔ نیموی شمشادؔ لکھنوی اور تسلیمؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔تسلیمؔ لکھنوی نسیمؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔جو دہلوی رنگ تغزل کے بڑے شاعر اور مومنؔ اسکول کے پیروکار تھے۔یہی وجہ ہے کہ تسلیمؔ لکھنوی کے شاعری میں دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکول کا رنگ پایا جاتا ہے۔اس کا پورا اثر علامہ شوقؔ نیموی کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ان کے یہاں بھی دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں نہایت ہی مہارت کے ساتھ ان دونوں رنگوں کا استعمال کیا ہے۔اس کی وجہ سے ان کی غزل گوئی کی قیمت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں صداقت بیانی، رنگینی، آمد، تاثیر اور سوز وگداز ملتا ہے جو دہلوی شاعری کا رنگ

ہے۔ دوسری طرف رنگینی، دلکشی اور شوخیاں بھی ملتی ہیں جو لکھنوی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ یہ خوبیاں شوقؔ نیموی کی شاعری میں پوری طرح جلوہ فگن ہیں۔

اسی طرح سید سلیمان ندوی کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ان کی شاعری میں تصوف، مذہب، اسلامیات اور حق ومعرفت کا گہرا رنگ غالب ہے۔ یہ اوصاف ان کی شاعری میں پورے طور پر نمایاں ہیں۔ ان کو میں نے ان کے اشعار کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی شاعری جذبات سے لبریز ہے۔ دریائے نربدا کے کنارے کھڑے ہو کر انہوں نے جو نظارہ دیکھا، اس کو جذبات کے طلاطم نے منظوم کر دیا۔ اس لئے اس نظم میں جذبات کی فراوانی ہے، اسلامی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اور حق و معرفت کا گہرا رنگ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نظم شعری محاسن سے ہم آہنگ بھی ہے۔ اس میں سلاست، روانی اور ایک دلفریب منظر کی عکاسی ہے۔ اشعار پیش کر کے اس کو مزید واضح کیا گیا ہے۔

اس باب میں ارمانؔ بتیاوی کے کلام کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ارمانؔ کو طالب علمی کے زمانہ سے شعروشاعری سے دلچسپی رہی ہے۔ نوحؔ ناروی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور نوحؔ ناروی داغؔ دہلوی کے۔ اس طرح داغؔ دہلوی کی شعری روایت نوحؔ ناروی سے ارمانؔ تک بخوبی پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارمانؔ پر داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں الفاظ کی نفاست اور تغزل کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ ارمانؔ نے کامیاب نظمیں بھی لکھی ہیں۔ شعری روایات میں داغؔ دہلوی اور نوحؔ ناروی کے قریب تر ہونے کے باوجود اپنی نظموں میں نظیرؔ اکبرآبادی کی طرح مختلف موضوعات پر کامیاب نظمیں لکھ کر موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ان کی شاعری میں قوافی کا التزام بلکہ اکثر جگہوں پر قوافی کی جھنکار کا تسلسل ملتا ہے۔ بطور خاص ''ساون'' کے آنے سے قبل اور ساون کی رِم جھم کے بعد منظر نگاری کا ثبوت بھی ہے۔ اس حقیقت کو ان کے اشعار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

ساون کا انتظار اور ساون کے آنے پر سہانا منظر کی عکاسی ارمانؔ کی شاعری میں نہایت ہی دلفریب ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری کا پورا رنگ ارمانؔ کی شاعری میں

جلوہ گر ہو گیا ہے۔ساون کے آتے ہی منظر بدلتا ہے اور جو سماں سامنے آتا ہے۔اس کی منظر نگاری ارمانؔ کی شاعری میں موجود ہے۔

ارمانؔ نے غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی غزلوں میں سادگی ،نفاست اور حسن ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری پُرکشش ہوگئی ہے۔

اس طرح اس باب میں ۱۰ رشعراء کے اشعار پر تنقیدی بحث کر کے ان کے کلام کے محاسن کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ علماء کی اردو شاعری ایک کامیاب شاعری ہے۔ان میں شعری محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کی شاعری نے بہار میں اردو شاعری کی روایت کو نہ صرف پختہ کیا بلکہ اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

باب چہارم میں میں نے محاکمہ کے تحت اس تحقیقی مقالہ میں غیر علماء،علماء اور بہار میں اردو شاعری پر کی گئی بحث کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جس کا ابھی آپ نے مطالعہ کیا ہے۔جب کہ باب پنجم میں نمونہ کلام دیا گیا ہے۔نمونہ کلام میں ۱۰ ران شعراء کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے،جن کا تذکرہ گذشتہ ابواب بھی کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ بقیہ وہ علماء ہیں ،جن کا تذکرہ اور شاعری کا نمونہ گذشتہ کسی باب میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے علماء کی تعداد اور نمونہ کلام میں اضافہ ہو گیا ہے۔

بہار کے علماء کی اردو شاعری کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بہار میں علماء نے اردو شاعری کو سینچا،اس کی آبیاری کی،اس کو کاٹ چھانٹ کر درست کیا اور اردو شاعری کو بہتر سے بہتر رنگ و آہنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔اردو شاعری عالمی ادب سے مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتی ہے،اس میں علماء اور ان کے افکار کے خوشہ چین اور مشرقی ادبیات کے ماہرین شعراء کا اہم حصہ نظر آتا ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب اردو شاعری کو مغرب زدہ بنانے کی کوشش کی گئی تو انحطاط کا دور شروع ہوا۔اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ بعد کے شعراء میں وہ ملکہ،جذبہ،افکار،الفاظ و معنی پر قدرت اور زبان و بیان میں وسعت نہ رہی۔نیز علم بیان،معانی اور بدیع سے دوری بنی رہی۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مغربی ادب سے مرعوب

ہو گئے۔ اور مغربی ادب کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اور اردو شاعری میں جو مشرقیت کا حسن تھا، وہ روز بروز کم ہوتا گیا۔ اس حقیقت کو میں نے اپنے مقالہ میں پیش کیا ہے۔ اور دونوں طرح کے اشعار کو پیش کر کے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوئی ہے کہ ۸۰ر کی دہائی کے بعد علماء کا رجحان شعر و شاعری کی طرف کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ بہار میں اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں علماء کا اہم کردار رہا ہے۔ اور آج بھی ہے اور توقع ہے کہ مستقبل میں بھی اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں علماء کا اہم رول ہوگا۔

☆☆☆

باب پنجم

نمونۂ کلام

علماء کی اردو شاعری کا تفصیلی مطالعہ آپ گذشتہ ابواب میں کر چکے ہیں۔ ان میں نمونہ کلام بھی دیئے گئے ہیں۔ اس باب میں چندان علماء کے کلام کا مزید نمونہ دیا جارہا ہے، جن کے کلام کا مطالعہ گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ چند نئے علماء کا نمونہ کلام بھی پیش کیا جارہا ہے۔ تا کہ بہار کی اردو شاعری میں علماء کی خدمات پر مزید روشنی پڑ سکے۔

(۱)

شاہ جلیل الدین حسین صوفیؔ منیری

شاہ جلیل الدین حسین نام، ابو محمد کنیت شاہ فرزند علی صوفیؔ منیری کے نام سے مشہور تھے۔ منیر ضلع پٹنہ کی خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے۔ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ اور صوفیؔ تخلص کرتے تھے۔ غالبؔ کا رنگ ان کے شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کے حالات اور کلام پر تبصرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ مزید پیش کیا جا رہا ہے۔ تا کہ ان کی شاعری کا رنگ پورے طور سے سامنے آ سکے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

غــــزل

حاصل ہے مرے رشک کا حرماں کہیں جسے | سایہ ہے وہ مرا شب ہجراں کہیں جسے
ہے عکس وہ مرا جسے کہتے ہیں لوگ قیس | میرا ہے جلوہ گاہ بیاباں کہیں جسے
اے رشک مہر جلوہ ترا ہے نگاہ سوز | پردہ ترا ہے عارض تاباں کہیں جسے
غش آپ کو نہ آئے تو لاؤں حضور میں | وہ آئینہ کہ دیدہ حیراں کہیں جسے
مجھ کو کہ مدتوں پہ قفس سے رہا ہوا | صبح وطن ہے شام غریباں کہیں جسے
سر سے زیادہ درد ہے اب پانوں میں مرے | درماں نہیں ہے کوشش درباں کہیں جسے
خوگر ہوں مشکلوں کا امید وصال میں | دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جسے
خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات | ہے صبح عید چاک گریباں کہیں جسے
ہوں گے گھڑی کے چور کے مانند منفعل | بیٹھے ہیں لے کے وہ دل نالاں کہیں جسے
ہر اک اشارہ ہے سبب انقلاب دہر | گردش ہے چشم یار کی دوراں کہیں جسے
عاشق کو قتل کرتے ہیں بیتاب دیکھ کر | ہے یہ ترحم ان کا وہ احساں کہیں جسے
مغرور مثل شیخ نہ ہو بیٹھوں اے جنوں | آیا ہے پائے بوس کو داماں کہیں جسے
سعی طلب میں سرمہ کروں چشم شوق کا | وہ اک کف غبار بیاباں کہیں جسے
جلوے کو تیرے حشر کا کیوں انتظار ہے | جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے

کر غرق بحر عفو کہ کافی نہیں مجھے　　حمام گرم دوزخ سوزاں کہیں جسے
وہ غم سرشت ہوں کہ ہے عشرت کدہ مرا　　اس سے پرے کہ روضۂ رضواں کہیں جسے
صوفیؔ بتائے منزل جاناں کی راہ کون
اب چپ ہے وہ جرس دل ناداں کہیں جسے　　(۱)

دل میں ہے سوز الم آہ و فغاں ہو کہ نہ ہو
گھر میں جب آگ لگی کہئے دھواں ہو کہ نہ ہو
بخت خوابیدہ مرے جاگیں یہ امید نہیں
چشم خونبار مری قطرہ فشاں ہو کہ نہ ہو
برہمن دیر بناتا ہے تو زاہد مسجد
سدرہ کہئے یہ دیوار ومکاں ہو کہ نہ ہو
پاس مینا ہے ٹپک اس کو سمجھ اے ظالم
دل ترے ہاتھوں سے خونابہ فشاں ہو کہ نہ ہو
سرشوریدہ پہ نالے مرے دھرنا قاصد
شکوۂ دوست کچھ اس ڈھب کا بیاں ہو کہ نہ ہو
مست رکھتی ہے مجھے گردش چشم ساقی
ساغر بادہ برابر ہی رواں ہو کہ نہ ہو
مستی اہل خرابات ہے ان میں صوفیؔ
تیرے اشعار پہ دل وجد کناں ہو کہ نہ ہو　　(۲)

اور ہی رنگ فصل گل لائی　　شیخ کی اب کے سال بن آئی
نہ رہی سر پہ منت مطرب　　طائروں کی ہے نغمہ آرائی
دل پژمردہ زندہ ہوتے ہیں　　ہے دم باد میں مسیحائی
ساغر گل سے شیخ ورند ہیں مست　　باد کرتی ہے بادہ پیمائی

شعر غالبؔ سنا کے شیخ نے آج بادہ نوشوں سے توبہ کروائی
''ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی''
ہم نے صوفیؔ مذاق سے اپنے داد اپنے کلام کی پائی (۳)

ہستی میں دو خدا ہوں یہ باطل خیال ہے
دو روحیں ایک جسم میں ہوں یہ محال ہے
اللہ ایک ہے نہیں اس کا کوئی شریک
قالب میں روح وحدت حق کی مثال ہے
ہے تن میں حکمراں پہ نظر سے نہاں ہے روح
حسن اور جسم کی حرکت اس پہ دال ہے
جیسا کہ جسم مظہر آثار روح ہے
روح لطیف جلوہ گہہ ذوالجلال ہے
افعال ہیں گواہ ثبوت صفات کے
صوفیؔ دلیل ذات صفات کمال ہے :(۴)

(۲)
مولانا سید شاہ محمد اکبر اکبرؔ دانا پوری

سید شاہ محمد اکبر نام، اکبر تخلص، خلف حضرت سید شاہ محمد سجاد بڑے مشہور عالم تھے۔ دانا پور آپ کا مسکن تھا، اور یہاں کی خانقاہ کے آپ سجادہ نشیں تھے۔

آپ کی اردو شاعری مستند تھی۔ مولانا وحید الہ آبادی سے آپ کو تلمذ تھا۔ اکبرؔ دانا پوری کے حالات اور شاعری پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے اشعار میں قدیم طرز تحریر موجود ہے۔ نون غنہ کے بجائے پورے نون کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو موجودہ حالت میں متروک ہو چکا ہے۔ ان کے اشعار کا مزید نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تا کہ ان کی شاعری کا رنگ سامنے آسکے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

زلف عنبر بو سر رخسار رہنے دیجئے
اتحاد کافر و دیندار رہنے دیجئے

رات اب تھوڑی سی ہے انکار رہنے دیجئے
ہاتھا پائی ہوچکی سرکار رہنے دیجئے

مرہی جاؤں گا اگر اترا محبت کا بخار
حضرت عیسیٰؑ مجھے بیمار رہنے دیجئے

رفتہ رفتہ یہ بھی ہوجائے گا مسجود انام
کعبہ دل مین خیال یار رہنے دیجئے

رات ابھی باقی ہے رخصت آپ ہوتے ہین حضور
صبح تک قسمت مری بیدار رہنے دیجئے

توڑیئے میری طرف کھڑکی نظارے کے لئے
غیر کے گھر کی طرف دیوار رہنے دیجئے

پھر وہی تکرار بے معنی وعذر بے سبب
اب نمانا جائے گا انکار رہنے دیجئے

ڈھل گیا جوبن کہان ہے وہ جوانی کی بہار
اب عنایت کی نظر اے یار رہنے دیجئے

آئے دن کا معرکہ اور روز قتل عام ہے
جان نثاری کے لئے دوچار رہنے دیجئے

قابل فتراک ہم جانبازون کے سر مین حضور
ٹھوکرون ہی میں سر اغیار رہنے دیجئے

آپ کو دیکھا بہت کچھ بڑھ گئی تکلیف نزع
زہر ہے اب شربت دیدار رہنے دیجئے

اب مدینے سے نکلنے کا نہوا اکبرؔ کو حکم
اپنے در پر یاشہؐ ابرار رہنے دیجئے

(۵)

صبح وصل آنکھوں سے وہ ماہ نہان ہوتا ہے
روز روشن کو شب تار جہان ہوتا ہے

دیکھنا رخ کو تہ زلف گران ہوتا ہے
ناگوار آنکھون کو بے شبہ دھوان ہوتا ہے

دو مجھے شانہ کہ آراستہ کردون زلفین
الجھے بالون سے تمہارے خفقان ہوتا ہے

پھوٹ نکلی ترے کرتے سے بدن کی رنگت
رنگ مے بھی کہین شیشے مین نہان ہوتا ہے

آج کل ضعف نے اس درجہ ترقی کی ہے
سانس لینا بھی ہمین ابتو گران ہوتا ہے

نہین ملتی مجھے جس روز شراب اے ساقی
میہمان گھر مرے اس دن رمضان ہوتا ہے

ابتو قصر کہن چرخ کی اصلا نہین خیر
آج سیلاب ان آنکھون کا روان ہوتا ہے

پوچھتا ہے کوئی عاشق سے جو آرام کا حال
ہو کے حیران وہ کہتے ہین کہان ہوتا ہے

اس طرف وصل کی شب ہوتی ہے رخصت اکبرؔ
اس طرف قافلہ عمر روان ہوتا ہے **(۶)**

وہی عشق مین نیک انجام ہے جسے رنج مین لطف آرام ہے
اٹھا کر تعین کے پردے کو دیکھ جسے خاص کہتا ہے تو عام ہے
زمین پر محمدؐ فلک پر احد تراہر جگہ اک نیا نام ہے
سفر ہے کسی حج کا یہہ انتقال کفن جس کو کہتے ہین احرام ہے
کہان مین کہان تیرا عشق اے صنم یہ بخشش ہے تیری یہ انعام ہے
ہے تیرا ہی جلوہ سفید وسیاہ توہی ہے سحر اور توہی شام ہے
ہوئے ہم سے آزاد یان آکے صید یہ دام تعین بھی کیا دام ہے
تجھی سے ہے مطلب تجھی سے غرض کسی اور سے مجکو کیا کام ہے
جسے مرگ سمجھے ہوئے ہین عوام یہ معراج عشاق کا نام ہے
سنا تم نے منصورؒ کا حال زار محبت کا اکبرؔ یہ انجام ہے (۷)

کیا جانے کدھر ہم ہین وہ دلدار کہان ہے وہ اکبرؔ خستہ جگر افگار کہان ہے
بتخانہ کسے کہتے ہین کیا چیز ہے کعبہ تسبیح کدھر رہتی ہے زنار کہان ہے
کس طرح سے آنا ہوا میخانہ مین اے شیخ جبہ ہے کہان آپ کی دستار کہان ہے
جاتے تو ہین پر دیکھئے کیونکر ہین پہنچتے معلوم نہین کوچہ دلدار کہان ہے
اللہ رے اس امت مرحوم کے رتبے خود عفو ہے جو یان کہ گنہگار کہان ہے
اک آن مین پامال خزان ہوگیا گلشن وہ گل ہین کدھر آج وہ گلزار کہان ہے
جز تیرے کسی کی ہمین اے دوست خبر کیا کیا جانین کدھر غیر گئے یار کہان ہے
کہتے ہین کسے آئینہ کیا چیز ہے شانہ دلدار کہان طرۂ دلدار کہان ہے
پیدا ہوا جو سچی طلب انسان کو اکبرؔ
مطلوب کہے میرا طلبگار کہان ہے (۸)

(۳)

شاہ محمد قائم قتیلؔ داناپوری

شاہ محمد قائم نام۔ شاہ ٹولی داناپور سے تعلق رکھتے تھے۔ آستانہ چشتیہ نظامیہ محلہ شاہ ٹولی داناپور کے سجادہ نشیں تھے۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ اشعار کا مجموعہ تجلیات قتیلؔ ہے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ قتیل تخلص کرتے تھے۔ بدر آروی کہ شاگرد تھے۔ مستند شاعر تھے۔ قتیلؔ داناپوری کے حالات اوران کی شاعری پر بحث کی جاچکی ہے۔ کچھ نمونہ کلام بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ مزید کلام کا نمونہ کیا جارہا ہے۔ تا کہ ان کی شاعری کا رنگ وآہنگ سامنے آسکے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

پہلو میں یار، ہاتھ میں ساغر شراب کا — میرا مکاں برج ہے ، دو آفتاب کا
ساغر میں عکس ہے، رخ طلعت مآب کا — آج آفتاب برج ہے، خود آفتاب کا
صحن فلک ہے یا کوئی رندوں کی انجمن — گردش میں رات دن ہے، قدح آفتاب کا
اک جام میں امنگ جوانیکی آگئی — میرا شباب بھی ہے، شباب آفتاب کا
بہزاد کھینچ دے رخ محبوب کی شبیہہ — رکھ لوں بیاض دل میں ورق آفتاب کا
رندوں کے دم سے روشنی بزم دہر ہے — ہوتا ہے میکدے سے طلوع آفتاب کا
کیوں ہو زمین اس کی نہ ہمدوش آسماں — جلوہ ہر ایک شعر میں ہے آفتاب کا
ہے عکس ہر دو عارض پر نور جام میں — ایک آفتاب برج ہے دو آفتاب کا
ہے لطف مئے فروغ جوانی تک اے قتیلؔ — ڈھلتا ہے دوپہر سے شباب آفتاب کا

(۹)

تازہ ہے رنگ مصحف رخ پر شباب کا — میلا ہوا نہ ایک ورق بھی کتاب کا
کیا حل ہو عقدہ خال رخ بے نقاب کا — مطلب ہے ایک نقطہ میں پوری کتاب کا
جاتے ہی اس کے میں بھی ہوا سرد آرزو — میرا شباب عکس تھا دل کے شباب کا
خط سے کچھ اور مصحف رخ دل ربا ہوا — جدول سے حسن اور بڑھا اس کتاب کا
کل منزلیں جو ختم ہوئیں اپنی عمر کی — مضمون صاف ہوگیا، خود انقلاب کا
موج نسیم آہ نے مجھ کو ڈبو دیا — عالم تھا میرے شیشہ دل میں حباب کا

جس نے اٹھایا سروہ غریق فنا ہوا   بن بن کے ٹوٹ جاتا ہے کاسہ حباب کا
میری فنا ہی اصل میں معراج ہے مری   میں اشک اوفتادہ ہوں چشم حباب کا
بحر جہاں میں گرتے ہیں مغرور، منہ کی بل   سیدھا نہ ہو سکا کبھی کاسہ حباب کا
مٹ جائیں گے وہ جن کے سروں میں ہے باد کبر   موج ہوا سبب ہے شکست حباب کا
کھلتا ہے ایک گھونٹ میں دروازۂ بہشت   ساغر مرا ہے نقش مجسم ثواب کا
ضرب تبر ہے عجز بھی، حق میں غرور کے   موجوں نے بڑھ کے کاٹ لیا سر حباب کا
میں ہوں عبیر عارض شمس و قمر قتیلؔ
یعنی غبار خاک در بوترابؓ کا (۱۰)

غم تھا، نہ عشق زلف میں دل کو ملال تھا
لیکن یہ تھا ضرور کہ شیشے میں بال تھا
حل ہو سکا نہ خط سے بھی راز کتاب عشق
کل داستاں میں عقدۂ سربستہ خال تھا
ثابت رہا نہ موج حوادث میں کوئی سر
دامن میں ہر حباب کے سنگ ملال تھا
دیکھا نہ مڑ کے بھی ترے طالب نے سوئے طور
وہ تھا ، ترا خیال تھا ، تیرا جمال تھا
خال سیہ پہ ان کے جو کل بحث چھڑی
کیا کیا نہ اس میں نکتہ ، دم قیل وقال تھا
دارا کی داستاں کہ سکندر کا ماجرا
انجام ہر کمال کا آخر زوال تھا
مرلے ذرا قتیلؔ حزیں، خاک دانا پور
پچھتاؤ گے کہ ہاں کوئی اہل کمال تھا (۱۱)

(۴)

مولانا سید عبدالحکیم ارمانؔ

سید محمد عبدالحکیم نام۔ ابونعیم کنیت۔ ارمانؔ تخلص، مولد موضع بانس گھاٹ ضلع چمپارن۔ مسکن بتیا، ضلع مغربی چمپارن تھا۔ جناب ارمانؔ کو ایام طالب علمی ہی سے شعر وسخن سے دلچسپی رہی ہے۔ لسان العصر حضرت نوحؔ ناروی کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ مولانا نے اہل چمپارن میں شعر وسخن کی جو لہر دہرائی وہ آج تک یادگار ہے۔ ارمانؔ پر داغ کا رنگ نمایاں ہے۔ ارمانؔ کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ ساتھ ہی کچھ نمونہ کلام بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان کے کلام کا مزید نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

جس دن سے میں اس بت کا پرستار ہوا ہوں — عالم کی ہر اک چیز سے بیزار ہوا ہوں
پھر جلوۂ مستانہ سے بدمست بنا جا — موسیٰ کی طرح طالب دیدار ہوا ہوں
اے زاہدو،! ہو باغ جہاں تم کو مبارک — میں کوچہ جاناں کا طلب گار ہوا ہوں
کیوں جذبۂ دل شوق سے لبریز نہ ہوگا — جب عرصۂ الفت کا میں رہوار ہوا ہوں
آکر ذرا تسکین دے اے رشک مسیحا — صدمے سے تری ہجر کے، بیمار ہوا ہوں
اب بادۂ گلفام کی حاجت نہیں ساقی — جب چشم سیہ مست کا سرشار ہوا ہوں
جب حسن کی جاگیر طلب میں نے کی ان سے — جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں زمیں دار ہوا ہوں؟
غیروں سے نہ پوچھیں مرے آلام کا قصہ — رسوائے جہاں میں بھی تو سرکار ہوا ہوں
تیر نگہہ سے مجھ پہ بھی احسان کیجئے — میں بھی حریص لذت آزار ہوا ہوں

کوثر کی تمنا نہیں ارماںؔ مرے دل میں
میں بادۂ الفت کا جو میخوار ہوا ہوں (۱۲)

نشاط وعیش کیا حاصل ہمیں یوں زندگانی میں : وہ فتنہ تھا لڑکپن میں قیامت ہے جوانی میں
خزاں کا ذکر اہل آرزو مطلق نہیں کرتے : کھلے ہیں پھول جب سے آپ کے باغ جوانی میں
بیان شوق کو میں مختصر کردوں کہاں ممکن؟ : ہزاروں داستانیں ہیں میری اک اک کہانی میں

جناب خضر ہم کو چشمہ حیواں سے کیا مطلب : فقط دھوکے ہی دھوکے ہیں سراب زندگانی میں
جو آہ پر اثر کھینچوں کسی دن سطح دریا پر : یقیں یہ ہے مجھے لگ جائے فوراً آگ پانی میں
نشاط وعیش کے نغمے مبارک ہوں زمانے کو : یہاں تو عمر گذری ہے ہماری نوحہ خوانی میں
محبت نے ہزاروں داغ ناکامی دیئے مجھ کو : یہی سکہ ہے رائج کیا تمہاری حکمرانی میں
شرارے بھی نکلتے ہیں میری آنکھوں سے آنسو بھی : کرامت عشق کی دیکھو چھپی ہے آگ پانی میں
یہ دنیا بھر کی حیرانی یہ روزی کی پریشانی : مزہ ارمان کیا آئے ہماری شعرخوانی میں
(۱۳)

اے شیخ! تمہارے قدموں پر ایمان کو قرباں کیا کرتے
تم قائل بت تو خود ہی تھے کافر کو مسلماں کیا کرتے
اس حسن تبسم کے صدقے صد غیرت لالہ جس نے کیا
شادابی زخم دل جو ہوئی ہم لیکے نمکداں کیا کرتے
وہ ظلم وستم کرتے ہی رہے ہم ظلم وستم سہتے رہے
تھی لاج محبت کی رکھنی ہم شکوۂ جاناں کیا کرتے
پیغام تمنا کہنے کو تاثیر فغاں ہی کافی تھی
ہم غیر کا احساں کیوں لیتے ہم مرغ سلیماں کیا کرتے
ہنستے ہیں میرے وہ رونے پر روداد الم سنتے ہی نہیں
پھر آمد وشہ کا میرے گھر وہ عہد وپیاں کیا کرتے
مقتل میں جو آنکھیں گرم ہوئیں عشاق تڑپ کر سرد ہوئے
تھی قتل کو کافی تیغ نگہہ شمشیر وہ عریاں کیا کرتے
اعدا نے ہزاروں کوشش کی کہ گوئے محبت لے جائی
ہم عشق میں عالم فاضل تھے وہ طفل دبستاں کیا کرتے
کیوں جان نہ اس کو دے دیتے احباب ذرا یہ غور کریں
دل دے کے جو ارماں درد لیا اس درد کا درماں کیا کرتے (۱۴)

(۵)
مولانا مصطفی رضا شبنم کمالی

مصطفی رضا نام شبنم تخلص، پوکھریرا ضلع سیتامڑھی ان کا مولد و مسکن تھا۔ شاعری میں ان کا کوئی استاد نہیں۔ شبنم کمالی اپنے نعتیہ کلام کی وجہ سے کافی مشہور و معروف تھے۔

''صنف نعت کے علاوہ شبنم غزل کے اچھے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے دو مجموعہ ''نوائے دل'' اور ''تنویر خیال'' کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو کی کلاسیکی روایات پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے حالات اور ان کے شاعری پر گذشتہ باب میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ ساتھ ہی کچھ نمونہ کلام بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔

مزید نمونہ کلا پیش ہیں ے

رہ عشق کے مسافر ذرا چل سنبھل سنبھل کے — وہ اٹھا نہ اٹھ سکے گا جو گرا کبھی پھسل کے
میں ہوں آشنائے منزل مجھے کیا فریب دیگی — وہ چھپی نہ چھپ سکے گی کبھی بھیس کو بدل کے
جو جگر میں درد اٹھا بڑھا اضطراب حد سے — وہ ٹپک پڑا زمیں پر مرے آنسوؤں میں ڈھل کے
اے بہار زندگانی جو ملے ہوا تمہاری — رہے دور مجھ سے کوسوں مری موت ہاتھ مل کے
ہے مری ہی کم نگاہی کہ اسے نہ دیکھ پایا — مرے گلشن محبت میں بڑھا جو پھول پھل کے
وہ جو سر پہ ہاتھ رکھ دیں بہ ادائے دل نوازی — بھلا کیوں نہ خواب دیکھوں میں زمین پر محل کے
کوئی کیا ادا کرے گا ترے آنسوؤں کی قیمت — غم ہجر میں جو جو شبنم تری چشم نم سے چھلکے :(۱۵)

زندگی میں نہ ملا جب کبھی آرام مجھے — کس لئے عیش کا دیتے ہیں وہ الزام مجھے
میری رسوائی سے ہوتی ہے تری بھی توہین — دربدر یوں نہ پھرا حسرت ناکام مجھے
مجھ سے بڑھ کر تو نہیں کوئی شناسا اس کا — کیوں بھلائے گی بھلا یورش آلام مجھے
میرے ہونٹوں کی ہنسی تو نے چرالی جب سے — لوگ کہتے ہیں ترا بندۂ بے دام مجھے
میری آنکھوں کو تو رونا ہے ازل سے مقدور — کوئی کب دے گا محبت بھرا پیغام مجھے
آتش حسن کو شعلوں میں گھرا رہنے دے — خاک ہونے پہ ہی شاید ملے آرام مجھے

فکر ہے رونق گلشن کی ہمیشہ ورنہ
خوب معلوم ہے شبنمؔ مرا انجام مجھے (۱۶)

زباں سے نام محبت نہ بھول کر لینا — یہی ہے میری گذارش قبول کر لینا
شب وصال کے لمحوں کو طول کر لینا — غم فراق کی اجرت وصول کر لینا
تم اپنی کوششِ پیہم کو رنگ و بو دے کر — جو چاہو راہوں کے کانٹوں کو پھول کر لینا
یہ دور ظلم یہ فتنہ یہ قتل کی سازش — خدا کے واسطے یاد رسول کر لینا
اگیں گے پھول پہاڑوں کی ہر بلندی پر — وہاں بھی جمع فضاؤں کی دھول کر لینا
مری حیات کا قصہ ہے مختصر شبنمؔ — ادب شناس ہو تم کو طول کر لینا
(۱۷)

آگ میں قہر کی ہر سانس میں جلنا ہوگا — ورنہ ہر پھول کو گلشن سے نکلنا ہوگا
اجنبی راہ سہی دوڑ کے چلنا ہوگا — وقت کے سانچے میں ہر شخص کو ڈھلنا ہوگا
تم کو اس شہر میں جینا ہے تو جینے کے لئے — روپ کو چھوڑ کے بہروپ بدلنا ہوگا
ایک عرصہ ہوا احساس کا سورج ڈوبے — اب تو ہر زہر اندھیروں کا نگلنا ہوگا
قصر شاہی کے گلوں کی رہے رونق شبنمؔ
چشم مجبور میں اشکوں کو مچلنا ہوگا (۱۸)

(۶)

مولانا وارث ریاضی

وارث حسن نام، قلمی نام وارث ریاضی، وارثؔ تخلص۔ مولد سکٹا ضلع مغربی چمپارن ہے۔ زمانہ تعلیم علمی سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مولانا سید نظام الدین، مولانا قمر عثمانی دیو بندی، الم مظفر نگری اور ماہر القادری سے مشورۂ سخن لے کر اپنی شاعری میں خود اعتمادی پیدا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور علامہ ناوک حمزہ پوری نے بھی ان کی تربیت کی۔ ان کی مختصر سوانح اور کچھ اشعار پیش کئے جا چکے ہیں۔ اشعار کے مزید نمونے پیش کئے

جا رہے ہیں تا کہ ان کے شاعری کا رنگ نمایاں طور پر سامنے آسکے۔

اگر جوش جنوں کم، جہد پیہم غیر محکم ہے — تو پھر جینا جہان آرزو میں ننگ آدم ہے
مٹیں گی کب مہہ و خورشید سے تاریکیاں یک سر؟ — چراغ دل کرو روشن جہاں میں روشنی کم ہے
لگا رکھا ہے سینے سے متاع درد الفت کو — مجھے محبوب ہر شے سے جہاں میں لذت غم ہے
خدا جانے نظام دہر کیوں ہونے لگا درہم؟ — پریشاں گیسوے پرخم نہ چشم یار برہم ہے
قفس میں بھی ہے امید بہار گلستاں مجھ کو — نہیں جو طاقت پرواز، نالوں میں تو کچھ دم ہے
اسے بے تاب رکھتی ہے تمنا اس کے اڑنے کی — گماں یہ ہے کہ تاب مہر سے پرواز شبنم ہے
جو ہے شوق جہاں بینی تو دیکھ آئینہ دل میں — کہ جس کا دل ہے روشن بے نیاز ساغر جم ہے
نہ سمجھو مستقر اپنا کبھی دنیاے فانی کو — کہ دنیا تو فقط اک سیرگاہ ابن آدم ہے
تری دنیا بھی جنت سے نہیں کچھ کم حسیں یارب — کہ جس میں تاابد جینے کی حسرت بھی بہت کم ہے
انہیں کی یاد سے آباد ہے دنیاے دل وارثؔ — کہ جن کی ذات دنیا کے لئے خیر مجسمؐ ہے

(۱۹)

کبھی نزدیک رہتا ہے، کبھی وہ دور رہتا ہے — وہ اپنی فطرت سیماب سے مجبور رہتا ہے
وہ جلوے جو فریب آگہی دیتے ہیں نظروں کو — انہیں جلوؤں کی تابانی سے دل پرنور رہتا ہے
سنا ہے جب سے میں نے وادی ایمن کا افسانہ — تجلی ریز دل میں مثل شعلہ طور رہتا ہے
نگاہ عشق سے وہ حسن پنہاں چھپ نہیں سکتا — اگرچہ نکہت گل کی طرح مستور رہتا ہے
سمجھتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور دنیا میں — وہی انسان ہر اک گام پر مجبور رہتا ہے
نہ جانے کون ہے وہ بے نیاز جام و مے خانہ — کہ جو پیتا نہیں، آٹھوں پہر مخمور رہتا ہے
جمال علم و دانش ہے کمال خاکساری ہے — وہ عالم کیا جو اپنے علم پر مغرور رہتا ہے
عبث ہے ماہ سیماؤں سے امید وفا رکھنا — کہ ان کی مملکت میں جور کا دستور رہتا ہے
خدا کا شکر ہے کہ بادۂ اسرار الفت سے — مرا پیمانہ شعروسخن معمور رہتا ہے
یہ وارثؔ بھی پرستار جمال یار ہے لیکن — وصال و ہجر کے جھگڑوں سے کوسوں دور رہتا ہے

(۲۰)

اٹھایا ہے خوشی سے عشق کا بار گراں میں نے
محبت میں نہیں سوچا کبھی سود وزیاں میں نے
تری بخشی ہوئی حکمت کا یہ اعجاز ہے یارب!
کہ آسانی سے کی سیر فراز کہکشاں میں نے
دیا ہے درس علم و آگہی کا نوع انساں کو
کئے ہیں منکشف اسرار بزم دو جہاں میں نے
مری تسبیح کے دانے ہیں زناروں سے پیوستہ
جبین کفر پر دیکھا ہے سجدوں کا نشاں میں نے
جنوں کو آگہی دی، عقل کو وارفتگی بخشی
محبت کو عطا کردی حیات جاوداں میں نے
سبق دے کر چمن والوں کو کانٹوں سے محبت کا
بدل ڈالا ہے فرسودہ نظام گلستاں میں نے
رہ پر خار میں خاروں سے انداز وفا سیکھا
چمن کے زرد پتوں سے لیا طرز فغاں میں نے
مساوات واخوت اور یک جہتی کے نغموں سے
بنایا سرزمین ہند کو رشک جناں میں نے
الٰہی! کس طرح میں ناصح مشفق کو سمجھاؤں؟
بہت کچھ کھو کے حاصل کی ہیں یہ رسوائیاں میں نے
گریں گی بجلیاں میرے نشیمن پر، اسی ڈر سے
اجاڑا ہے ہزاروں بار اپنا آشیاں میں نے
وہ تھی قلب پریشاں میں دھڑکنے کی صدا وارثؔ
جسے سمجھا تھا آواز رحیل کارواں میں نے (۲۱)

ہجر کی زلف سیہہ فام سے ڈر لگتا ہے
وعدۂ وصل کے انجام سے ڈر لگتا ہے
خوگر شیوۂ تسلیم و رضا ہوں لیکن
حسن خود کام کے انجام سے ڈر لگتا ہے
سوز حکمت سے کرو علم کی مشعل روشن
جہل کی ظلمت اوہام سے ڈر لگتا ہے
تلخی گردش حالات سے ڈرنے والو!
مجھ کو عشرت گہہ ایام سے ڈر لگتا ہے
حضرت رومی واقبال کو پڑھ کر حافظ!
آپ کے بادۂ گل فام سے ڈر لگتا ہے
وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم بھی ہی حسین ابن علیؓ
جن کو باطل کے در وبام سے ڈر لگتا ہے
گلشن دہر نہ ہوجائے جہنم یارب!
حکمت مغرب خود کام سے ڈر لگتا ہے
ساری دنیا ہے خراب مئے گل فام فرنگ
بش کو بے کیفی صدام سے ڈلگتا ہے
پاسباں دشمن ایماں ہے خدا خانے کا
شیخ کو سطوت اسلام سے ڈر لگتا ہے
جن کی شہرت کا سہارا ہے مری رسوائی
ان کو بھی وارثؔ بدنام سے ڈر لگتا ہے (۲۲)

گریہ شبنم، گلوں کی چاک دامانی کی بات — کس نے سمجھا نکہت گل کی پریشانی کی بات
علم سے نا آشنا، عقل و ہنر سے بے خبر — میں نہیں کرتا کسی سے بھی ہمہ دانی کی بات
عنصری و فرخی، بوالفضل و فیضی کی طرح — میں نے کب کی ہے امیروں کی ثناخوانی کی بات
شکوۂ جور و جفا بے سود ہے ان کے حضور — ذکر اخلاص و وفات ہے جہل و نادانی کی بات
محفل زاغ و زغن میں نغمہ دل کش عبث — ان کی بزم ناز میں ایثار و قربانی کی بات
جن کا مسلک ہے تعصب، جن کی خو جور و جفا — وہ بھی کرتے ہیں فلاح نوع انسانی کی بات
جب سے بدلا ہے زمانے کا نظام اقتدار — راہزن کرتے ہیں منزل کی نگہبانی کی بات
کس قدر پر کیف ہے ان کی اداؤں کا فریب — ہائے رے قصر سیاست میں زرافشانی کی بات

ظلم پر لطف و کرم فریاد پر قہر و عتاب
ساری دنیا کے لئے وارثؔ ہے حیرانی کی بات (۲۳)

(۷)
مولانا سید محمد شمیم شمیمؔ چھپروی

سید محمد شمیم نام، شمیمؔ تخلص میر محمد حسن حسنؔ کے فرزند اکبر۔ مولد و مسکن کھجوہ ضلع سیوان۔ ولادت ۲۰؍ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ/ ۲۲؍جنوری ۱۸۴۳ء۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دار العلوم لکھنؤ بھیجے گئے۔ اتمام تعلیم کے بعد مکان واپس ہوئے۔ علمی صلاحیت میں منتخب روزگار تھے۔ ۶۴ سال کی عمر میں ۲۸؍ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ/ ۱۷؍ستمبر ۱۸۷۴ء کو کھجوہ ہی میں انتقال فرمایا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

شعر و سخن سے گہری مناسبت تھی۔ مرزا دبیرؔ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شرف تلمذ کیا۔ اعلیٰ علمی صلاحیت ان کے کلام سے بھی آشکارا تھی۔ شوکت الفاظ طرز ادا کی شان اور دبدبہ علم وفن وہ خصوصیات ہیں جن کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ بقول صاحب دبستان دبیر کے والد کے مزاج کی سادگی ان کے کلام سے بھی آشکارا تھی اور اس کے برعکس ان کے کلام میں شوکت الفاظ، بلند آہنگی، مضمون آفرینی اور صناع کی کثرت تھی۔''

تقریباً تمام اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی مگر مرثیہ نگاری میں جو طرہ امتیاز حاصل کیا وہ کسی اور صنف شاعری میں نہیں۔ان کا آبائی مکان جس میں سارا سامان محفوظ تھا ان کے انتقال کے بعد مسمار ہو گیا۔اوراسی کے ساتھ ان کا اوران کے والد کا سارا کلام تلف ہو گیا۔(۲۴)

مرثیہ کے چند بند ملاحظہ فرمائیے ؎

وہ تہلکہ تھا ہر طرف اس دم کہ الاماں ششدر تھا ہر فرشتہ نہ تھا قصر آسماں
الحافظ کا ورد عطارد کو ہرزماں تھا حشرنشر کا ملک الموت کو گماں
نالاں فساد فتنہ دل کفر شق ہوا
خوش دل شہہ رسل ہوا خوشنود حق ہوا

گرمی سے اس کے سرد ہوئی گرمی اجل آئی یہ جس پرے پہ گرا جلد سر کے بل
لپکی چمک چمک کے جو ہر سو یہ برمحل پسپا ہوئے عرب کے جری اور عجم کے بل
بولی سپاہ حملہ حیدر دکھایئے
کیا حیدری حسام کے جو ہر دکھایئے

دل دوعدد کا اور ہوس ملک ومال دو کاسہ سر سوار کا دو اور ڈھال دو
ہر مہر واسم وسکہ وسرکوہ دلال دو مہرومہہ وسماو سمک ماہ وسال دو
رہو اردو ادھرہوا اسوار ادھر ہوا
اور اس کا ہم کمال حسام دوسر ہوا

سراپا کی مثال دیکھئے ؎

بینی الف ہے لام ہے زلف صبا نہاد میم دہن کے میم سے حاصل ہراک مراد
کہتے ہیں صادچشم کوارباب انتقاد تفسیر ہے انہیں کی الف لام میم صاد
اس رخ کی ملہ ح کیوں نہ ہمیشہ زباں کرے
جس رخ کی آپ صاد خدادوجہاں کرے

بتیس ہیں شمار میں یہ دربے مثال اور چاند کوعلیؑ کے بھی بتیسواں ہے سال
لڑتا ہے سلک گوہر دنداں سے یہ خیال ناڑہ پہ ان کے سال گرہ کا ہے احتمال

تعداد حق نے سال گرہ کی دکھائی ہے
ہر اک گرہ گہر سے برابر لگائی ہے
حیرت فضا ہے ناف ضیابا کی مثال خورشید گر کہوں تو یہ ہے عقل کا زوال
کیوں کر قمر کے قرب سے ہوتا ہے یہ خیال نقاش پر کھلا جو نہ ان کی کمر کا حال
دست ہنر میں کلک رقم لے کے رہ گیا
لوح قلم پہ نقطۂ شک دے کے رہ گیا (۲۵)

(۸)

مولانا سید شاہ نظیر حسن نظیرؔ داناپوری

سید شاہ نظیر حسن نام، نظیرؔ تخلص، ۱۲۷۸ھ میں اپنی نانہال داناپور ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے ماموں حضرت سید شاہ محمد سجاد ابوالعلائی کے مرید ہوئے۔ آپ جید عالم تھے۔ اپنے گھر میں دینیات کا ایک بڑا مدرسہ حنفیہ نعمانیہ کے نام سے قائم کیا۔ زندگی بھر اس میں درس دیتے رہے۔ نہایت خلیق و منکسر المزاج تھے۔ شاعری سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حمد و نعت زیادہ کہتے تھے۔ ۱۵؍ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

سمجھ میں جب بہ نعت پاک ختم الانبیاء آئے تو پھر کیونکر کسی کی عقل میں حمد خدا آئے
نظیرؔ اس کو یقیں کر جب ملائک اس میں حیراں ہیں سمجھ میں نعت احمد پتلۂ خاکی کے کیا آئے

دکھائی اک جہاں کو جس نے راہ اہتدا تم ہو ترائی جس نے کشتی قوم کی وہ ناخدا تم ہو
مسیح ناصری آئے تمہاری دینے خوش خبری جو روح صدق ہے انجیل میں وہ رہنما تم ہو
نہیں تاریخ کے صفحے پر ایسی کوئی شخصیت نمونہ جس کی سیرت آج ہے وہ مقتدا تم ہو

ہاتھ سے ہرگز شراب عشق کا ساغر نہ چھوڑ بادہ حب رسول کبریا دم بھر نہ چھوڑ
ایک لحظہ بھی نہیں اس زندگی کا اعتبار جام عشق مصطفی اے تشنہ لب دم بھر نہ چھوڑ

گرمی محشر میں پینا ہے اگ جام طہور — یاد چشم نرگین سقی کوثر نہ چھوڑ
دل سے رہ شیدائے نام پاک بوبکرؓ وعمرؓ — درگہہ عثمانؓ اور خاک درحید رنہ چھوڑ
دوجہاں کے غم سے چھٹنا چاہتا ہے گر نظیرؔ — دامن پاک حبیب خالق اکبر نہ چھوڑ

(۲۶)

(۹)

مولانا سید عبدالحئی ذبیح دربھنگوی

سید عبدالحئی نام، ذبیح تخلص، مولوی سید بخش کے صاحبزادے۔ مولد ومسکن محلہ میر منجن دربھنگہ۔ جناب ذبیح علم صرف نحو، فقہ وفرائض میں بڑا ذوق رکھتے تھے۔ انہیں مناسخہ نویسی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ بقول صاحب آئینہ ترہت مزاج میں سادگی بدرجہ اتم موجود تھی۔ تصنع نام کو کبھی نہ تھا۔ حضرت ذبیح کو بھی جناب مرشد حسن کامل دھرم پوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اور تاحیات دبستان کامل سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ایک دیوان قلمی موجود تھا۔ لیکن ضائع ہوگیا۔

اپنے صاحبزادے مولوی عبدالودود بسملؔ کے دیوان کی اشاعت ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں کی، اسکے دوتین سال بعد تقریباً ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء میں انتقال فرمایا۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

کہوں کیا حال سوز چشم تر کا — ہراک آنسوں میں ہے عالم شرر کا
جلائے پر نہ مرغ نامہ بر کا — کہ مضموں خط میں ہے سوز جگر کا
ہوا طوفاں بپابحر غزل کا — لکھا مضموں جو ہم نے چشم تر کا
چھٹا ہاتھوں سے دامان شب وصل — گریباں چاک جب دیکھا سحر کا
گھٹا یہ چاند پر سے ٹل گئی ہے — کہ گیسو عارض انور سے سرکا

تمہیں سب باغ خوبی کا گل رعنا سمجھتے ہیں — تمہارے عاشقوں کے بلبل شیدا سمجھتے ہیں
تمہارے بام کو گر آسماں سمجھیں تو زیبا ہے — تمہیں جب دیکھتے ہیں چاند کا ٹکڑا سمجھتے ہیں

خوشی سے غم غلط ہوتا ہے جب آنے کو کہتے ہیں　　تمہارے جھوٹے وادے کو بھی ہم سچا سمجھتے ہیں
جفائیں کرتے ہو ہم پر مگر پیارے ہو نظروں میں　　بتو اتم کو برائی پر بھی ہم اچھا سمجھتے ہیں
ادا سے دیکھ کر منھ وہ چھپاتے ہیں ذبیح اپنا
ہمیں جس دن سے شیدائے رخ زیبا سمجھتے ہیں

شب غم میں ترے کب جان مضطر تا سحر ٹھہرے　　اگر ٹھہرے تو ٹھہرے کوئی دم' کوئی پہر ٹھہرے
مرے پہلو میں دم بھر تو اگر اے سیمبر ٹھہرے　　ابھی دل کو قرار آئے ابھی اپنا جگر ٹھہرے
خدا چاہے تو وہ دن بھی دکھائے آسماں مجکو　　کہ میرے گھر پہ بھی اک رات آکر وہ قمر ٹھہرے
دم نظارہ ٹھہرائے وہ رعب حسن عارض سے　　کسی کا کب تمہارے روبرو پائے نظر ٹھہرے
جو پیری آئے تو حسن جوانی کیوں نہ گھٹ جائے　　چراغ شام کی کب روشنی وقت سحر ٹھہرے
ابھی آئے' ابھی گھر کو چلے گھبرائے کیوں ایسا　　ہنسے بولے نہ کچھ ہم سے نہ تم دو اک پہر ٹھہرے

زندگی اپنی اسی شغل میں گذرے پیارے　　لب پہ ہو ذکر ترا دل میں تری یاد رہے
کہیں معشوق بھی عاشق کی خبر لیتے ہیں　　ان کو کیا' شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے
(۲۷)

(۱۰)
مولانا عارف حسین عارف صدیقی

مولانا عارف حسین صدیقی نام، عارف تخلص، الحاج شیخ بلاغت حسین صدیقی کے صاحبزادے۔ اپنے نانا قاضی عصمت اللہ سعدی پوری دربھنگوی کے گھر میں ان کی ولادت ہوئی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں حاصل کی۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حضرت مولانا عبد الواسع سعدی پوری سے حاصل ہوئی۔ اور اس کے بعد کان پور تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ فیض عام میں داخل ہو کر حصول علم میں مشغول ہوئے۔ حضرت مولانا فضل رحمانؒ سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی۔ اور پھر رودولی واپس آگئے۔ تعلیمی

سلسلہ شروع کر کے اسے اتمام کو پہنچایا۔ احادیث کی سند حاصل کی۔ کچھ دنوں گنج مراد آباد میں قیام فرمایا۔ ۱۳۱۳ھ میں جب حضرت مولانا فضل رحمان کا وصالی ہوا تو یہ مونگیر تشریف لے آئے۔ حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیر سے تعلیم باطنی حاصل کی۔ علوم ظاہری و باطنی سے مالا مال ہو کر موصوف اپنے وطن ہر سنگھ پور لوٹ آئے۔ دینی وملی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ ساری زندگی مجاہدات میں بسر کی۔۔ حضرت مولانا نے تقریباً ۹۷ سال کی عمر میں ۹؍صفر ۱۳۶۳ھ / ۴؍فروری ۱۹۴۳ء کو جمعہ کے دن انتقال فرمایا۔

حضرت عارفؒ کو شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی۔ شاعری کو انہوں نے ذریعہ عزت نہیں بنایا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اشعار موزوں کر لیا کرلیتے تھے۔ اکثر حمد اور نعت کہا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کہ ان کا کلام محفوظ ہے یا نہیں۔ صرف دو نعتیں دستیاب ہوسکی ہیں وہ پیش ہیں۔

شیدا ہوں ازل سے رخ نیکوئے نبی کا — مکیؐ مدنیؐ ہاشمی، ومطلبی کا
اے بادصبا تو ہی مدینہ میں پہنچ کر — کل حال بیاں کرنا میری مضطربی کا
جز عشق نبی کوئی نہ مونس ہے نہ ہمدم — اظہار کروں کیسے میں درد قلبی کا
میں تشنگی شوق سے اب جاں بہ لب آیا — اے ابر کرم چارہ کر اس تشنہ لبی کا
اپنی کروں اس شاہ سے کس طرح میں نسبت — سگ آپ کا کہہ دوں تو ہے ڈر بے ادبی کا
ہے آپ کا مداح خداوند دو عالم — ہے کون زمانے میں اس عالی حسبی کا

مرنے پہ نکیرین جو پوچھیں گے لحد میں
کہدوں گا میں شیدا ہوں رسولؐ عربی کا

خدایا عطا کر تقائے محمدؐ — دکھا دے رخ پر ضیائے محمدؐ
بڑھے وہ الٰہی دلائے محمدؐ — کہ بھائے نہ دل کو سوائے محمدؐ
نہ ہو چین اک دم مرے دل کو یارب — رہوں میں سدا مبتلائے محمدؐ
کروں سرمہ میں دیدۂ ودل کا اپنے — میسر ہو گر خاک پائے محمدؐ
نہ دوزخ سے مطلب ہے جنت کی خواہش — فقط چاہتا ہوں رضائے محمدؐ
دم واپسیں التجا ہے خدا سے — تر ادھیان دل سے نہ جائے محمدؐ

خدارا مجھے اپنے در پر بلالو — بہت دن سے ہوں لولگائے محمدؐ
سبب کائنات اور اول مشفع — یہ رتبہ ہے کس کا سوائے محمدؐ
اطاعت ہوئی ان کی طاعت خدا کی — رضائے خدا ہے رضائے محمدؐ

نظر کرنہ عارفؔ کے عصیاں پہ یارب
اسے بخش دے تو برائے محمدؐ (۲۸)

(۱۱)

مولانا شاہ احترام الدین شطارؔ منیری

شاہ احترام الدین نام، شطارؔ تخلص، شاہ احتشام الدین حیدر مشرقی منیری کے صاحبزادے تھے۔ پیدائش ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء کو منیر شریف میں ہوئی۔ تعلیم وتربیت والد کی نگرانی میں ہوئی۔ انہیں سے درسیات کی تکمیل بھی کی۔ والد کی صحبت میں شاعری کا شوق ہوا۔ صرف ۲۷/سال کی عمر میں ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوگیا۔ شطارؔ منیری اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے اردو کلام میں پختگی ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ہے مجھ میں جو کچھ یہ حسن ظاہر اسی کا جلوہ چمک رہا ہے
اسی کے جلوہ ہی کی ضیا سے ہر ایک تارا دمک رہا ہے
شجر میں پرتو اسی کا ہر سو قمر میں جلوہ اسی کا ظاہر
تمام آب و ہوا میں ہرجا اسی کا جلوہ جھلک رہا ہے

ہے حسن یار نام خدا سر سے پاؤں تک — گویا ہے عضو ڈھالا ہوا سر سے پاؤں تک
یہ حسن جو نمایاں ہے ہر سو جہان میں — یہ حسن یار کی ضیا سر سے پاؤں تک
شمس وقمر میں نور اگر ہے تو یار کا — یوسفؑ میں حسن یار کا تھا سر سے پاؤں تک
کر حسن ظاہری پہ نہ مایل دلوں کو تو — ہے حسن ظاہری کو فنا سر سے پاؤں تک
آرام چاہتے ہواگر دو جہان میں — ہوجاؤں اس صنم پہ فدا سر سے پاؤں تک
(۲۹)

(۱۲)
مولانا عبدالحلیم ناظمؔ پیغمبر پوری

عبدالحلیم نام، ناظمؔ تخلص۔ مولوی محمد ابراہیم مرحوم کے صاحبزادے مولد و مسکن پیغمبر پور ضلع دربھنگہ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر دارالعلوم احمد یہ سلفیہ لہیر یاسرائے میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں یہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ (یو۔ پی) میں داخلہ لیا۔ وہاں زیادہ دنوں نہیں ٹک سکے۔ اور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی چلے گئے۔ وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے فراغت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہیں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ میں مدرس ہو گئے۔ علمی صلاحیت ٹھوس تھی اس لئے بہت جلد ترقی کر گئے۔ موصوف کچھ دنوں مدرسہ مذکور کے ناظم تعلیمات بھی رہے۔

زندگی نے وفا نہ کی اور بہت ہی کم عمر میں ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئے۔ اور اس طرح یہ تابناک ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ناظمؔ کو شعر و سخن سے گہری مناسبت تھی۔ یہ حیدرؔ دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔ غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں ہی میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ موصوف کا بیشتر کلام ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہو کر داد تحسین وصول کر چکا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

قطرہ قطرہ میں لہو کے درد بے تابی نہاں　　یعنی رگ رگ میں مری پیوست نشتر دیکھئے

خوف ناکامی ارادے کے تزلزل ہی میں ہے　　ہمتیں جب بندھ گئیں پھر دوری منزل نہیں
مجھ سے کہتا ہے فراق دوست میں لطف سکوت　　جس نے کی آہ وفغاں وہ عاشق کامل نہیں

لباس محتسب میں پھر رہا ہے دیکھنا ساقی
چرا کر آنکھ زاہد مل نہ جائے بادہ خواروں میں

یاد کب ہے بیخودی میں کہہ گیا کیا کیا مگر　　تھا تسلسل زلف جاناں کی طرح تقریر میں

میرے بحرِ غم میں بھی پنہاں ہے موجِ انبساط گر رہے ہیں آنسوؤں کے تار ہنستے بولتے

غبار بن کے جو رہتا میں راہ پہ ناظمؔ
ضرور شرف قدمبوسئ حسیں ملتا

ڈرتا ہوں چارۂ سازی ہمدرد سے کہیں تبدیلیاں نہ ہوں جگر داغدار میں
وہ آئے اور مجھ کو خبر تک نہیں ہوئی اس درجہ محویت تھی مجھے انتظار میں
اے شعلہ ہائے شرر بار دیکھنا یہ آگ لگ نہ جائے مرے جسم زار میں
زلف درازوطول شب ہجر کی طرح اک تار بندھ گیا مرے اشکوں کے تار میں
ناظمؔ جو شعر گوئی کی عادت یہی رہی
چمکوگے داغؔ ہو کے کبھی روز گار میں

کیا اختیار اب دل بے اختیار پر بجلی گری ہوئی ہے شکیب وقرار پر
جب سے ہوا ہوں لطف محبت سے آشنا
رعنائی خیال ہے ناظمؔ بہار پر

من گئی جب حسن کی سرکار ہنستے بولتے ہوگئی قسمت مری بیدا ہنستے بولتے
ایک لمحہ کے لئے ہی کاش اٹھ جاتی نقاب کچھ تو ہوتی لذت دیدار ہنستے بولتے
آرزو ہے پھر پھڑک اٹھتا وہی جوش جنون پھر ہمارے آبلوں سے خار ہنستے بولتے
میرے بحرِ غم میں بھی پنہاں ہے موجِ انبساط گر رہے ہیں آنسوؤں کے تار ہنستے بولتے
اضطراب سوز سے مہلت اگر ملتی ہمیں ہم بھی تجھ سے اے خیال یار ہنستے بولتے
نیستی میں دائمی جلوے کی ہے ایسی امید جان دیتے ہیں ترے بیمار ہنستے بولتے
ہستی موہوم میں ہوتا جو کچھ ذوق نمود پھر تو ہم بھی اے دے بیمار ہنستے بولتے

چارہ سازی سے کسی کی اور بڑھتا ہے جنون　　آرہے ہیں کیوں مرے غمخوار ہنستے بولتے
عشق میں ناظمؔ کبھی رہتے ہیں ہم سجہ بدست
ڈال لیتے ہیں کبھی زنار ہنستے بولتے (۳۰)

(۱۳)

مولانا نذر الرحمن حفیظؔ عظیم آبادی

نذر الرحمٰن نام، حفیظؔ تخلص۔ مسکن عظیم آباد پٹنہ، والد کا نام سید تجمل حسین تھا۔ پیدائش ۱۲۷۹ھ میں ہوئی۔ تاریخی نام ''نذر الرحمٰن'' رکھا گیا۔ آپ کے نانا مولانا محمد سعید حسرتؔ نے آپ کی پرورش کی۔ چودہ برس کی عمر میں حافظ ہوئے۔ پھر مولانا قاری عبد الرحمٰن پانی پتی سے علم تجوید حاصل کیا۔ اپنے نانا مولانا محمد سعید سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مولانا محمد کمال سے بخاری شریف اور بیضاوی پڑھی۔ مولانا حکیم علی حیدر فرنگی محلی سے خانقاہ عمادیہ میں مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ اس کے بعد مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادی کی خدمت میں پہنچے۔ اور احادیث کی سند حاصل کی۔

شاعری میں آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں بہتر اشعار کہتے تھے۔ حضرت ازلؔ لکھنوی جب عظیم آباد میں قیام پذیر تھے۔ ان سے شاعری میں اصلاح لیتے رہے۔ ۱۳۱۶ھ میں اپنا دیوان نظم الغریب کے نام سے شائع کیا۔ دوسرا دیوان مرتب تھا، وہ ضائع ہوگیا اور طبع نہ ہوسکا۔

۲۵ رصفر ۱۳۴۳ھ میں وصال ہوگیا۔

نمونہ کلام پیش ہے ؎

باغ جناں کی تھی ہوس اس کی بہار دیکھ کر　　حشر میں ہم مچل گئے جلوۂ یار دیکھ کر
آ گئی یاد شام غم یہ شب تار دیکھ کر　　رودیئے زار زار ہم گنج مزار دیکھ کر
ضبط فغاں نہ ہوسکا نالہ نہ ہم سے جب رکا　　ان کو بھی رحم آ گیا حالت زار دیکھ کر
دن کی نہ کچھ سدہ رہی اور خبر نہ رات کی　　ہائے وہ اپنی بیخودی جلوۂ یار دیکھ کر
درد جگر فزوں ہوا، ضبط کا میرے خوں ہوا　　اور سوا جنوں ہوا جوش بہار دیکھ کر
کیسا گلا، کہاں کا غم، کس کو فراق کا الم　　دل میں ہیں شاد شاد ہم جلوۂ یار دیکھ کر

جاتے ہیں اے حفیظؔ ہم یاں سے اب سوئے عدم　　دیکھیں گے روضہ ارم یاں کی بہار دیکھ کر

اگر لگاتے نہ دل بتوں سے تو کیوں یہ رنج و ملال ہوتا　　نہ ٹھوکریں در بدر کی کھاتے نہ ہائے اپنا یہ حال ہوتا
حسد سے ہوتا جو نفس خالی بشر عدیم المثال ہوتا　　جو عیب جوئی کی خو نہ ہوتی ہر ایک اہل کمال ہوتا
وہ عام جلوۂ اگر دکھاتا تو سالکوں کو بھی جذب آتا　　نہ ذکر ہوتا نہ فکر ہوتی، نہ حال ہوتا، نہ قال ہوتا
حفیظؔ رندی میں ہیں یہ باتیں کہ پی کے کٹتی ہیں ساری راتیں　　کہیں جو تو زاہدوں میں ہوتا بڑا ہی اہل کمال ہوتا

صحرا میں پھرے رسوا بھی ہوئے ناشاد رہے رنجور ہوئے
دل دے کے کسی کو کیا کہئے کس درجہ ہم مجبور ہوئے
آیا ہے سنانے کو قاصد کب مثردہ ان کے آنے کا
روتے روتے فرقت میں جب دیدہ تر بے نور ہوئے
آغاز محبت میں برسوں تک منہ سے ہم نے اف بھی نہ کی
پھر نالے کئے آہیں کھینچیں جب ضبط سے ہم مجبور ہوئے

روؤں میں آہ نارسا کے لئے　　غم کروں جان مبتلا کے لئے
منتخب ہم ہوئے سزا کے لئے　　کیوں یہ کس جرم کس خطا کے لئے؟
طالب دید سے چھپے، کیا خوب!　　سامنے آئے خدا کے لئے
آئی جس دم تمہارے کوچے سے　　میں نے فوراً قدم صبا کے لئے
کچھ نیا جو رہے، نئی ضد ہے　　خون دل چاہئے حنا کے لئے
لے کے دل اک نیا ستم یہ ہے　　ضد ہے اب ترک مدعا کے لئے
لامکاں کی بھی سیر کرتے ہیں　　حد نہیں نالہ رسا کے لئے
کیوں کیا پیارا ہے قصور مرا　　میں نے خود رنج دل لگا کے لئے
منتیں میں صبا کی کرتا ہوں　　نکہت گیسوئے رسا کے لئے
کیا سنا پھر سنو ہمارا حال　　کیا کہا؟ پھر کہو خدا کے لئے
بندگی اور ان بتوں کی حفیظؔ　　قہر ہے بندۂ خدا کے لئے (۳۱)

(۱۴)

مولانا محمد رکن الدین داناؔ سہسرامی

محمد رکن الدین نام، داناؔ تخلص۔ والد کا نام مولوی عبدالحافظ تھا۔ سہسرام ضلع شاہ آباد موجودہ ضلع رہتاس کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ پھر سہسرام کے شاہی مدرسہ خانقاہ میں ہوئی۔ ۱۳۱۸ھ میں ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ وہیں درسیات کی تکمیل کی۔ اور فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں مدرس مقرر ہو گئے۔ انہیں ایام میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ اور طب کے مختلف امتحانات پاس کئے۔ اور سند حاصل کی۔ پھر وطن واپس آئے اور قصبہ بھبھوا ضلع شاہ آباد میں مطب کیا۔ پھر کلکتہ تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد کشن گنج پورنیہ میں مطب کھولا اور طبابت کے سلسلہ میں کشن گنج میں مقیم ہو گئے۔ وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں چہل پہل پیدا کر دی۔ انجمن ترقی اردو قائم کیا۔ مولوی سلیمان وکیل کو انجمن کا سکریٹری بنایا۔ اور مشاعروں کا دور شروع ہوا۔

مولانا شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اور داناؔ تخلص کرتے تھے۔ داناؔ کا ایک سلام جو حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ہے، درج کیا جاتا ہے۔

یارب وہ دل دے جس میں ہو الفت حسین کی : مقصود زندگی ہو محبت حسین کی
یہ آرزو ہے اپنی کہ جب آئے وقت نزع : آنکھیں ہوں میری اور ہو صورت حسین کی
خون امام چوس کے کیا سرخ رو ہوا : شاید دھتی کر بلا کو ضرورت حسین کی
پھولی ہوئی ہے دیکھو شفق آسمان پر : کیا رنگ لا رہی ہے شہادت حسین کی
دیکھا نہ کربلا نے سوائے رضا و صبر : مخفی تھی، مخفی وہ گئی طاقت حسین کی
اب پڑھ رہے ہیں غیر بھی کلمہ امام کا : کیا کام کر گئی ہے شہادت حسین کی
زندوں کی بھی بنی ہے کہیں قبر آج تک : پھر کیا چلے ہو ڈھونڈنے تربت حسین کی
سبط رسول اور تہ تیغ کلمہ گو : اک راز سر مدی ہے شہادت حسین کی
کیا غم ہے کربلا نہ بنا مرقد امام : جب آسمان بن گیا تربت حسین کی
ہے ہے کجا امام، کجا بیعت یزید؟ : لازم تھی خود یزید کو بیعت حسین کی
کیا مل گیا جو خوار کیا اہل بیت کو : گھٹنے سے اور بڑھ گئی شوکت حسین کی

اہل عبا کو تم نے جو لوٹا تو کیا ہو : لٹنے سے کم ہو وہ نہیں دولت حسین کی
میں دیکھتا ہوں داناؔ کہ حضرت ہیں یہ کھڑے : تم کربلا میں ڈھونڈ نا تربت حسین کی

(۳۲)

(۱۵)

مولانا سید محمد عثمان رخشاںؔ ابدالی

سید محمد عثمان نام، ابوالعلوم کنیت اور رخشاں تخلص تھا۔ ابدالی نسبت جو کثرت استعمال سے نام کا جزو ہوگئی ہے۔ سید شاہ محمد عبدالقادرؒ سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور کے چھوٹے فرزند تھے۔ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ تاریخ ولادت ہے۔ قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ کے مدرسہ اسلامیہ سے فراغت حاصل کی۔ رسالہ ندیم اور بہار کے دیگر رسائل فطرتؔ (راجگیر) سہیل (گیا) گنجینہ (پٹنہ) میں آپ کے قابل ذکر مضامین شائع ہوئے۔ معارف (اعظم گڈھ) یادگار (لاہور) اردو، قومی زبان (کراچی) وغیرہ رسائل میں مقالات شائع ہوئے۔ جن میں تحقیقی مقالہ ''اردو نثر کی ارتقامیں ارباب بہار کا حصہ'' ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء اور غالب کی اصلاحیں ''مخزن'' جولائی ۱۹۵۰ء کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے۔ اور بہار کالونی میں اپنا مقام بنایا اور وہیں سکونت پذیر رہے۔ رخشاںؔ شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اور رخشاں تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں جناب عرفانؔ اسلام پوری سے تلمذ حاصل تھا۔ عرفان اسلام پوری صوفیؔ منیری کے شاگرد تھے۔ جنہیں غالبؔ دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ عرفانؔ اسلام پوری کی صحبت نے ان کے شاعری کے ذوق کو بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاعری پر عرفانؔ اسلام پوری کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے

جو دل ہی اس نگہ فتنہ زا سے ساز کرے : تو پھر ہجوم بلا کیوں نہ ترک وتاز کرے
جلائے لب سے، جو خوں چشم فتنہ ساز کرے : وہ کیوں نہ اپنی مسیحادمی پہ ناز کرے
تری نگاہ کرم ہم پہ یوں! جزاک اللہ : خدا نظر کو تری اور دلنواز کرے
ہوئی جو حالت منصور سب پہ ظاہر ہے : سمجھ تو لے مگر انساں نہ کشف راز کرے
جناب شیخ کو ہے فخر وناز، رند کو عجز : اب اس کی دین ہے، جس کو وہ سرفراز کرے

ہے آرزو تو سبھوں کی، ہوں اس کے محرم راز — خوشی یہ یار کی، جس کو شریک راز کرے
اگر ہو صِدق طلب، کیوں ہو شکوۂ نایافت — حقیقتوں کی دلادت تو خود مجاز کرے
ہے اس سے چشم وفا، دل کی سادگی رخشاںؔ — جو اہل حرص و ہوا میں نہ امتیاز کرے

یوسف سے سوا حسن میں زیبا صنم اپنا — قرباں ہے اسی پر یہ دل و جاں، یہ دم اپنا
ہے راہ وہی اور وہی منزل مقصود — ہے آج بھی رہبر، وہی نقش قدم اپنا
کیا خوب، کریں غیر کے طعنہ سے روش ترک — ہر روز بدلتے تو نہیں قبلہ ہم اپنا
اذعان ویقین ہی تو ہے سر مایہ ہمارا — یہ لعل دگہر اپنا، یہ دام ودِرم اپنا
آشفتگی اہل محبت سے تجھے کیا — تو ٹھیک تو کر زلف رسا پیچ وخم اپنا
ہے زیست کا لطف اس سے، نشاط ودل جاں — یہ درد اپنا، یہ رنج اپنا، غم اپنا، الم اپنا
مرنے ہی پہ موقوف حیات ابدی ہے — یوں ہے، بقا خود ہے یہ خواب عدم اپنا
جب جلوہ گہ دوست یہی خانہ دل ہے — یہ کعبہ یہ ہے عرش بریں، یہ حرم اپنا

ان نالہائے نیم شبی میں اثر کہاں — مقبول ومستجاب دعائے سحر کہاں
ہوں ریب وشک تو فکر کے پھر بال وپر کہاں — قلب سلیم جب نہیں، حسن نظر کہاں
پیکِ خیال! قاصد فرخندہ فال بن — دل اب ہو درخور کرم نامہ بر کہاں
اک پیکر جمال کے قدموں سے تھی بہار — جب وہ نہیں تو رونق دیوارودر کہاں
نظارہ سوز حسن وہ، جلوہ وہ برق پاش — مشتاق دیدودل سہی، تاب نظر کہاں
اک قافلہ جو ہے سوئے منزل رواں دواں — پہنچاتی ہے یہ زیر زمیں رہگزر کہاں
اب رک گئی ہے اشک فشانی سے چشم یاس — اب دامن تہی میں وہ لعل وگہر کہاں
مارے ہوئے ہیں جوشب تارفراق کے — ظلمت کدہ میں ان کے نوید سحر کہاں
حالیؔ کی ہے زمیں میں تو رخشاںؔ غزل سرا — لیکن وہ آب ورونق گلہائے تر کہاں

کیا ہوگا فراموش، رہے گا بہ خدا یاد — بھولے سے بھی تو نے تو نہ کی میری وفا یاد

کیا بھول ہے یہ بھول تری، یاد ہے کیا یاد
ہوں وقت کرم سہو، ہوا بہر جفا یاد
او بھولنے والے، تجھے کس طرح بھلا دوں
جب تجھکو بھلا تا ہوں تو آتی ہے سوا یاد
بن جاتی ہے کیا دل پہ یہ للّٰلہ نہ پوچھو
آجاتی ہے جب کو چہ جاناں کی فضا یاد
دنیا کی طلب میں تو بھلا بیٹھے خدا کو
دنیا نے ستایا تو بہت آیا خدا یاد
اب کیف بہاراں کہاں؟ چھوٹے گل وگلزار
اب یاد نشیمن ہے، نہ گلشن کی فضا یاد
یہ سختی ایام توخود ہوش ربا ہے
رخشاںؔ! رہے کیا خاک ملے ہوشربا یاد

کاش یہ دردمحبت رگ جاں تک پہونچے
اس کی معراج ہے، انساں جو بہاتشک پہونچے
شیخ کی طرح نہ ہم دیر گماں تک پہونچے
ہم جو پہونچے تو درپیر مغاں تک پہونچے
سونی سونی ہوئی جاتی ہے دلوں کی دنیا
لوگ گو اُڑتے ہوئے کہکشاں تک پہونچے
اک نہ اک روز یقیں بھی انہیں آجائے گا
شکر ہے وہ مری الفت کے گماں تک پہونچے
ہے صدا دل کی، یہ بے روک پہنچ جاتی ہے
کون جانے کہ یہ آواز کہاں تک پہونچے
دوست کی خاطر نازک کا بھی کچھ پاس رہے
شکوۂ جور نہ انداز فغاں تک پہونچے

جلوۂ طور کی کرتے ہیں تمنا تو کلیم
یہی جلوۂ کہیں خود راہزن ہوش نہ ہو
ضبط وتمکین تو ہے خوب، مگر کون ہے جو
چشم پر کیف تری دیکھ کے مئے نوش نہ ہو
اک تمنا ہی پہ موقوف حیات دل ہے
دل وہ کیا جس میں بھری یہ مئے سرجوش نہ ہو
ضبط یاری نہیں دیتا ہے اب اے بانی جور
کہیں مجبور تکلم، لب خاموش نہ ہو
لختہائے دل خوں کردہ کی کیا کہئے بہار
ساحتِ سینہ مگر وادیٔ گل پوش نہ ہو
درد سے خالی ہے رخشاںؔ! تو ہے کیا قدر اسکی
دل وہ کیا، دردوالم سے جوہم آغوش نہ ہو

کہنے کو وہ نہاں رہے، پھر بھی عیاں رہے
ان کی نشاں دہی کو ہزاروں نشاں رہے
جلوۂ میں تیرے محوجو ہو، پھر کہاں رہے
پیش یقیں مجال کہاں ہے گماں رہے
جب تک چلے زبان ترا ہی بیاں رہے
جب لب کھلے تو اس پہ تری داستاں رہے

پیوستہ چشم تر یونہی آنسو رواں رہے ... اس کی حدیث شوق سے تر یہ زباں رہے
ہو جلوہ گر جو حسن حقیقت بہ صد جمال ... پھر یہ حجاب ہستی وہمی کہاں رہے
کیا خوب ہیں شگفتہ یہ گلہائے داغ دل ... یارب ہرا بھرا یونہی یہ گلستاں رہے
سینہ ہو داغ داغ تمنائے دوست میں ... الفت کی یادگار تو کوئی نشاں رہے
رخشاںؔ! ہے تیرہ زنگ خودی سے یہ آئینہ ... اس میں شبیہ دوست کا پر تو کہاں رہے (۳۳)

(۱۶)

مولانا سید عبدالغفور شررؔ استھانوی

سید عبدالغفور نام اور شرر تخلص، والد کا نام سید ابوالحسن، موضع استھانواں ضلع پٹنہ موجودہ ضلع نالندہ میں ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جب سن شعور کو پہونچے تو آپ کے چچا محترم مولانا حکیم سید ابوالبرکات نے آپ کو اپنے آغوش تربیت میں لیا اور اپنے ساتھ قیامگاہ محلہ خانقاہ میں رکھنے لگے۔ انہوں نے مولانا ابوالبرکات کی صحبت میں رہ کر ابتدائی تعلیم و تربیت پائی۔ اور فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ فارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ کے وسط میں لکھنؤ گئے۔ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تکمیل تعلیم کے لئے داخل ہو گئے۔ اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء کی ملازمت کا سلسلہ قائم ہوا۔ اور مولانا عبدالحئی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ مولانا سید عبدالحئی آپ کے کام سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو مددگار ناظم کا عہدہ بھی عطا فرمایا۔

زمانہ تعلیم ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور حضرت جلیلؔ جانشیں امیرؔ مینائیؒ کے آگے جناب شررؔ نے زانوائے تلمذ تہ کیا۔ مذاق شاعری ۱۹۰۲ء سے شروع ہوا اور برابر قائم رہا اور اپنا تخلص شررؔ تجویز کیا۔ کلام میں برجستگی اور شگفتگی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

یہ کیا غضب کیا، مجھے آفت میں ڈال کے ... ناوک نہ کھینچنا تھا، کلیجا نکال کے
تیور یہ کہہ رہے ہیں فلک پر ہلال کے ... جلوے نہاں ہیں مجھ میں کسی خوشجمال کے
آتی نہیں ہے نیند شب انتظار میں ... کیا اڑ گئی ہے مجکو مصیبت میں ڈال کے

ناوک کی جستجو میں یہ کاوش غضب کی ہے — لیتے ہیں چٹکیاں وہ کلیجا نکال کے
تم دشمن آشنا ہو تو ہم دوست آشنا — تم اس خیال کے ہو تو ہم اس خیال کے
کہتی ہے چشم شوق یہ اٹھ اٹھ کے بار بار — پردے سے لائینگے انہیں باہر نکال کے
کس نے کہا تھا تم کو قیامت بپا کرو — پہلو سے تیر، تیر سے دل کو نکال کے
سب اس نے دل کا کر دیا حال آئینہ شررؔ — آنکھوں سے اشک، اشک سے دریا نکال کے

رہے نہ ہم کسی قابل بھی آپ سے مل کے — کہ آنکھ ملتے ہی دو ٹکڑے ہو گئے دل کے
بھری جو آہ تو جل اٹھے داغ سب دل کے — ہوا سے ہو گئے روشن چراغ محفل کے
بلا کے زہر میں ڈوبے تھے تیر قاتل کے — لگی جو پر کی ہوا ٹکڑے ہو گئے دل کے
مٹے ہوئے بھی یہ نقش قدم غنیمت ہیں — بنائیں گے ہم انہیں کو چراغ منزل کے
الٹ کے رہ گئی دنیائے آرزو میری — ذرا بدل گئے تیور جو چشم قاتل کے
خدا ہی جانے زمانے کا حال کیا ہوگا — بلند نگے جو شعلے مرے بجھے دل کے
پہنچ گیا ہے کہاں سے کہاں فسانہ عشق — سنا ہے طور پر ہوتے تذکرے دل کے
لہو نہیں جو رگوں میں ہو تو شرم آتی ہے — کہیں گے خنجر قاتل کیا؟ گلے مل کے
شررؔ کہیں کوئی پروانہ جل گیا ہوگا — نکل کے رہ گئے، آنسو جو شمع محفل کے

ہوا کیا؟ تم جو آئے منہ چھپا کے — کہ ہم ہیں دیکھنے والے ادا کے
ارادے کیا ہیں چشم فتنہ زا کے؟ — ادھر او آنے والے منہ چھپا کے
ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے کچھ خبر ہے — ترے غم میں دل صبر آزما کے
تری رحمت پہ محشر میں نظر ہے — چھپانے والے او میری خطا کے
تہ و بالا ہوئی جاتی ہے دنیا — غضب تم نے کیا پردہ اٹھا کے
مرے دل پر تری برق نظر آج — گری تو ہے مگر دامن بچا کے
صبا سے پوچھتی پھرتی ہے بلبل — کہ غنچوں نے کہا کیا؟ مسکرا کے
کسی کا کوچ ہے، آمد کسی کی — ستارے کہہ رہے ہیں جھلملا کے

جوناحق جان دیتے ہیں بتوں پر　　شررؔ! کیسے وہ بندے ہیں خدا کے؟

مجھے بسمل کرو، بسمل سمجھ کر　　خدا رکھے، بنو قاتل، سمجھ کر
لگی ہیں دیکھنے والوں کی آنکھیں!　　الٹنا پردۂ محمل، سمجھ کر
جہاں ہم گر پڑے اشکوں کی صورت　　وہیں بس رہ گئے منزل سمجھ کر
بنایا آئینہ قدرت نے دل کا　　ہراک تصویر کے قابل سمجھ کر
لہو پینا کسی بسمل کا لیکن　　سمجھ کر خنجر قاتل! سمجھ کر
دل بسمل میں بجلی کی تڑپ ہے　　چھری دینا ذرا قاتل سمجھ کر
شررؔ! سنتا نہیں فریاد کوئی　　اسیر پنجہ قاتل، سمجھ کر

مستوں کے لئے ہے تو اے نرگس مستانہ　　پیمانے کا پیمانہ، میخانہ کا میخانہ
شمع رخ جاناں کا دل ہوگیا پروانہ　　دیوانہ کو کیا کہئے دیوانہ تو دیوانہ
کہتے ہیں چمن جس کو دراصل ہے میخانہ　　مینا ہے ہر اک غنچہ، ہر پھلو ہے پیمانہ
بلبل کی فغاں کیا ہے؟ پھولوں کی ہستی کیا ہے　　یہ عشق کی باتیں ہیں، وہ حسن کا افسانہ
شبنم کی طرح رونا، پھولوں کی طرح ہنسنا　　وہ رات کا قصہ ہے، یہ صبح کا افسانہ
بجھتی ہی رہے گی تو، جلتا ہی رہے گا وہ　　اے شمع سحر! پھر بھی پروانہ ہے پروانہ
آنکھ اسکی ہے دل میرا، دل میرا ہے آنکھ اسکی　　پیمانہ میں شیشہ ہے، شیشہ میں ہے پیمانہ
اٹھتی ہیں جدھر آنکھیں تو ہی نظر آتا ہے　　پردہ نہ رہا پردہ، جب میں ہوا دیوانہ

حریم ناز کا پردہ تو اٹھ نہیں سکتا　　نظر جما کے تجھے دل میں دیکھتا ہوں میں
تڑپ رہے ہیں میری طرح دیکھنے والے　　کچھ ایسے درد کی تصویر بن گیا ہوں میں
ہر ایک ذرے میں ہے دل کے طور کا جلوہ　　مٹا بھی ہوں تو عجب شان سے مٹا ہوں میں
پڑا ہوا ہوں ترے در پہ اب کہاں جاؤں　　سمجھ کے مجکو اٹھانا کہ نقش پا ہوں میں
اٹھا ہے درد تو کہتا ہے مجھ سے بڑھ بڑھ کر　　کہ انتہا نہیں جس کی وہ ابتدا ہوں میں

ہوا ہے خون جو دل کا وہ کس کے سر جائے؟ ترا تو تیر یہ کہتا ہے بے خطا ہوں میں

ہوش اڑاتے جائیے جلوہ دکھاتے جائیے آپ جاتے ہیں تو دیوانہ بناتے جائیے
اپنے تیروں کو مرے دل سے ملاتے جائیے جذب کی قوت ہے کس میں آزماتے جائیے
ایک ہی حالت پہ رہنا درد کا اچھا نہیں کچھ گھٹاتے جائیے یا کچھ بڑھاتے جائیے
طے اس صورت سے ہوگی راہ تسلیم و رضا صبر کرتے جائیے اصدمے اٹھاتے جائیے
کچھ نہ کچھ تاثیر پیدا ہو ہی جائے گی شررؔ عرش کی زنجیر نالوں سے ہلاتے جائیے

نہ اٹھے مر کے بھی اس آستاں سے وہیں پہونچے چلے تھے ہم جہاں سے
لحد میں بھی نہ چھوٹا ساتھ تیرا شب غم! تو یہاں آئی کہاں سے
تو ہی اے درد دل !اٹھ کر بتادے بھر آئے آنکھ میں آنسو کہاں سے
ذرا سا دل ہے اور ناوک ہزاروں لہو اتنا کوئی لائے کہاں سے
تری چشم فسونگر ہے بلا کی ہزاروں فتنے اٹھتے ہیں جہاں سے
بنا ہے عرش کا تارا مرا دل زمیں ہے کتنی اونچی آسماں سے

پھول دامن میں لئے بادصبا آتی ہے لے اڑیگی جو قفس کو وہ ہوا آتی ہے
میری وحشت کا اثر اب تو یہاں تک پہنچا کہ چمن سے بھی بیاباں کی ہوا آتی ہے
جب کلی کوئی چٹکتی ہے بہار آنے پر خندۂ چاک گریباں کی صدا آتی ہے
ایک عبرت کا مرقع ہے چمن بھی یعنی دامن گل میں نظر موج فنا آتی ہے

(۳۴)

(۱۷)

مولانا شاہ محمد سلیمان حاذقؔ پھلواروی

شاہ محمد سلیمان نام، حاذقؔ تخلص، ولادت ۱۱؍محرم الحرام ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۵۹ء کو قصبہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا حکیم قاری داؤد ہے۔ دس سال کی عمر میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے ماموں مولانا شاہ نعمت مجیب سے حاصل کی۔ پھر لکھنؤ تشریف لے گئے اور تاج العلماء مولانا شیخ عبدالحئی انصاری کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے، فرنگی محل لکھنؤ سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد سہارنپور گئے۔ اور مولانا شیخ احمد علی محدث کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔ پھر دہلی جا کر مولانا نذیر حسین محدث دہلوی عرف میاں صاحب سے صحاح ستہ پڑھیں۔ طب کی کتابیں آپ نے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، حکیم محمد عبدالعزیز دریاآبادی اور حکیم مرزا مظہر حسین خاں بن حکیم مسیح الدولہ سے پڑھیں۔ اردو کی چند غزلیں میر فرزند احمد صفیر بلگرامی آروی کو اور فارسی کی غزلیں اپنے خسر اور پیرومرشد حضرت شاہ علی حبیب نصرؔ پھلواروی اور جناب شاہ وصی احمد پھلواروی کو دکھائیں۔ عربی قصائد واشعار کے استاد علامہ حکیم عبد الحمید عظیم آبادی تھے۔ آپ کی وفات ۲۷؍صفر روز جمعہ ۱۳۵۴ء مطابق ۳۱؍مئی ۱۹۳۵ء کو پھلواری شریف میں ہوئی۔ آپ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔

اردو کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

بجز وجود الٰہی کوئی وجود نہیں — شہود ذات مقدس سوا شہود نہیں
جو اپنے آپ کو دیکھا تو ہم نے یہ پایا — اسی کا جلوہ ہے اپنا نمود بود نہیں
بس اک آن میں شاہ عرب گئے کہ جہاں — مَلک یہ بولے مجھے اب رہ صعود نہیں
اس بادۂ وحدت کو ابلنے نہیں دیتے — متوالا بناتے ہیں اچھلنے نہیں دیتے
کہتے ہیں خبر دار نہ لغزش ہو قدم میں — پھر طرفہ تماشا ہے سنبھلنے نہیں دیتے
اے شمع تجھے سوز کے ہے ساتھ گداز ایک — یاں مجکو جلاتے ہیں پگھلنے نہیں دیتے
اس چاہ محبت کا کچھ انداز ہی ہے اور — جو اس میں گرا اس کو نکلنے نہیں دیتے
جب مجکو بلاتے ہیں کہ ہاں میری طرف آ — حیرت ہے کہ پھر کیوں مجھے چلنے نہیں دیتے

اس جہاں سے آج رحلت ہو چکی　　بس مری تیار تربت ہو چکی
لے چلو مجکو عزیز ودو ستو　　منزل دنیا کی مدت ہوچکی
نکلی یہ گور غریباں سے صدا　　اُتر واُتروشان وشوکت ہو چکی
ہے یہی گھر ہے یہی رہنا تمہیں　　اہل دنیا کی محبت ہوچکی
جب کہ تربت میں لٹا یایارنے　　گوشۂ دنیا کی راحت ہوچکی
سب عزیز واقربا کی ہائے ہائے　　اب سرِ مدفن سے رخصت ہوچکی
کچھ عجب ہیبت کے لوگ آئے نظر　　ختم جن پر ساری ہیبت ہوچکی
آکے بالیں پر یہ فر مانے لگے　　ختم تیری آج قوت ہوچکی
ساتھ کیا ہے توشہ آخر ترے　　بس دکھا مجھ کو کہ فرصت ہوچکی
ہاتھ خالی بے سروساماں ہوں میں　　لایا ہوں جو کچھ کہ قسمت ہوچکی
مت ستاؤ دور سے آیا ہوں میں　　طے اسی منزل پہ آفت ہوچکی
خویش وفرزندوں سے یہ دوگز کفن　　ساتھ لایا ہوں عنایت ہوچکی
ہاں قبالہ ساتھ ان کا لایا ہوں　　ہاتھ پر جن کے کہ بیعت ہوچکی
بس کوئی دم میں وہ آتے ہیں یہاں　　جن کی صورت اپنی صورت ہوچکی
غوث الاعظم فخر آدم ساتھ ہیں　　جن کے باعث مجھ کوعزت ہوچکی
ساتھ ہی ان کے علیؑ ہیں اور نبیؐ　　جن کی تقریر شفاعت ہوچکی
چین سے سونے دو مجھ کو حشر تک　　ختم اب ساری مصیبت ہوچکی
یوم راحت کیوں نہ ہوحاذقؔ کہ آج　　حاکم اعلیٰ سے نسبت ہوچکی :(۳۵)

(۱۸)

مولانا سید محمد ایوب شمیمؔ ندوی سہسرامی

سید محمد ایوب نام، شمیمؔ تخلص ۔سال ولادت ۱۹۰۴ء ہے۔اصلی وطن سہسرام ضلع آرہ موجودہ

ضلع بھوجپور ہے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا۔دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔فراغت کے بعد ڈالٹین گنج پلاموں میں ہیڈ مولوی کے عہدہ پر فائز رہے۔اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔شاعری کا ذوق اچھا تھا،آپ کا کلام اکثر ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

وہ تو کیا ان کا تصور بھی ہمارا نہ ہوا ڈوبنے والے کو تنکا بھی سہارا نہ ہوا
لب تک آتے ہی مرے ہاتھ سے ساغر چھوٹا یار کی چشم کا در پر دہ اشارا نہ ہوا
اے رقیبو! کرو اس کی مدارات بہت وہ کسی کا بھی نہ ہوگا جو ہمارا نہ ہوا
ہم نے جس بت کیلئے ساری خدائی چھوڑی ہائے افسوس کہ وہ بت بھی ہمارا نہ ہوا
ہم نے ہر رنگ میں دنیا کو سنوارا اے شمیمؔ سہر فہرست مگر نام ہمارا نہ ہوا

حسن ادا تو دیکھئے دل توڑ توڑ کے وہ دیکھتے بھی جاتے ہیں منہ موڑ موڑ کے
جھکتے نہیں ہیں ہم کبھی باطل کے سامنے اپنے حقوق لیتے ہیں پنجہ مروڑ کے
اک بوند ہے لہو کی وہ دل جس کا نام ہے لے لیجئے وہ قطرۂ خوں بھی نچوڑ کے
اردو زباں ہزار زبانوں میں ایک ہے پانی کو چوس لیتی ہے پتھر کو توڑ کے
جنت کو چھوڑ چھاڑ کے دنیا میں آئے تھے جاتے کہاں ہیں دیکھئے دنیا کو چھوڑ کے
تردامنی سے پیاس بھڑکتی ہے اور بھی ہم شمیمؔ مطمئن ہیں دامن نچوڑ کے

نظر پڑی جس بت حسیں پر وہ لاکھ میں انتخاب نکلا
خدا نہیں تھا مگر وہ ساری خدائی میں لاجواب نکلا
کہاں کہاں کی نہ خاک چھانی سراغ پایا نہ زندگی کا
جہاں لپک تھی وہ طور ٹھہرا جہاں چمک تھی سراب نکلا
نظر میں تم کو بسائے رکھتے ،جگر سے تم کو لگائے رکھتے
مگر کریں بھی تو کیا کریں ہم یہ دل ہی خانہ خراب نکلا

نظرم میں وہ خیر گی سمائی کہ بجھ گئی روشنی بھی دل کی
جسے سمجھتے تھے آپ جلوہٗ وہ پردہٗ صدحجاب نکلا
ہمارے داغ الم سے دنیا، ہوئی تو کب باخر ہوئی ہے
ہمارے دل کا سراغ لیکر افق پہ جب ماہتاب نکلا
چمن پڑا الہلہا رہا تھا خزاں کھڑی مسکرا رہی تھی
کچھ ایسے ہی دور سے گذر کر ہمارا عہد شباب نکلا
زمانہ جس کو سمجھ رہا تھا کہ راز سر بستہ ازل ہے
وہ زندگی کی کتاب ہی کا کھلا ہوا ایک باب نکلا
ادائیں کافر، نگاہ قاتل نظر قیامت غضب کی چتون
میری ضعیفی پہ طنز کرتا ہوا کسی کا شباب نکلا
شمیمؔ اس نے بھی آزمائش کی کوئی طرز جفا نہ چھوڑی
مگر وفا کے ہر امتحاں سے گذر کے میں کامیاب نکلا

(۳۶)

(۱۹)

مولانا شاہ غلام گلؔ پھلواروی

مولانا شاہ غلام حسنین تخلص گلؔ وامیدؔ قصبہ پھلواری ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی کی اعلیٰ ستعداد رکھتے تھے۔تحریر کے دھنی تھے۔ان کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مضامین میں کوئی لفظ ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔صوفیوں کے سلاسل طریقت ان کی تاریخ اور ان کے احوال میں محبت وسند تسلیم کئے جاتے تھے۔اس صنف میں آپ کے بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔آپ صوفیانہ عقائد کے اعتبار سے وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔شاعری میں اپنے عم محترم حضرت مولانا تمناؔ عمادی کے شاگرد تھے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

ان کو ہر وقت نیا ایک ستم یاد آیا　　میرے لب پر نہ کبھی شکوہٗ بیداد آیا
سچ ہے مصنوع سے صانع کا پتہ چلتا ہے　　ہم نے اس بت کو جو دیکھا تو خدا یاد آیا

وہ تو تھے وعدہ فراموش جو آنا بھولے — ملک الموت کو کیا تھا جو نہ میں یاد آیا
اتنی تاکید سے کیوں مجکو بلا بھیجا ہے — کہئے کیا آج نیا کوئی ستم یادآیا
حشر میں رکھی ہوئی تھی مری ڈگری ان پر — کیوں سفارش کے لئے حسن خداداد آیا
ایک سے ایک گلے آج یہ کیوں ملتا ہے — عید آئی ہے الہیٰ کہ وہ جلاد آیا
مجھ پہ الزام نہیں تشنگی نشتر کا — خودمیں حیران تھا کس کام کو خصادآیا
آگئی یاد وہ آبائی ویرانہ دل — اپنے آگے جو کوئی خانہ آباد آیا
اپنی قسمت پہ کریں ناز نہ کیوں ہم اے گلؔ — کہ پسند ان کو ہمارا دل ناشادآیا

گھر سے باہر آرہی ہے تاب روئے یار کی — واہ کیا تقدیر چمکی روزن دیوار کی
زرد چہرہ، آنکھیں پتھرائیں زباں اور ہونٹ خشک — اے مسیحا! اب یہ حالت ہے ترے بیمار کی
اس کی نظروں میں سمائے پھر نہ ساون کی جھڑی — دیکھ لے بارش جو میری چشم دریا بار کی
ہے تشابہ کا تعلق ان کے دندان سے اسے — اس لئے ہے قدراتنی گوہر شہوار کی
چشم وابرودیکھ کر ان کے تعجب ہے مجھے — کیا ضرورت ہے گل نرگس پہ اک تلوار کی
جس کو دے رکھا ہے خورشید قیامت کا خطاب — ایک چنگاری ہے میری آہ آتش بار کی
کیا ہنسی آتی ہے اے گلؔ جونہیں خود اہل فن — اہل فن سے چاہتے ہیں دادوہ اشعار کی

(۳۷)

(۲۰)
مولانا محمد اسمٰعیل آسیؔ آروی

محمد اسمٰعیل نام، آسی تخلص اور وطن شہر آرہ ہے۔ ان کے جد امجد پھلواری شریف ضلع پٹنہ سے آرہ آئے اور یہیں بس گئے۔ آسیؔ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۱ء کو اپنے آبائی مکان محلہ عبور پل میں پیدا ہوئے۔ آسی نے شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۳۹ء سے کی۔ مولوی حکیم عبدالحکیم طبیب آروی اور حضرت زارؔ عظیم آبادی سے چند غزلوں پر اصلاحیں لیں اور حضرت زارؔ کی وفات ۱۹۶۰ء کے بعد حضرت مولانا سید شاہ محمد قائم قتیلؔ داناپوری سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ علمی و ادبی ذوق شروع سے دامنگیر رہا۔ آسیؔ کی غزلیں درددل کی حامل ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

جو پوشیدہ ہے نظروں سے،حقیقت وہ عیاں ہوگی : مری روداد میں شامل تمہاری داستاں ہوگی
جوان کا کام تھا وہ کر گئے اپنی نگاہوں سے : کسی پر کیا گزرتی ہے،خبر ان کو کہاں ہوگی

نظر نامہرباں کی مہرباں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ اثر کرتی ہوئی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے
جہاں وہ کہتے کہتے رک گئے افسانہ اے آسیؔ ۔۔۔ وہاں سے آگے ان کی داستان معلوم ہوتی ہے

مجھی میں جو ہر قابل کی ہے کمی شاید ۔۔۔ تمہاری ذرہ نوازی میں کچھ کلام نہیں
نگاہ قہر کا مرکز تھا کون محفل میں ۔۔۔ حضور کہتے ہیں تیرا کوئی مقام نہیں
یہ فلسفہ،یہ سیاست،یہ حکمت ودانش ۔۔۔ کہاں کہاں مری خاطر کمند ودام نہیں

دیکھا ہے اک نظر انہیں انجام جو بھی ہو ۔۔۔ قسمت میں اپنی اے دل ناکام جو بھی ہو
امکان بھر رہائی کی کرتا ہے کوششیں ۔۔۔ مرغ بلا نصیب، تہ دام جو بھی ہو
کچھ این وآں کو دخل نہیں راہ عشق میں ۔۔۔ اب ان کا میرے واسطے پیغام جو بھی ہو
آنکھوں میں وقت دید کچھ آنسو ضرور تھے ۔۔۔ ہم پر اب اس کے واسطے الزام جو بھی ہو
کہتا ہے دل کی بات،مگر اپنے شعر میں ۔۔۔ قسمت کا مارا آسیؔ گمنام جو بھی ہو

(۳۸)

(۲۱)
مولانا سید شاہ سید علی کاملؔ اسلام پوری

سید شاہ سید علی نام،کاملؔ تخلص،آپ کی ولادت ۱۲۹۵ھ میں اپنی نانیہالی اسلام پور میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت صوفیؔ منیری سے حاصل کی۔علوم دینیہ کی تکمیل حضرت مولانا سید محمد رفیق قادری سے ہوئی۔پھر کانپور تشریف لے گئے اور مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے حدیث و فقہ کی تکمیل کر کے حدیث کی سند حاصل کی۔شعروشاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔اپنے والد

حضرت صوفی منیری کی زندگی ہی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔اپنے والد کے وصال کے بعد ان کے شاگرد حضرت عرفان اسلامپوری سے مشورۂ سخن لیا۔آپ کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے اہم نکتہ کو بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔آپ کا وصال ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء میں اسلام پور میں ہوا۔

اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

جس دل میں تیرا گھر نہ ہو وہ دل خراب ہے جو دل ہے محو یاد وہی کامیاب ہے
ہر شئی میں گو ہے اس کی تجلی عیاں مگر یہ غایت ظہور خود اس کا حجاب ہے
ہے مثل آفتاب عیاں بھی نہاں بھی ہے عارض پر تیرے فرط تجلی نقاب ہے
ہم میں وہ جلوہ گر ہے مگر دیکھیں کس طرح اپنا وجود ہی تو سراسر حجاب ہے

مزید ایک غزل پیش خدمت ہے، ملاحظہ ہو ؎

پھر وہ رشک گل تر یاد آیا پھر وہ منظور نظر یاد آیا
حیف اس دل پہ ہے جس کو اے دوست جز ترے کوئی اگر یاد آیا
بعد مدت کے چلے ہیں ناوک آج پھر میرا جگر یاد آیا
اس کے سہنے کو بھی ہم ہیں تیار کچھ ستم اور اگر یاد آیا
کعبہ ہو یا دیر ہو شیدا کو تیرے ہر جگہ تیرا ہی در یاد آیا
کچھ بھی یاد اب دل کاملؔ کو نہیں
تو جو یاد آیا اگر یاد آیا **(۳۹)**

(۲۲)
مولانا حکیم محمد فخر الحسن حکیم سہسرامی

حکیم محمد فخر الحسن حکیمؔ بن مولانا حکیم محمد ابن الحسن مضطر محلہ شیخپورہ ضلع شاہ آباد آرہ میں ۴؍رجون ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔گیارہ سال کی عمر میں والد بزرگوار کا سایہ عاطفت ۵؍اپریل ۱۹۱۶ء کو اٹھ گیا۔دادا مولانا خوشدل کے زیر سایہ تعلیم و تربیت ہوئی۔فارسی و عربی کی کتابیں مولانا خوشدل سے پڑھیں۔اعلیٰ تعلیم کے لئے سفر کیا۔فقہ،حدیث اور معقولات کی تعلیم الہ آباد اور لکھنو میں

حاصل کی۔ لکھنو میں طبب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ فراغت کے بعد طبابت کا مشغلہ اختیار کیا۔ مسلسل پندرہ سال تک سہسرام میونسپلٹی میں میونسپل کمشنر رہے۔ شعروشاعری اور تاریخ گوئی کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری میں فکر اور فن کا حسین امتزاج ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کبھی اک جھلک نظر آ گئی لباس حسن مجاز میں
ابھی ایسی لاکھوں تجلیاں ہیں حریم خلوت ناز میں

وہ نوا جو درد سے ہے بھری جسے کانوں نے نہ سنا کبھی
کوئی نغمہ ہوشربا ابھی ہے خموش پردۂ ساز میں

کبھی عرش تک نہ پہنچ سکی وہ کسی غریب کی آہ تھی
یہ پتا نہیں کہ کدھر گئی ہے نشیب میں نہ فراز میں

ہے خموش شمع کھڑی ہوئی کہ سنائیں سوز دروں تو کیا
نہ کوئی اثر ہے زبان میں نہ بیان سوز و گداز میں

کبھی نے میں نغمہ دلربا کبھی لب پہ نالہ نارسا
ہے نمو و جذبہ بیخودی کبھی سوز میں کبھی ساز میں

ترے سنگ در کی ہے جستجو، ترے نقش پا کی تلاش ہے
ابھی شوق سجدہ بیخودی ہے مری جبین نیاز میں

فقط ایک سجدہ بے ریا میں ہیں دو جہاں کی دولتیں
یہ یقین ہے ہم کو کہ پائیں گے جو طلب کرینگے نماز میں

یہ اگرچہ دور فتادہ ہے مگر آپ ہی کا غلام ہے
کبھی بدنصیب حکیم کو بھی بلائے تو حجاز میں

اے تیر نظر! گھائل تیرا اک دل کے سوا کچھ اور نہیں
کہتی ہے خلش پہلو میں مرے بسمل کے سوا کچھ اور نہیں

عبرت کا تماشا آنکھوں نے اس صفحہ ہستی پر دیکھا
جو نقش ابھرتا ہے اس پر باطل کے سوا کچھ اور نہیں

ننھا سا یہ اک روشن نقطہ دراصل جو مرکز حسن کا ہے
اب چاند سے رخ کی زینت سے وہ تل کے سوا کچھ اور نہیں

دریا میں ہیں بیحد سود زیاں خطروں کے بھی ہیں امکاں حکیم
محفوظ اگر ہے کوئی جگہ ساحل کے سوا کچھ اور نہیں

ابھی نکلی تھی منہ سے اور کہاں تک بات جا پہونچی
حد امکاں سے بڑھ کر لامکاں تک بات جا پہونچی
نہ تھا معلوم بام عرش تک آواز پہونچے گی
جہاں اپنا گذر مشکل وہاں تک بات جا پہونچی
بہار نو کی آمد کی خبر معلوم کس کو تھی
یہ بلبل کی زباں سے باغیاں تک بات جا پہونچی

لہو پینے لگا آنکھوں سے پہم اشک کے بدلے
خلش سے دل کی چشم خوں فشاں تک بات جا پہونچی
فرشتے خیرمقدم کررہے ہیں میرے نالوں کا
حکیمؔ اہل زمیں کی آسماں تک بات جاپہونچی
(۴۰)

(۲۳)

مولانا حکیم سید سعداللہ سعدؔ رجہتی گیاوی

مولانا حکیم سید سعداللہ سعدؔ گیاوی کی پیدائش موضع رجہت ضلع گیا میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی فارسی کا درس اپنے والد بزرگوار جناب حکیم سید ظہیر طبیب شہر گیا سے حاصل کیا۔ فراغت مدرسہ انوارالعلوم گیا سے ہوئی۔ آپ کا خاندان لیاقت، شرافت اور علمی فضیلت کے اعتبار سے پورے صوبہ بہار میں مشہور ہے، والد بزرگوار کے ساتھ ہی محلہ بنیاپوکھر گیا میں رہا کرتے تھے۔ اور اپنے والد کے مطب میں طبابت کرتے تھے۔ سعدؔ کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ جناب آرزوؔ لکھنوی کے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ ایک زمانہ میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد اور آپ کے درمیان خط وکتابت جاری رہی۔ علمی، مذہبی مسائل زیر بحث رہے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ نے خطوط مولانا آزاد بنام حکیم سعداللہ وغلام رسول مہر ''میرے عقیدے'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ جناب سعدؔ کا مطب گیا کے علمی و ادبی شخصیتوں کا مرکز رہا ہے۔ آپ کی شرکت اکثر و بیشتر شعری وادبی انجمنوں میں ہوا کرتی تھی۔ آپ کی سخن فہمی کے سبھی قائل تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

لطف جب ہے کہ اٹھو پاس سے ہوکر میں خفا ہاتھ ان کا مری گردن میں حمائل ہوجائے
کس قدر یہ نگہ ناز اثر آگیں ہے کہ ذرا چھیڑ دے جس کو وہی بسمل ہوجائے

فضا میں گریوں ہی جمتا رہا دود فغاں میرا تو زیر آسماں بن جائے گا اک آسماں میرا
نہیں ہوتی وہاں نعلین ہی پر اکتفا موسیٰ اتا راجاتا سربھی قریب آستاں میرا

اتارا خوب چربہ دل نے مرے شبنم وگل کا — تمنا روتی ہے ہنستا ہے زخم خونچکاں میرا
نہیں ہے یاد میعاد اسیری، یاد ہے اتنا — وہاں پر خاک اڑتی تھی جہاں تھا آشیاں میرا
کئے جاتا ہوں ہر نقش قدم پر اس کے میں سجدہ — ہوا جاتا ہے یہ نقش جبیں اب کہکشاں میرا
میں خود ہوں جستجوئے دل میں سرگرداں مزا یہ ہے — وہ مجھ سے پوچھتے ہیں سعدؔ ہے ناوک کہاں میرا

سعدؔ فراق میں بھی ہے، تجکو نصیب لطف دید — چھوڑ گئے ہیں عکس وہ دیدہ اشکبار میں

خزاں کی آمد آمد کا پتہ ملتا ہے صرصر سے — جبھی تو بو نکل جاتی ہے گھبرا کر گل تر سے
قریب شمع جانے کا نہیں اب ایک پروانہ — سر محفل ہٹاتے ہیں وہ گیسوروئے انور سے

سوز دل کا حال نہ پوچھو، خود ہی دیکھ آنکھوں سے — محفل میں موجود ہیں دونوں شمع بھی اور پروانہ بھی
خال سیہ پر دل لچایا، اور اسیر زلف ہوا — سعدؔ ہم پھنستے نہ کیونکہ دام بھی تھا اور دانہ بھی

مستوں کی طرح شیخ جی کیوں جھوم رہے ہیں؟ — تسبیح میں انگور کا تو دانہ نہیں ہے؟
(۴۱)

(۲۴)
مولانا محمد حفیظ الدین لطیفیؔ رحمانپوری

محمد حفیظ الدین نام اور لطیفیؔ تخلص تھا، رحمان پور ضلع پورنیہ کے رہنے والے تھے۔ مولانا کی ولادت موضع کنہریا میں ہوئی۔ جو تھانہ اعظم نگر سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مولانا شیخ حسین علی کے صاحبزادہ تھے۔ جو اپنے دیار کے بااثر رئیسوں میں تھے۔ ابتدائی تعلیم موضع رسول پور میں ہوئی۔ پٹنہ میں متوسطات کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی جا کر مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے واپس ہو کر پٹنہ میتن گھاٹ خانقاہ کے سجادہ نشیں خواجہ لطیف علی سے بیعت کی۔ اور لطیفی کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اپنے پیر مرشد کے اشارہ پر

مدرسہ خانقاہ سہسرام کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آخر عمر میں اپنے وطن پورنیہ تشریف لائے۔ اور موضع برہان پور میں جواب رحمان پور کے نام سے مشہور ہے وہاں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔ شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اور لطیفیؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کا دیوان ''دیوان لطیفیؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

غریق لجہ تو حید ناب کر کے مجھے — بنا دیا ہے مجھے، خراب کر کے مجھے
جدا کیا مجھے آرام گاہ وحدت سے — خدائے پاک نے شکل حباب کر کے مجھے
جہاں میں کون ہے بیدار غیر مست الست — نکال دے تو کوئی انتخاب کر کے مجھے

لاف وعشق و مہربانی اور ہے — جان من! دل کی کہانی اور ہے
سر سبحان الذی اسریٰ دگر — رمز قول لن ترانی اور ہے
قصہ خواں کو سّر حق کی کیا خبر — سر جدا ہے قصہ خوانی اور ہے
ہر عیاں میں اک نہاں ہر چند ہے — پر عیاں دیگر، نہانی اور ہے
لاف دانی گرچہ ہر انساں کو ہے — پر لطیفیؔ راز دانی اور ہے

اے جاں! ترے سب ڈھنگ ہیں انداز ہیں حد سے پرے
ہر گز ندیدم چوں تو زیبا دلربا تر دبرے
کس کس اداؤ ناز پر تیرے بھلا کوئی مرے
جادو نگاہے ، کجکلا ہے، خوش لقا ،خوش نظرے!
عاشق ترے تجھ پر بتا! گرجاں نہ دے تو کیا کرے
گلگوں رخے، فتاں نظر، لعل ہے، خوش پیکرے
بندہ وہی جو شان مولیٰ پر فدا ہوکر مرے
حقا فنا شددیگر ش کس بندہ دیدہ ورے

میری نظر تیری طرف سے جان من کیونکر پھرے
دل بردہ جانم زمن آوردۂ بر منظرے
یہ عاشق مجروح اے جان! کب تلک تڑپا کرے
سوئم تماشا کن کہ تا درخاک وخوں بینی سرے
میں مر چکا ہوں عشق میں ہاں زندگہ ہوں دم سے ترے
دردل نماندہ جز تو مارا آرزوے دیگرے
بلبل نہیں پروانہ ہوں اس شمع روسے پر مرے
ہائے اے لطیفیؔ سوختہ شد، گشتم اکنوں بے پرے

(۴۲)

(۲۵)

مولانا سید یحییٰ ہلالؔ ندوی گیاوی

سید یحییٰ نام، ہلالؔ تخلص دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کی وجہ سے ندوی کہلاتے تھے۔ آپ کے والد کا نام حکیم سید عبدالسبحان وارثی تھا۔ آبگلہ ضلع گیا ۱۳۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ موضع شہر گیا سے قربت کی وجہ سے اب شیر گیا کا محلہ قرار دیدیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی۔ پھر مدرسہ عزیزیہ بہارشریف میں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم ندۃ العلماء لکھنو میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۳۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد ادارۂ ٹیگور میں ملازمت کی۔ پھر کراچی چلے گئے۔ اور سندھ مسلم کالج کراچی سے منسلک ہو گئے۔ صدر شعبہ دینیات کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

مولانا کو شاعری کا بھی ذوق تھا۔ ابتداء میں حضرت سید عطاء کریم عطاء بہاری تلمیذ تسلیم لکھنوی سے کلام پر اصلاح لی۔ پھر بے نظیر شاہ وارثی سے اصلاح لینے لگے۔ مولانا یحییٰ ہلال ندوی کے کلام میں پختگی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

مطابق ہمت وعمل، ہے عروج ہر فرد کی خودی کا　　اگر نہ ہو یہ ارتفاع پیہم تو عرش مبلغ ہے آدمی کا
شمار امروز ودوش سے تو، نہ کر حساب حیات ہمدم　　گداز وسوز دوام سے ہے چراغ روشن یہ زندگی کا

رباب ہستی کا ریز دم یہ، نہیں ہے تارِ نفس کے دم سے　　کہ زخمہ آرزو کی ضربوں سے ساز بجتا ہے زندگی کا
جبین گردوں بھی ان کے آگے جھکی ہوئی ہے جو عبدۂ میں　　کہ فہم وادراک سے بھی اونچا مقام ہے رب کی بندگی کا
جمال رنگیں، جلال تمکیں، کمال حق میں، نوال آگیں　　بہم یہ کرنا صفات حق کی کمال بیشک ہے آدمی کا
خداشناسی، وخودشناسی، جہاں شناسی وحق شناسی　　انہی میں مضمر ہے امن عالم، عروج انہی سے ہے آدمی کا
یہ عزم محکم، یہ جہد پیہم، یہ خلق اکرم، یہ فتح عالم　　ہے طرہ امتیاز مسلم، یہی منارہ ہے روشنی کا
یہ سوز پیہم، یہ چشم کرنم، یہ قلب پرغم، یہ دردعالم　　ہلالؔ جب ہونشان پر چم، تو راز روشن ہو زندگی کا

(۴۳)

(۲۶)
مولانا سید شاہ امجد حسین امجدؔ عظیم آبادی

سید شاہ امجد حسین نام، امجدؔ تخلص، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء میں خانقاہ حضرت رکن الدین عشق تکیہ پٹنہ کے سجادہ نشیں ہوئے۔ ہم عمر مشائخ میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ خانقاہ میں مثنوی مولانا روم کا درس دیا کرتے تھے۔ جس میں اہل علم کا مجمع رہتا تھا۔ دور دور سے اہل علم آتے اور درس میں شریک ہوتے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ حسینؔ اور امجدؔ تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ دونوں کے کلام کا مجموعہ موجود ہے۔

۲۲/ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء کو وفات پائی۔ مزار حضرت عشق متین گھاٹ کے احاطہ میں ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل مرا عشق حقیقت میں بہت شاد رہا　　سب کو ہم بھول گئے حسن خدا یاد رہا
کسوت خلق میں یوں عشق ہوا جلوہ فزا　　صورت قیسؔ کہیں صورت فرہاد رہا
ان کے ہر وعدہ میں بس عذر فراموشی ہے　　بھول جانا مری باتوں کا انہیں یاد رہا
آل امجدؔ کی غلامی سے یہ نعمت پہونچی　　اپنی ہستی کے سوا اور نہ کچھ یاد رہا

کس کے عشق میں تم دل شکستہ ہو امجد!　　کہو تم ہم سے بھی سر نہاں ذرا اپنا

اے حسن سحر تم سے آغوش ہوئی دھوپ دل اپنا شپ تار ہے روپوش ہوئی دھوپ

ظہور عشق بتاں ہے یہاں وہاں کے لئے دکھائے حسن نے جلوے کہاں کہاں کے لئے
بنا ہے خاصہ دل تن میں جان جاں کے لئے مکیں چاہئے ہے اب اس مکاں کے لئے

برباد عمر اپنی محبت میں ہوگئی عشق بتاں نے خاک میں ہم کو ملا دیا
کچھ اپنے درددل کا فسانہ عجیب ہے وہ ماجرا ہے جس کو سنایا، رلا دیا :(۴۴)

(۲۷)

مولانا شاہ رحمت اللہ احقرؔ مظفر پوری

شاہ رحمت اللہ نام، احقرؔ تخلص، والد کا نام مولانا سید شاہ عبداللہ تھا۔ مولود مسکن محلہ جندوارہ ضلع مظفر پور تھا۔ موصوف کا خاندان رشد و ہدایت کا سر چشمہ تھا۔ اکابر علماء اور صوفیاء اپنے خاندان کا نام روشن کرتے رہے۔ جذبہ تبلیغ وارشاد ان کے دادا حضرت سید شاہ احمد اللہ کو مظفر پور لے آیا۔ تب سے یہ خاندان مستقل طور سے سکونت پذیر ہے۔ شاہ رحمت اللہ کی ولایت مظفر پور ہی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ تحصیل علم کے بعد گھر واپس آ گئے۔ اور جامع العلوم مظفر پور کی بنیاد رکھی۔ آخری عمر تک درس و تدریس میں منہمک رہے اور انتقال تک اس کے مہتمم رہے۔

احقر کو بچپن ہی سے شعر گوئی سے دلچسپی تھی۔ چند غزلیں نیرؔ بنارسی کو دکھائیں پھر مرزا داغؔ دہلوی سے استفادہ کیا۔ لیکن یہ سلسلہ تلمذ زیادہ دنوں نہ چل سکا۔ اور مرزا داغؔ رخصت ہو گئے۔ جناب احقرؔ کا قلمی دیوان ان کے اعزاء کے پاس موجود ہے کچھ اشعار اس دیوان سے پیش کئے جاتے ہیں۔

مولانا کا انتقال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء میں ہوا۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے ؎

دوست کیا دشمن زمانہ ہوگیا قہر تم سے دل لگانا ہو گیا
حضرت احقرؔ جہاں سے چل بسے
ختم الفت کا فسانہ ہوگیا

کیا غضب ہے دل یہ پگھلے اس ستم ایجاد کا اور پھونکے چرخ کو شعلہ مری فریاد کا
آپ ہی جب ہوگئے بیزار مجھ سے اے حضور کون پوچھے حال آ کر اس دل ناشاد کا

شرمندہ پیش عارض روشن ہے آفتاب زیر سحاب یا تہہ دامن ہے آفتاب
جب سے تصور رخ پرنور یار ہے کاشانۂ خیال میں روشن ہے آفتاب
ہے شوق میکشی شب مہتاب میں انہیں لو چاندنی کے کھیت میں روشن ہے آفتاب

وحدت تری کہتی ہے کسی جا پہ نہیں ہیں خلوت میں ہمیں رہتے ہیں جلوت میں ہمیں
یہ روشنی بزم جہاں دور ہم سے قائم اس بزم کے پھر انجمن آرا بھی ہمیں ہیں

حشر تک ویسے نہ نکلے گی ہماری آرزو بندہ پر ور آرزو ہے یہ تمہاری آرزو
ناز سے احقرؔ کسی کا وصل میں کہنا غضب آج تو پوری ہوئی کیوں جی تمہاری آرزو

بلا سے مٹے نام اہل وفا کا سلامت رہو تم جفا کرنے والے
سر حشر ناحق نہ گھبراؤ اتنا نہیں ہم ستم کا گلہ کرنے والے
قیامت کی چالیں یہ کہتی ہیں احقرؔ
ہیں سرکار فتنے بپا کرنے والے

وعدہ کیا ہے اسے پوا نہ کریں گے ایمان یہ کہتا ہے کہ ایسا نہ کریں گے
حشر میں نہ گھبراؤ خدا کے لئے اتنا ہم تم کو بھری بزم میں رسوانہ کریں گے

ممکن ہے کہ ہو ترک تمنا کی تمنا کیوں کر یہ کہیں کوئی تمنا نہ کریں گے
جو کچھ کہ نہ ہونا تھا ہوا دل کی بدولت کمبخت کا ہم آج سے کہنا نہ کریں گے
کیا ہوگا اگر بول اٹھے خود دہن زخم
ہم آپ سے گو خون کا دعویٰ نہ کریں گے

دل دکھا کر اور اس نے ضبط کی اچھی کہی درد میں ہوتی ہے کچھ یوں بھی کمی اچھی کہی
دل کو لگ جاتی ہے سچی بات قاصد کیوں نہ ہو ان بتوں میں تو نے میری یاد کی اچھی کہی

دل سے ویراں میں آیئے تو سہی اجڑے گھر کو بسایئے تو سہی
آپ کا ہاتھ ہاتھ آیا ہے ہم سے اب بچ کے جائے تو سہی

جو عاشق ہے اس کو کیا چاہئے خیال رخ دل ربا چاہئے
رہے دل میں احقرؔ محبت کا داغ
کہ کچھ ساتھ روز جزا چاہئے

انہیں ہوگی اے دل خبر ہوتے ہوتے ان آہوں میں ہوگا اثر ہوتے ہوتے
کہیں خاتمہ ہو نہ قاصد ہمارا خبر کرتے کرتے، خبر ہوتے ہوتے
نصیبا تو دیکھو کہ جکڑا کہاں پر ادھر ہو گئے وہ ادھر ہوتے ہوتے
قفس کو بھی صیا دہم لے اڑیں گے اگر بچ گئے بال و پر ہوتے ہوتے
یہ کوچہ حسینوں کا کوچہ ہے احقرؔ
ترا ہوگا اس میں گذر ہوتے ہوتے

اور کیا مہربان باقی ہے لیجئے ایک جان باقی ہے
تیرے دم سے ہے رونق عالم تیرے دم سے جہاں باقی ہے

آج دیکھا مزار احقرؔ کا کچھ مٹا سا نشان باقی ہے

صاحب خمخانہ جاوید جو اشعار نوٹ کئے ہیں وہ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ؂

کہتے ہیں کیا رو رہے ہو دل گیا ہم جو تم سے مل گئے سب مل گیا
اب لڑی بس اب لڑی ان سے نظر اب گیا بس ہاتھ سے اب دل گیا

آپ اور مجھ پر کرم، شان خدا آپ اور پوچھیں غریبوں کا مزاج
اے تبو! اس چار دن کے حسن پر یہ مزاج، اتنا مزاج، ایسا مزاج

دل سے مجبور ہوں واعظ ورنہ تم جو کہتے ہو سمجھتا ہوں میں
زندگی میری محبت ہے تری تجھ پہ مرتا ہوں تو جیتا ہوں میں
تیرے ملنے سے خدا ملتا ہے سو کی اک بات یہ کہات ہوں میں

وقت آخر بھی نہ نکلی کچھ ہماری آرزو دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے ساری آرزو
رہ گئے منھ دیکھ کر جب حشر میں ان سے کہا ہم ہوں شرمندہ، یہی ہے کیا تمہاری آرزو

وہ سر ہے رہے جس میں سود اترا وہ دل ہے تری جس میں ہو یاد کچھ
محبت میں احقرؔ کو سمجھائیں خاک سمجھتا بھی ہو خانہ برباد کچھ

وہ کہتے ہیں تم سے پڑے ہیں ہزاروں بڑے اک تمہیں ہو وفا کرنے والے

جو کچھ کہا، کہا، نہیں اس کو گلہ مجھے
توبے وفا ہے، آپ نے یہ کیا کہا مجھے

یہ آداب محبت کا سبق ہم سے پڑھے کوئی بچا کر پاؤں ہم نقش قدم پر تیرے چلتے ہیں

دم رخصت کہا دل کسی نے کا تھام کر دامن ۔۔۔ اکیلے آپ کیا چلتے ہیں، ہم بھی ساتھ چلتے ہیں
حقیقت جانتے ہیں کچھ ہمیں موج محبت کی ۔۔۔ یہ وہ چشمہ ہے جس سے سینکڑوں چشمے ابلتے ہیں
محبت کو جو سمجھے حاصل کونین اے احقرؔ ۔۔۔ کہیں بگڑے ہوئے ایسے بھی دنیا میں سنبھلتے ہیں

(۴۵)

(۲۸)

مولانا محمد داؤد طالبؔ دربھنگوی

مولانا محمد داؤد طالبؔ کا وطن موضع جلوارہ، ضلع دربھنگہ تھا، پہلے وہ شاطرؔ اور پھر طالبؔ تخلص کرنے لگے۔ سال پیدائش ماہ شعبان ۱۳۳۳ھ مطابق اپریل ۱۹۱۵ء ہے، ان کے والد کا نام رفیع الدین تھا۔ سلسلۂ نسب محمد داؤد بن رفیع الدین بن محمد رضا بن شیخ جعفر ہے۔ انہوں نے حفظ اپنے بڑے بھائی قاری محمد یٰسین صاحب سے مکمل کیا اور تجوید مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے۔ ابتدائی تعلیم موضع کرونی، موضع ململ اور مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں میں حاصل کی۔ مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ میں تعلیم مکمل کی۔

فراغت کے بعد مختلف اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیئے۔ ان اداروں کی فہرست طویل ہے، انہوں نے موضع بلہی میں پھر مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں ضلع دربھنگہ میں تدریسی خدمات انجام دیئے۔ اقبال منزل موضع بڑھی ضلع دربھنگہ میں تقریباً ۱۰ ربرسوں تک یعنی ۱۹۴۵-۱۹۵۳ء تک امامت، خطابت اور تدریسی ذمہ داری انجام دی۔ مدرسہ ضیاء الاسلام جلوارہ میں ایک سال تک درس وتدریس سے منسلک رہے، پھر مدرسہ مظہر العلوم چھچھوا، ضلع مدھوبنی میں استاذ کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ بسٹن بازار آسنسول اور ٹیلکو جامع مسجد جمشید پور میں امام وخطیب کے فرائض انجام دیئے۔ مدرسہ خانقاہ سمرقندریہ کے مدرسہ سے وابستہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو نام کی مناسبت سے لحن داؤدی سے نوازا تھا۔ ان کی آواز پُرکشش تھی، جب نعت یا اشعار پڑھتے تو سماں بدھ جاتا، لحن داؤدی کی وجہ سے وہ عوام وخواص میں مقبول رہے۔

مولانا نے پاکیزہ زندگی گزاری، وہ فجر کی نماز کے بعد بارہ دری میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، پھر وظیفے کی کتاب صلوٰۃ الطیبات، حزب البحر اور دلائل الخیرات پڑھتے۔

مولانا طالب دربھنگہ نے تقریباً ۱۰ رسال موضع بڑھی میں گزارے، وہ ان کے سنہرے دن تھے۔ مسجد کی ذمہ داری بھی، اس کے علاوہ مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے، یہ گاؤں پانچ ٹولوں پر مشتمل ہے، یہاں بابو اقبال علی کی زمینداری تھی، اسی مناسبت سے ان کے وارثین کے رہائشی مکان کا نام اقبال منزل ہے اور ٹولہ ملکانہ ہے۔ گاؤں بڑا تھا، اس لئے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد اچھی تھی، اسی مدرسہ سے ایک سرکاری مکتب کا بھی الحاق تھا، ایک طرح اس علاقہ میں تعلیم کی ترویج واشاعت میں خوب حصہ لیا، اس کے علاوہ انہوں نے تبلیغ دین اور رشد وہدایت کے لئے ملک کے مختلف شہروں میں کام کیا اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ ان کی نعت شریف کا ایک مجموعہ زارو وفا طبع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار کا مجموعہ 'کلیات طالب دربھنگوی' بھی طبع ہو چکا ہے۔

۱۴ رفروری ۱۹۹۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۵ رفروری کو مولانا مصطفیٰ رضا شبنم کمالی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور گاؤں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

کب وہ دن میرا اے خدا ہوگا　　باں کوئی بے وفا ہوگا
مجھ گنہگار کو قیامت میں　　تیری رحمت کا آسرا ہوگا
نزع میں وہ جو آئیں بالیں پر　　جاں کنی میں بھی ک مزا ہوگا
شبِ فرقت کی کب سحر ہوگی　　وعدۂ وصل کب وفا ہوگا
اے خودی تو اگر چلی جائے　　بےخودی میں بڑا مزا ہوگا
بےرُخی کی چلے گی تیغ اگر　　''جان جائے گی اور کیا ہوگا''
ہوگا مقتل میں کیا حسیں منظر　　اک حسیں خنجر آزما ہوگا
آہ طالبؔ کی ناروا ہوگی　　یار جو کچھ کرے روا ہوگا

*****

ان کے قبضے سے جو میرا دلِ مضطر نکلا　　گیسوئے یار سے پوچھے کوئی کیوں کر نکلا
خاک ٹھہرے کوئی اس گھر میں کہ ویران ہے یہ　　ناوک ناز جگر سے یہی کہہ کر نکلا
سخت جانی پہ مری یہ مرے قاتل نے کہا　　''میں نے سمجھا تھا جسے موم وہ پتھر نکلا''
مُر کے نکلا ترے کوچے سے ترا شیدائی　　جان ودل کر کے فدا عاشقِ بےزر نکلا

رہ نما بن کے درِ یار پہ لے ہی آیا — کام کی چیز یہ اپنا دلِ مضطر نکلا
بوند آنسو کی بنی زینتِ حسنِ جاناں — قطرہ پانی کا جسے سمجھا تھا گوہر نکلا
جلوۂ یار طالبؔ یہ کرشمہ دیکھو — خاک کا ذرہ بھی رشکِ مہہ انور نکلا

****

آپ کی یاد سے غافل دلِ رنجور نہ تھا — رہ رہ کر بھی کبھی آپ سے میں دور نہ تھا
لاکھ پردے میں جلی شمع پتنگے پہنچے — حسن کچھ عشق سے محجوب تھا مستور نہ تھا
قتل کر کے مرا قاتل مجھے، پہروں رویا — عقل حیراں تھی جفا کا تو یہ دستور نہ تھا
عشق کے منہ سے سہی حُسن ہی بولا ہوگا — بولنے والا اناالحق کبھی منصور نہ تھا
خود تری آنکھ تھی بے نور یہ کہنے والے — "شمع کے رُخ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا"
دل مرا حسن کا ممنون کرم ہے ورنہ — خود اسے عشق کا ہرگز کوئی مقدور نہ تھا
آج ہے زیرِقدم اُس کے بساطِ کونین — کل وہ دن تھا کہیں انسان کا مذکور نہ تھا
دیکھ لیتی مرے ارمانوں کے سورج کا غروب — آپ کی چشم مروت سے یہ کچھ دور نہ تھا
ہائے جھلنا ہی پڑا حسنِ خود آرا کے حضور — دل کو تھا ناز کہ مختار تھا مجبور نہ تھا
بے رُخی اس کی دکھانے کو فقط تھی طالبؔ — درحقیقت مری دلداری سے وہ دور نہ تھا

****

ہائے وہ وقت بھی کیا بار خدایا ہوگا — تیری سرکار میں جب میرا بُلاوا ہوگا
حشر میں جب رُخِ روشن کا نظارا ہوگا — پھر قیامت میں قیامت کا تماشا ہوگا
ایک دن تم سے مرا خونِ تمنا ہوگا — خواب میں بھی نہ کبھی میں نے یہ سوچا ہوگا
تیرے خنجر نے گلے جس کو لگایا ہوگا — خوں بہا اُس کا تو جنت کا قبالہ ہوگا
تیر کھا کر بھی پلک جس کا نہ بھیگا ہوگا — وہ ترے طالب صادق کا کلیجہ ہوگا
ہائے مجبوری کسی پردہ نشیں کی اے دل — شب میں بھی گھر سے وہ نکلے تو سویرا ہوگا
اتنی دلکش تو نہ تھی چاندنی تیری پہلے — تو نے اے چاند میرے چاند کو دیکھا ہوگا
ہم تو انسان ہیں اقرارِ خطا کرتے ہیں — جس سے سرزد نہ خطا ہو وہ فرشتہ ہوگا
اُس نے حُرمت کی سند یونہی نہ پائی ہوگی — آب زمزم کسی تلوے کا غسالہ ہوگا
وہ مرے دل کا کھنڈر دیکھ کے بولے طالبؔ — قافلہ دور کا اِس شہر سے گزرا ہوگا

****

وحشی ترا پابندِ سلاسل نہیں ہوتا — زندانِ تعلق میں وہ داخل نہیں ہوتا
ناقص وہ بنادے جسے کامل نہیں ہوتا — یعنی کرم و لطف کے قابل نہیں ہوتا
جو خنجر تسلیم کا بسمل نہیں ہوتا — دنیائے محبت میں وہ کامل نہیں ہوتا
آنکھوں ہی سے اے ساقی سرشار پلادے — زاہد کبھی اِس طرح سے قائل نہیں ہوتا
روتا ہوں لپٹ کر تری تصویر سے ناحق — ''تصویر کے پہلو میں کبھی دل نہیں ہوتا''
ہے تیر بھی، شمشیر بھی، خنجر بھی ترے پاس — مجھ پر مگر اک وار بھی قاتل نہیں ہوتا
اظہار تمنا کا وہی وقت ہے طالبؔ — جب غیر کوئی یار کے شامل نہیں ہوتا

****

جب نہ آبادی میں بہلا اُن کا تڑپایا ہوا — دشت کو نکلا ہجوم غم سے گھبرایا ہوا
پی لے اے زاہد! مزے کا وقت ہے آیا ہوا — اُس کی رحمت کا ہے بادل ہر طرف چھایا ہوا
رحم آیا ابر کو کب جب چمن جل بھُن چکا — کیا دوبارہ بھی کھلے گا پھول مرجھایا ہوا
یوں رُخِ روشن ہے اُن کا زلف کی آغوش میں — جس طرح ہو بادلوں میں چاند شرمایا ہوا
کچھ نہ پوچھو حسن عالم سوز کی نیرنگیاں — آنکھ خیرہ ہورہی تھی ہوش چکرایا ہوا
مسکرا کر تم ادھر دیکھو تو یہ شاداب ہو — غنچۂ دل کتنی مدت سے ہے مرجھایا ہوا
چل کے اپنی آنکھ سے تم بھی تماشہ دیکھ لو — تیغ ابرو کا ہے بسمل وجد میں آیا ہوا
سخت جانی کی پشیمانی میں طالبؔ کیا کہوں — آرہا ہوں کوچۂ قاتل سے شرمایا ہوا

(۴۶)

خلاصہ یہ کہ بہار کی اردو شاعری میں علماء کی خدمات نہایت ہی اہم اور قابل قدر ہیں۔ انہوں نے بہار میں اردو زبان ادب کی خدمت کی اور خاص طور پر اردو شاعری کو آگے بڑھانے میں قابل قدر خدمات انجام دیئے۔ جس کا مطالعہ گذشتہ ابواب میں آپ نے کیا۔ اس طرح اردو زبان وادب بالخصوص اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہیگا۔

مراجع

(۱) صوفی منیری، ص۱۲۶
(۲) صوفی منیری، ص۱۱۰
(۳) صوفی منیری، ص۱۲۸
(۴) صوفی منیری، ص۱۲۹
(۵) اکبر دانا پوری، تجلی ت عشق، ص ۳۳۲
(۶) اکبر دانا پوری، تجلی ت عشق، ص ۳۶۳
(۷) اکبر دانا پوری، تجلی ت عشق، ص۳۶۹
(۸) اکبر دانا پوری، تجلی ت عشق، ص۳۷۰
(۹) تجلیات قتیل، ص۱۷
(۱۰) تجلیات قتیل، ص۱۸
(۱۱) تجلیات قتیل، ص۲۶
(۱۲) الہام ارمان، ص۱۲۵
(۱۳) الہام ارمان، ص۱۲۹
(۱۴) الہام ارمان، ص۱۴۰
(۱۵) تنویر خیال ص، ۷۱
(۱۶) تنویر خیال ص۷۷
(۱۷) تنویر خیال، ص ۹۲
(۱۸) تنویر خیال ص۹۶
(۱۹) حرف آرزو، ص۱۰۲
(۲۰) حرف آرزو، ص ۱۱۳
(۲۱) حرف آرزو، ص۱۱۵
(۲۲) حرف آرزو، ص۱۷
(۲۳) حرف آرزو، ص۱۲۱
(۲۴) تذکرہ بزم شمال۔ص۔(۱۲۳)

(۲۵) تذکرہ بزم شمال۔ص (۱۲۳)
(۲۶) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد پنجم) ص ۸۱
(۲۷) تذکرہ بزم شمال (ص ۱۷۵)
(۲۸) بزم شمال۔ص ۳۲۱/۳۲۴ تلخیص، کلید معارف سوانح
(۲۹) تذکرہ شعرائے منیر شریف۔ص ۸۰
(۳۰) تذکرہ بزم شمال۔ص (۲۷۹)، تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔جلد پنجم۔ص ۱۵، ندیم گیا جون ۱۹۳۶۔ص ۲۳
(۳۱) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول، ص ۲۶۹
(۳۲) تذکرہ علمائے بہار۔جلد اول۔ص ۳۸۳، تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔جلد دوم، ص ۲۳
(۳۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۴۶
(۳۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۲۳۰
(۳۵) نزہۃ الخواطر جلد ۸، ص ۱۶۹، اعیان وطن۔ص ۳۶۹، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول، ص ۲۳۴
(۳۶) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (دوم) ص ۲۸۷
(۳۷) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد (چہارم) ص ۹۵
(۳۸) متاع سخن آرہ، تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم، ص ۵۲
(۳۹) بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری۔ص۔۲۰۰
(۴۰) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۱۴۳
(۴۱) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۱۹۱
(۴۲) تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ص۔۸۰، تذکرہ بزم شمال۔ص۔۲۰۱، انسان پورنیہ نمبر ۱۹۵۵، تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد ششم) ص ۲۹۵
(۴۳) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (جلد پنجم) ص ۱۹۴
(۴۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔جلد ششم۔ص ۶۳
(۴۵) تذکرہ علمائے بہار۔جلد۔اول۔ص۔۹۸، تذکرہ بزم شمال ص ۲۳۰، خمخانہ جاوید، جلد اول، ص ۱۸۳، گلستان ہزار رنگ، ص ۳۸۹)
(۴۶) کلیات طالب دربھنگوی

کتابیات

نمبر شمار	کتابوں کے نام	مصنف کا نام	مطبع	سال اشاعت
(۱)	خزانہ عامرہ	آزاد بلگرامی	مطبع نول کشور کانپور	۱۸۷۱ء
(۲)	سراپا سخن	سید محسن علی لکھنوی	نول کشور پریس	۱۸۷۵ء
(۳)	تجلیات عشق (دیوان اکبر)	مولانا محمد اکبر ابوالعلائی دانا پوری	مطبع شوکت شاہجہانی، آگرہ	۱۸۹۶ء
(۴)	تذکرہ گلشن ہند	مرزا علی لطیف، مرتبہ مولانا شبلی و عبد الحق	اسٹیم پریس لاہور	۱۹۰۶ء
(۵)	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	مطبع مسلم یونیورسیٹی انسٹی چیوٹ، علی گڑھ	۱۹۲۲ء
(۶)	حیات فریاد	شاد عظیم آبادی	مطبع معارف	۱۹۲۷ء
(۷)	تذکرہ چمنستان شعراء	لچھمی نارائن شفیق مرتبہ ڈاکٹر عبد الحق	انجمن ترقی اردو	۱۹۲۸ء
(۸)	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری	غیر مذکور	۱۹۲۹ء
(۹)	تذکرہ شعرائے بہار	سید عزیز الدین بلخی، راز عظیم آبادی	دی قومی پریس بانکی پور، پٹنہ	۱۹۳۱ء
(۱۰)	تاریخ شعرائے بہار	عزیز الدین بلخی	دی قومی پریس بانکی پور پٹنہ	۱۹۳۱ء
(۱۱)	دیوان مضطر	مضطر مظفر پوری	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۴۳ء
(۱۲)	بہار اور اردو شاعری	معین الدین دردائی	مکتبہ دین و دانش آرہ	۱۹۴۷ء
(۱۳)	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبد الحق	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۴۸ء
(۱۴)	بیدل	خواجہ عباد اللہ اختر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۵۲ء
(۱۵)	اعیان وطن	حکیم مولانا شاہ شعیب نیر پھلواروی	آزاد پریس بانکی پور پٹنہ	۱۹۵۳ء
(۱۶)	بنگال میں اردو	وفا راشدی	مکتبہ اشاعت اردو حیدر آباد سندھ، پاکستان	۱۹۵۵ء

(۱۷)	حیرت زار	سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی	دی آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ	۱۹۵۶ء
(۱۸)	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا	ڈاکٹر اختر احمد اورینوی	لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ	۱۹۵۷ء
(۱۹)	تذکرہ سفینہ ہندی	بھگوان داس ہندی	مرتبہ عطا کاکوی، ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ	۱۹۵۸ء
(۲۰)	سفینہ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	مرتبہ عطا کاکوی، ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ	۱۹۵۸ء
(۲۱)	تلخ وشیریں	محسن دربھنگوی	حمیدیہ برقی پریس، دربھنگا	۱۹۵۹ء
(۲۲)	حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، ان کی حیات اور شاعری	سید محمد صدرالدین فضا شمسی	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ	۱۹۶۴ء
(۲۳)	تجلیات قتیل	مرتبہ طلحہ رضوی برق	مطبع غیر مذکور	۱۹۶۵ء
(۲۴)	حیات دوام	مختار احمد عاصیؔ داناپوری	اردو پرنٹنگ پریس رمنہ باغ، پٹنہ	۱۹۶۵ء
(۲۵)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد اول	حکیم سید احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۶۶ء
(۲۶)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد دوم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	،انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۶۷ء
(۲۷)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد سوم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	،انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۶۸ء
(۲۸)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد چہارم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۶۸ء
(۲۹)	تذکرہ صبح گلشن	سید علی حسن خاں	دی آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ	۱۹۶۸ء
(۳۰)	بزم سخن	حسن علی خاں ونورالحسن خاں، مرتبہ عطا کاکوی	دی آرٹ پریس پٹنہ	۱۹۶۸ء
(۳۱)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد پنجم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	،انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۶۹ء

(۳۲)	تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ جلد ششم	حکیم سید احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس کراچی	۱۹۷۰ء
(۳۳)	تذکرہ مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم ترجمہ عطاء کاکوی	دی آرٹ پریس پٹنہ	۱۹۷۱ء
(۳۴)	تذکرہ طبقات شعرائے ہند	کریم الدین، پانی پتی	دی آرٹ پریس پٹنہ	۱۹۷۱ء
(۳۵)	دائرۂ معارف اسلامیہ	ماہرین	دانش گاہ پنجاب، لاہور	۱۹۷۱ء
(۳۶)	صوفی منیری حیات اور شاعری	ڈاکٹر خالد رشید صبا	لیتھو آرٹ پریس، دریاپور پٹنہ	۱۹۷۲ء
(۳۷)	سخنوران سارن	پروفیسر اے حمید وزاہد فیروز پوری	لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ پٹنہ	۱۹۷۲ء
(۳۸)	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۹۷۳ء
(۳۹)	اردو کی نعتیہ شاعری	اکٹر طلحہ رضوی برق	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ	۱۹۷۴ء
(۴۰)	نشاط غم	پروفیسر اعجاز علی ارشد	اردو سوسائٹی پٹنہ	۱۹۷۷ء
(۴۱)	مقالات قاضی عبد الودود	کلیم الدین احمد	دی آزاد پریس سبزی باغ، پٹنہ،	۱۹۷۷ء
(۴۲)	دیوان حسرت عظیم آبادی	ڈاکٹر اسماء سعیدی	اے جے پرنٹرس، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
(۴۳)	حیات بیدل	ڈاکٹر امانت	تاج آفسٹ پریس الہ آباد،	۱۹۸۰ء
(۴۴)	فضل حق عظیم آبادی، عصر، حیات اور فن	ڈاکٹر روحی حسن مجید	سائنٹفک پبلیشرز پٹنہ	۱۹۸۰ء
(۴۵)	تاریخ اطبائے بہار	حکیم اسرار الحق	پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ،	۱۹۸۱ء
(۴۶)	گلشن بیخار	نواب مصطفی خان شیفتہ	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۱ء
(۴۷)	آئینہ ترہت	منشی بہاری لعل فطرت	مطبہ بہار کشمیر، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
(۴۸)	قرینہ غزل	ناوک حمزہ پوری	تاج پریس باری روڈ گیا	۱۹۸۳ء

(۴۹)	نوائے وطن	شاد عظیم آبادی	مطبع قیومی	۱۹۸۴ء
(۵۰)	تذکرہ بزم شمال	شاداں فاروقی	حمیدیہ برقی پریس، لہیریا سرائے	۱۹۸۶ء
(۵۱)	علامہ شوق نیموی حیات وخدمات	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن قاسمی	پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ	۱۹۸۷ء
(۵۲)	تذکرہ شعرائے منیر شریف	سید شاہ مراد اللہ منیری	پاٹلی پترا لیتھو پریس، دریاپور پٹنہ	۱۹۸۸ء
(۵۳)	بہار میں اردو کی صوفیانہ شاعری	محمد طیب ابدالی	اسرار کریمی پریس الہ آباد،	۱۹۸۸ء
(۵۴)	قوس حمزہ پوری احوال وآثار	ڈاکٹر خورشید احمد خاں	ارم پرنٹرس دریاپور، پٹنہ،	۱۹۹۳ء
(۵۵)	کلام ذکآ	مولانا مظہر الحق کریمی	لونا پرنٹنگ پریس ،نخاس، لکھنؤ،	۱۹۹۳ء
(۵۶)	تذکرہ علمائے بہار۔ جلد اول	ابوالکلام قاسمی شمسی	انیس آف پریس دریا گنج دہلی	۱۹۹۵ء
(۵۷)	وہ جو شاعری کا سبب ہوا	کلیم عاجز	طوبیٰ پبلکیشنز،	۱۹۹۶ء
(۵۸)	بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر فرحانہ شاہین	پرنٹ انٹرنیشنل دہلی	۱۹۹۷ء
(۵۹)	قاضی عبدالودود کی علمی وادبی خدمات	ڈاکٹر محمد نور اسلام	عفیف پرنٹرس دہلی	۲۰۰۰ء
(۶۰)	بیاض	عطا عابدی	پرنٹ سینٹر دریا گنج نئی دہلی	۲۰۰۳ء
(۶۱)	تاریخ ادب اردو جلد اول	وہاب اشرفی	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۰۵ء
(۶۲)	تاریخ ادب اردو جلد دوم	وہاب اشرفی	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۰۵ء
(۶۳)	تاریخ ادب اردو جلد سوم	وہاب اشرفی	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۰۵ء
(۶۴)	الہام ارمان	مولانا سید عبدالحکیم ارمان	اقراء کمپیوٹر سینٹر، اوکھلائی دہلی	۲۰۰۵ء

(۶۵)	تذکرہ علمائے بہار۔ جلد دوم	ابوالکلام قاسمی شمسی	نیشنل پرنٹنگ ورکس پٹنہ،	۲۰۰۶ء
(۶۶)	بہار میں اردو شاعری ۱۹۸۰ء کے بعد	ڈاکٹر صوفیاء پروین	مطبع کاک آفسیٹ پرینٹرس، دہلی	۲۰۰۷ء
(۶۷)	میرزا بیدل	پروفیسر نبی ہادی	عفیف پرنٹرس دہلی،	۲۰۰۹ء
(۶۸)	تذکرہ جلوہ خضر جلد اول	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	اے۔ جی پرنٹرس کراچی، طبع دوم	۲۰۰۹ء
(۶۹)	مولانا محمد صدر الحسن ندوی ،حیات وادبی خدمات	ڈاکٹر محمد عبد المقتدر عتیق	سویرا آفسیٹ پرنٹرس، بھڑکل گیٹ، اورنگ آباد	۲۰۰۹ء
(۷۰)	دوادب کی تاریخ میں نالندہ ضلع کی خدمات	عشرت آرا سلطانہ	مطبع عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی،	۲۰۱۰ء
(۷۱)	بادنسیم	مولانا انور حسین انور قاسمی	فردوس کتاب گھر، ممبئی	۲۰۱۰ء
(۷۲)	مولانا سید محمد شمس الحق حیات اور علمی وادبی خدمات	ڈاکٹر محمد صباء الہدیٰ صبا	دی پرنٹو اشٹیسنر، قطب الدین لین پٹنہ	۲۰۱۱ء
(۷۳)	حرف آرزو	وارث ریاضی	انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ	۲۰۱۲ء
(۷۴)	تذکرہ شعرائے سارن	سمیع بہواروی	کلاسک آرٹس پریس،	۲۰۱۲ء
(۷۵)	تذکرہ سرو آزاد	میر غلام علی آزادی بلگرامی	تدوین ڈاکٹر زرینہ خان، جے کے آفسیٹ، دہلی	۲۰۱۳ء
(۷۶)	کیف عظیم آبادی مقام اور کلام	ڈاکٹر زرنگار یاسمین	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۱۴ء
(۷۷)	امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین اوران کی شاعری	عبد الباسط محمد شرف الدین ندوی	مشہود انٹرپرائزیز، لکھنؤ،	۲۰۱۴ء
(۷۸)	غزلستان	سلطان اختر	ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ	۲۰۱۴ء
(۷۹)	سوز وگداز	شوق نیموی	نظامی پریس، پٹنہ	غیر مذکور
(۸۰)	نغمہ راز	شوق نیموی	قومی پریس لکھنؤ	غیر مذکور

(۸۱)	چہار عنصر مخطوطہ	مرزا بیدل عظیم آبادی	خدا بخش لائبریری، بہ خط گل محمد ولد عبد الرسول ہانسوی	غیر مذکور
(۸۲)	شعر الہند ۔جلد اول	عبد السلام ندوی،	مطبع معارف اعظم گڑھ	غیر مذکور
(۸۳)	گلستان ہزار رنگ	سید بہاء الدین اثر	لبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ	غیر مذکور
(۸۴)	ارمغان سلیمان	مولانا سید سلیمان ندوی، مرتبہ غلام محمد	غیر مذکور	غیر مذکور
(۸۵)	دیوان شوق	شوق نیموی	مطبع سیدی، پٹنہ	غیر مذکور
(۸۶)	مثنوی سوز وگداز	شوق نیموی	نظامی پریس، پٹنہ	غیر مذکور
(۸۷)	یادگار وطن	مولانا ظہیر احسن شوق نیموی	قومی پریس لکھنو	غیر مذکور
(۸۸)	خمخانہء جاوید جلد اول	لالہ سری رام	گلاب سنگھ پریس، لاہور	غیر مذکور

☆☆☆

رسائل

(۱) الشمس، مجلہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (۲) تحریک نئی دہلی سلور جبلی نمبر، انصاری مارکیٹ نئی دہلی ۱۹۷۸ء (۳) رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۳ (۴) رسالہ بہارستان اگست ۱۹۳۱ء

(۵) رسالہ معاصر پٹنہ بابت ۱۹۴۱ء (۶) رسالہ معارف جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ (۷) رسالہ جام جم جلد ۲ شمارہ ۲ (۸) رسالہ جام جم جلد ۲ شمارہ ۲ (حمید عظیم آبادی) (۹) رفیق علمائے بہار نمبر (۱۰) ماہنامہ نگار ۱۹۳۰ (۱۱) ماہنامہ صنم بہار نمبر شمارہ ۱ تا ۴ ۔۔ ۱۹۵۹ء (۱۲) نگار اردو شاعری نمبر (۱۳) ندیم گیا جون ۱۹۳۶ء (۱۴) ندیم بہار نمبر (۱۵) نقوش شخصیات نمبر